

اچھوتے موضوع کا ناول

# سوی کی ٹولیت



محمد یحییٰ خان

**Zub**graphics  
DESIGN BY : JAVED AKHTER

## جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب

”موم کی مورت“ کا لفظ لفظ میں نے پڑھا ہے، یہ بات میں زور دے کر اس لئے کہہ رہا ہوں کہ عموماً ہر کتاب کے بارے میں لکھنے والا تعریف و توصیف بھرے کلمات مروت میں آکر لکھ دیتا ہے حالانکہ کتاب اس کی نظر سے گزری ہی نہیں ہوتی۔ اپنی بات تسلیم کرانے کا ایک ٹھوس جواز میرے پاس یہ بھی ہے کہ آج کے ماحول کا یہ المیہ ماہنامہ آداب عرض میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے اور قارئین کی پذیرائی نے ہی محمد یحییٰ خان صاحب کو اسے کتبلی صورت دینے کی تحریک دی ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ محمد یحییٰ خان صاحب نے معاشرے کے اس انوکھے اور خفی رخ پر بڑی تحقیق و جستجو کے بعد قلم اٹھایا ہے۔ اچھا بھلا مرو کیسے بیجودہ بن جاتا ہے، اس تبدیلی کے ہر مرحلے کو انہوں نے بڑی تفصیل سے بیان کیا اور موضوع کے اعتبار سے اسے نبھاتا گویا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف تھا۔ انہوں نے اپنا فرض بخوبی ادا کیا اور تمام حالات و واقعات کو ایک عبرت کی صورت یکجا کر دیا لیکن اسے میری مجبوری کہہ لیجئے کہ بہت جگہ مجھے ایسی تلخ سچائیوں کو بہت لپیٹ لپیٹ کر رکھنا پڑا حالانکہ موصوف اس سے متفق نہیں تھے۔ اب اگر کہیں آپ کو ایسی کسی کمی یا تشنگی کا احساس ملے تو یہ قصور محمد یحییٰ خان صاحب کا نہیں ہے بلکہ سراسر میرا جرم ہے۔ میں اسے اس یقین کے ساتھ قارئین تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ تحقیق و جستجو کے بعد ایک نازک موضوع پر لکھی جانے والی تحریر پر ایسا لیبل نہیں لگانا چاہئے کہ اسے ایک دوسرے سے چھپا کر رکھا جائے بلکہ والدین اگر پڑھیں تو وہ ضروری سمجھیں کہ یہ تحریر ان کی اولاد کی نظر سے بھی گزرنی چاہئے۔ یہاں گنتی کے چند لوگ ہی ہوں گے جن کے ہاتھ میں قلم، تلوار کی صورت رکھتا ہے اور وہ جب بھی کچھ لکھتے ہیں تو احساس یہی ملتا ہے کہ وہ معاشرے کی بے راہ روی، منافقت اور اس کے دوہرے معیار کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔ جناب محمد یحییٰ خان ان گنتی کے چند لوگوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

خالد بن حامد

مدیر اعلیٰ ماہنامہ ”آداب عرض“ لاہور

آبِ شیریں کوزہ گل میں بھی شیریں ہی رہے  
آبِ مختل جامِ جم میں بھی کرے گا تلخ کام

میرے اس سفر میں کہیں کہیں رکاوٹ بھی آئی۔ وہ شاید ناولسٹ کی اس کام میں نوشقی سے ہو۔ وقفے کے باعث، یا کیفیت کی کمی پیشی کی وجہ سے بیان کا توازن متزل ہو گیا۔ یہ کبھی مسافر کی بے ڈھب چال کے کارن ہی نہیں ہوتا کثر راستے کی ناہمواری بھی اس لڑکھڑاہٹ کا سبب ہو سکتی ہے۔ بہر کیف حیثیت مجموعی 'موم کی مورت' جدید ناول نگاری میں ایک انکشاف کی طرح ہے۔ جو اپنے قارئین کو حیران و ششدر کر دے گا۔ اور آج کی سٹی ہوئی دنیا میں اس کا پھیلاؤ ان پر بار نہیں گزرے گا۔ اس کہانی کے کردار یہاں وہاں کل بھی سرگرم عمل تھے اور آج بھی متحرک ہیں۔ اور عام آدمی انہیں دیکھتا، ان سے ملتا اور قریب سے گزر جاتا ہے۔ بغیر انہیں سمجھے اور ان کا نوٹس لئے۔۔۔ یہ مسائل کے انبوہ کثیر کا کڑوا اثر ہے یا ہمارے سماج کے لاپرواہ اجتماعی رویہ کی دین۔ جو بھی، صحت مند روش نہیں ہے۔ یہ عادت کبھی کبھار ناقابل علاج سرطان کے آتش نشاں کی طرح لبتا ہے اور اپنے ساتھ بہت کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔۔۔ میرے خیال میں 'موم کی مورت' اپنے قارئین کو اس طویل خواب غفلت سے جگانے کی ایک کوشش ہے۔ اگرچہ کسی سیاسی یا سماجی بلند بانگ نعرہ کی طرح نہیں، خوشبو اور مہک کی طرح میٹھی میٹھی۔ جو حساس دلوں میں اپنے ہونے سے ارتعاش ضرور پیدا کرے گی۔

قاضی جاوید

ریڈیٹنٹ ڈائریکٹر اکادمی ادبیات پاکستان

## موم کی مورت۔۔۔ انکشاف کی طرح!

لوگوں کے پاس وقت کے فقدان نے اور دنیا پر اطلاعات کی یلغار نے کتب کے قارئین کی تعداد تشویشناک حد تک کم کر دی ہے۔ مگر آج بھی سرکش شاعری یعنی زور نثر جب کہیں سر اٹھاتی ہے تو لوگ حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں جہاں کسی ادیب و شاعر کا نیا اسلوب نقادوں کو متاثر کرتا ہے وہاں مضمون اور نفس مضمون کی انفرادیت بھی باعث تبصرہ و تذکرہ ہوتی ہے۔

کچھ عرصے سے کہا جا رہا ہے کہ ہمارا یہ گھر، جسے عرف عام میں دنیا کا نام دیا جاتا ہے پیٹ سمٹ رہا ہے اور محدود ہو کر ایک گاؤں بن گیا ہے۔ اس گاؤں کی اب ہر چیز ہماری دسترس میں ہے اور ہماری نگاہ اس کے دور دراز گوشوں کو بہت قریب سے دیکھ رہی ہے۔ مگر یہ سراسر حقیقت نہیں ہے۔ بعض معاملات میں اپنی کج نگاہی کے باعث انسان اپنی آس پاس کی مخفی دنیاؤں کے مناظر سے آج بھی محروم رہ جاتا ہے۔ اس کا فوکس برسوں اس پر نہیں ہوتا جسے لمحوں میں اسے جان لینا چاہئے، یا اپنے علم میں لے آنا چاہئے۔ یہ کام ہمارے ہاں دور اندیش ادباء کرتے ہیں۔ مشاہدات کے سمندر میں وہ اتنے گہرے جاتے ہیں کہ باہر آنے پر ان کے ہاتھ ہیرے موتیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ یہ وصف میں نے محمد یحییٰ خان کا ناول 'موم کی مورت' پڑھتے ہوئے پایا۔ اگرچہ یہ ان کی پہلی تحریر ہے جو عموماً طفیل اختر میرے سامنے آئی۔ اور بظاہر میں اسے شہر کی پسماندہ بستیوں کی چھوٹی لائبریریوں کا مال سمجھا۔ لیکن جب میں نے اسے چھو اور چھوڑا تو مکمل وصل کو میرا دل چاہا۔ یہاں تک کے مصنف کے شانہ بخاند چلتا ہوا میں اس دنیا میں دھنس گیا جو محمد یحییٰ خان نے 'موم کی مورت' میں بہائی ہے۔

## کھل جاسم سم

میرے ایک تنقید برائے تنقید پسند دوست نے اس کتاب کا مسودہ ملاحظہ فرمانے کے بعد اپنی کرائفڈ رائے سے یوں نوازا۔

”بڑا کھل کھلا کر لکھا ہے۔“

”بات کھل کر کرو۔“ میں نے اسے عینک کے فریم کے اوپر سے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ کھلکھلاتے ہوئے بولا۔

”میں کہنا چاہ رہا تھا کہ خاصا کھل کھلا کر لکھا ہے۔ میرا مطلب ہے بہت ہی۔۔۔؟“

میں عینک اتار کر میز پر پھینکتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

”تم بند بند گھٹا گھٹا سا پڑھنا چاہتے ہو۔۔۔ اس لئے تو تم سڑی چہرہ ہو، تمہارے خیالات و

افکار سے منہ گند کی بو آتی ہے۔۔۔ تمہاری سوچ کے بند پیٹ میں سیاہ مٹی چنے چنے بند ہیں۔ تم

جنہیں چاہو بھی تو خارج نہیں کر سکتے۔۔۔ بہتر ہو گا کہ تم کسی ہوابند کو ٹھری میں لفافہ اوڑھ کر

پڑ جاؤ، کھلی فضا صاف ہوا، واضح منظر اور نکھر ا موسم تمہاری صحت کے لئے موافق نہیں۔“

وہ بے لطفی سے سینگ پھنساتے ہوئے بولا۔

”تمہاری بے شمار خرابیوں اور کمزوریوں میں ایک نمایاں خرابی یہ بھی ہے کہ تم تنقید

برداشت نہیں کر سکتے۔“

”بے شک، چکی بند تنقید تو واقعی برداشت نہیں کر سکتا۔ کھلے میدان میں برست مار دو“

اجازت ہے۔۔۔ میں نے بات پہ بات ماری۔

وہ اپنی طوطے سی ناک سیکھرتے ہوئے بولا۔

”ہونہ۔۔۔ تمہارے منہ کون لگے، اسی لئے تو میں تمہاری خرافات پڑھتا نہیں کہ منہ

کھولو تو منہ کی کھاؤ۔ فائدہ۔۔۔؟“

میں نے جواب دیا۔ ”میرے ادب گنوار دوست! رشوت، منافقت ڈاکے زنا بالجبر، گینگ

ریپ، مسجدوں میں فائرنگ اور پولیس مقابلے کھل کھلا بیچ کھیت۔۔۔ میں نے کچھ کھل کھلا کر

لکھ دیا تو تمہیں کھل گیا۔“ میں نے اس کا کمزور سا بازو دباتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”پلے

باندھ کہ مصلحت کو شے، چشم پوشی اور نظریہ ضرورت بند گھٹی ہوئی چٹیں ہیں جو خون آشام

چنگوڑیں بن کر، بند انسان کے اندر آنتوں میں بچے گاڑ کر النانک جاتی ہیں۔ اور پھر وہ بند

انسان منہ اگلے کرنا کرتا جنم واصل ہو جاتا ہے۔“

میں اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں دور تک جھانکتا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”اخباروں میں کھل

کھلا کر لکھا ہوا۔ تصویروں میں کھل کھلا کر دکھایا ہوا۔۔۔ فلموں اور ٹیلی ویژن میں کھل کھلا کر

پیش کیا ہوا دیکھ سکتے ہو۔۔۔ تو میرا کھل کھلا کر لکھا ہوا بھی کھل کھلا کر پڑھو۔۔۔ تاکہ تمہاری

بند ہوا کھلے۔“

وہ پنڈا چھڑانے کی کوشش میں کہنے لگا۔ ”تم نے ہجڑے ہائی لائٹ کئے ہیں، اس کی کیا

ضرورت تھی۔۔۔ یہ تو بیمار ذہن اور۔۔۔؟“

”مائی ڈیئر، تیسری دنیا کے دو نمبر ترقی پذیر بد نصیب کاہل جاہل انسان!۔۔۔ یہ ہجڑے تیری

میری اولاد کے جنم، حقیقہ اور تیل مہندی پہ ہمارے ہاتھوں سے ہرے لال نیلے نوٹوں کی دلیلیں

لیتے ہیں۔ ہم ان کی دھالیں اور مجرے بڑے شوق سے، اہتمام سے دیکھتے ہیں۔ یہ ہماری تاریخ

ثقافت اور معاشرے کا ایک حصہ ہیں۔ یہ ہم سے ہیں، اور ہم ان میں ہیں، ان کو ہم کیسے

نظر انداز کر سکتے ہیں، یہ بھی تو انسان ہیں۔“

وہ کھیانی ملی کی مانند غراتے ہوئے بولا۔ ”یہ انسان ہوں یا نہ ہوں مگر تم انتہائی مجھول اور

نامعقول قسم کے انسان ہو۔ صفحے کے صفحے اس فضول قسم کے موضوع پہ ضائع کر دیئے ہیں،

ہجڑوں کو ہائی لائٹ کر کے تم نے اپنے زرد خیالات، تلخ ذہنی اور بیمار سوچ کو منظر عام پہ

لانے کی گھٹیا کوشش کی ہے۔ سنجیدہ اور اعلیٰ سوچ بوجھ والے قاری سے تم پذیرائی حاصل

نہیں کر سکو گے۔“

وہ سانس درست کرنے کے لئے ذرا کی ذرا خاموش ہوا تو میں نے بڑی رسان سے پوچھا۔

”اچھا یہ بتاؤ، یہ فلموں، اسٹیج پروگراموں، ٹیلی ویژن ڈراموں، ایوانوں، اخباری فچروں اور

فائو اشار ہولوں میں جو ہجڑے ”مون لائٹ“ ہو رہے ہیں ان کے بارے میں کیا خیال

ہے۔۔۔ تمہارے علم میں شاید ہجڑا وہ ہے جو سانپ کی مانند لہرا کر چلتا ہے، ٹھکے لگاتا اور

تالیاں پاتا ہے؟۔۔۔ بودے انسان، ایسے دکھائی دینے والوں میں بڑے بڑے ثقہ اور جفاکاری

مرد بھی ہوتے ہیں۔ اور یہ دیکھ لو، چوڑی چھاتیوں، گرجے برسنے والے سکے بندوں

میں جو تمہیں مرد دکھائی دیتے ہیں ان میں اکثر زنا سے ہوتے ہیں اور جو تم گلی محلوں، بازاروں،

شاپنگ سنٹروں، کالجوں، اسکولوں میں جا کر دیکھو، سو میں ستراسی نسل کے ملیں گے۔ بھونڈے

برگرے، می ڈی، مورتیں ٹائپ قریب قریب اسی ”قبیلہ زنگل“ سے تعلق رکھتے ہیں، ہم

انہیں کچھ بھی کہیں۔۔۔ مگر ان سے انسان اور معاشرے کا ایک فرد ہونے کا حق تو نہیں چھین

سکتے۔۔۔ اب بتاؤ۔۔۔ اس تناظر میں اس موضوع پہ لکھنا کیا جرم ہے گناہ ہے۔۔۔؟ کیا یہ جنس سانس نہیں لیتی، ان کے سماجی، معاشرتی اور انسانی مسائل، مسائل نہیں۔ کیا یہ اس دھرتی کے باشندے نہیں؟۔۔۔ بھائی، ان مجبور مقہور اور بیمار انسانوں کی تکریم کرو۔۔۔ شکر کرو کہ تم ان میں سے نہیں ہو۔۔۔ ورنہ؟“

”یہ حکیموں، عالموں، شادی دفتر والوں اور میوزک اکیڈمی والوں کا کیا گند کھلا رہا ہے، جنسی بیماریوں کی بڑی کراہت پھیلائی ہے۔“ اس نے اب نیا محاذ کھولنے کی کوشش کی۔

”بیٹا! یہ سارا گند ہر صبح اخبار میں پلٹا ہوا تیری ناشتے کی میز پہ دھرا ہوتا ہے۔ اصلاح معاشرہ کے بڑے بڑے دعوے دار اخبار، اسی گند سے اپنے چھوٹے چھوٹے بل ادا کرتے ہیں۔ اخباروں کے ماتھوں پہ کتاب العظیم کی مقدس آئیٹوں کے جھومر سجانے والے اسی گند سے اپنے اخبار کے دامن کو پلید کرتے ہیں۔۔۔ تو۔۔۔“

”تم تو اب اور کھل گئے ہو۔۔۔؟“

”اور تم اب اور بند جاؤ۔۔۔ تو تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔“

محمد یحییٰ خان

## اظہار شرمندگی

متاع بے بہا ہے در دو سوز آرزو مندی

میں سیاہ سوچ، سیاہ پوش اور سیاہ کلام۔۔۔ بلاباجی کا نالائق غلام۔۔۔ چاہنے کے باوجود اپنی اس ”کالی شاہ کالی کر توت“ کو اپنے سونے اچلے اچلے بلایا شفاق احمد۔۔۔ اور روٹی کی پولی پولی پونی ایسی گداز و نرم۔۔۔ سوندھی سوندھی مہک والے چاٹی کے مکھن کی مانند ملائم الطبع، قائم الوجود اور صائب الوجد۔۔۔ جن کے ہاں زندگی بہت بڑی ہندگی ہے میری ماں جی بانو قدسیہ کے حضور پیش کرنے اور ان کے نام معنون کرنے کی جرات نہیں کر سکا۔ کیونکہ مجھے بلاؤنڈے والے بڑے شاہ جی کے ہاتھوں آغا شورش کاشمیری مرحوم کا ”اس بازار میں“ لکھنے پہ حشر یاد ہے۔ لہذا یہ کتاب بغیر کسی انتساب کے پیش کی جا رہی ہے۔ اللہ کریم کا احسان عظیم ہے کہ ”شہاب لڑی“ کے ان گراں مایہ موتیوں کی آب و تاب سے ہم بے مایہ کنکر پتھروں کا بھرم بھی بنا ہوا ہے۔

محمد یحییٰ خان

412- زرگس بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور-54570

ٹیلی فون: 7844838

یہ لوٹن کبوتری، ٹیکسی ڈرائیور استاد قریان لایا تھا۔ بکھرے ہوئے بل، نشے سے مخمور چڑھی ہوئی آنکھیں، سرخ بوٹی ڈورے، ستا ہوا بے جس چہرہ، ٹوٹے پردوں کی مانند لٹکے ہوئے بازو، پھانسی کے رے کی مانند گردن کے گرد لپٹا ہوا دوپٹہ، معمولی سا لباس، ریس کورس پارک کے قریب فٹ پاتھ پہ آندھی سے پہلے تیز ہوا میں کسی سفیدے کے درخت کی مانند کھڑی جھول رہی تھی۔ ٹیکسی کے بریک چیخ اٹھے تو رکے ہی وہ خود دروازہ کھول کر سیٹ پر ڈھیر ہو گئی اور کھلا دروازہ قریان نے خود اتر کر بند کیا تھا۔

”کہاں جانا ہے بی بی؟“

قریان نے گاڑی گیر میں ڈالتے ہوئے پوچھا تو جواب میں ہلکی سے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ قریان نے پیچھے پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے دوبارہ اپنا سوال دہرایا مگر وہ تو جیسے کسی معصوم بچے کی مانند نیند کی دایوں میں اتر چکی تھی۔ گاڑی گیر سے نکالتے ہوئے پیچھے جھک کر وہ اس کے کندھے ہلانے لگا۔

”ہوش کرو بی بی! جانا کہاں ہے؟“

جب گل تھمتھپائے تو پل کی پل اس کی آنکھیں نیم وا ہوئیں، چیختے ہوئے کہنے لگی۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نا۔۔۔ نہیں۔۔۔“

قریان نے جیسے بجلی کے ننگے تار چھولے تھے، گھبرا کر وہ اوھر اوھر دیکھتے ہوئے اپنی سیٹ پر سیدھا ہو گیا۔ فٹ پاتھ پہ گزرتے ہوئے کچھ دیہاتی اوھر دیکھنے لگے اور اس سے پیشتر کہ وہ کسی مزید بد مزگی سے دوچار ہوتا، گاڑی بڑھا کر جلدی سے سڑک کے درمیان آگیا تھا۔ اس کی ایسی خستہ حالت، گہری غنودگی کا عالم دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ یہ پوڈری ہے۔ الحماء، ریگیل چوک، لارنس گارڈن، شیلڈیم، شیرپاؤ برج، نہر کے آس پاس والے علاقے، یونیورسٹی کیمپس، گلبرگ، لہری، فیروز پور روڈ، ریس کورس، ان جگہوں پہ شام ہوتے ہی، اس قسم کی چیزیں خون آشام

9 یاروں کے لئے گردش ایام بہت ہے

چکاڑوں کی مانند کہیں سے نکل آتی ہیں۔ ان میں بھونڈ بھی ہوتے ہیں، ”بھونڈیاں“ اور تتلیاں بھی، پیشہ ور، شوقیہ اور علتی بھی، منشیات کے عادی اور منشیات فروش بھی۔ پرائیویٹ قمار خانوں اور قحبہ گری کے اڈوں کے گماشتے، صاف ستھرے کپڑے پہنے، بے سنورے خوبصورت زنانے اور مائٹھے بھی اپنے اپنے شکار پھانسنے کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ پھولوں کے ہار گجرے، تیل کی شیشیاں، بھکاریوں کے روپ میں برقع پہنے نوخیز خوبصورت عورتیں، چمکتی کاروں میں اشارے کرتے ہوئے ادھیڑ عمرے اور موٹر سائیکلوں والے نوجوان اکثر ان ہی شکار گاہوں میں قسمت آزمائی کے لئے آتے ہیں۔

نیکسی ڈرائیور کے لئے یہ سب کچھ نیا نہیں ہوتا، دن رات انہیں اچھے بروں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ قریان کے استاد نے ایک دفعہ اسے بتایا تھا کہ بڑے مرد سے تو آسانی سے بننا جا سکتا ہے مگر بری اور خوبصورت عورت جو نشے کی بھی عادی ہو، اس سے ہمیشہ ہوشیار رہنا آج وہ شاید اسی قسم کی صورت حال سے دوچار تھا، گاڑی کے ساتھ اس کے دماغ کی گرائیاں بھی چل رہی تھیں۔ وہ اسے کہاں لے جائے، کیا کرے، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا؟

سرومز ہسپتال سے ذرا پہلے ایک زیر تعمیر پلازہ کے پاس اس نے گاڑی روکی اور سگریٹ سلگاتے ہوئے ایک نظر اسے دیکھا۔ معمولی سے خال و خد، بھر بھرا جسم، تلکجے اندھیرے میں وہ اس سے زیادہ کچھ دیکھ نہ سکا۔ گھڑی رات کے ساڑھے سات بج رہی تھی، آج شام قریب چار بجے اس نے گاڑی نکالی تھی اور ڈیڑھ پونے دو سو اس کی جیب میں تھا، یعنی خرچہ پانی وہ بنا چکا تھا۔ سگریٹ کا بھرپور کش کھینچتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا اور لائٹ جلا کر ایک بار پھر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اٹنے ہاتھ پہ گال رکھے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھی۔ کچی ہوئی رس بھریوں ایسے ادھ کھلے ہونٹوں سے رال ٹپک ٹپک کر سیٹ پہ جمع ہو رہی تھی جیسے بوند بوند رس ٹپک رہا ہو۔ آڑو جیسی کٹ دار ٹھوڑی، لمبی سی گردن کے نیچے کھلے گلے سے ابھرا ہوا شباب۔۔۔ جلتے ہوئے سگریٹ سے جب قریان کی انگلیوں میں جلن کا احساس ہوا تو اس نے ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ ’لائٹ‘ بجاتے ہوئے گاڑی بڑھادی اور موسیقی کی لہروں پہ تیرتا ہوا فیوز پور روڈ سے وحدت روڈ کی جانب مڑ گیا، موڑ مڑتے ہی آگے پولیس

ناکے نظر آیا۔ ایک لمحہ تو وہ گھبرا سا گیا کہ کہیں کوئی ”مدا“ نہ پڑ جائے، استاد کی نصیحت بھی یاد آ گئی۔ اپنی مستی میں وہ یہ بھول گیا تھا کہ یہاں اکثر ناکے لگتا ہے، کوئی اور راستہ پکڑ لیتا مگر اب دیر ہو چکی تھی اور پولیس والا اسے رکنے کا اشارہ کر چکا تھا۔۔۔ رکتے ہی اس نے پولیس والے سے کہا۔

”سواری ہے۔۔۔ بیمار شمار ہے، ہسپتال لے جا رہا ہوں۔۔۔“

یہاں سے جان چھوٹی تو دوسرا ناکہ اسے دوہنی چوک پہ نظر آیا مگر اشارے سے پہلے ہی وہ نیلم ہلاک کی جانب مڑنے کا اشارہ دے چکا تھا۔ اب سمن آباد موڑ کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔

حکیم جمالی کے دواخانے کی انتظار گاہ میں دو مدقوق سے مریض بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ قریان نے ملازم کے ذریعے ایک فوری توجہ کی طالب مریضہ کی اطلاع کرائی تو حکیم صاحب فوراً ”باہر آگئے اور ایک نظر قریان کو دیکھا، مریضہ پر نظر ڈالی اور معاملہ سمجھتے ہوئے فوراً ”مریضہ کو کمرہ تشخیص میں پہنچانے کا حکم سنایا۔ پھر تھوڑی دیر بعد منتظر مریضوں کو شتم پشتم بھٹکتا کر ”دواخانہ بند ہے“ کی سختی باہر لٹکوا دی۔ حکیم جمالی کی تشخیص گاہ کے بغلی کمرے میں یارانِ عیش کوش، رات بھگتے اور موڑ بننے کا انتظار کر رہے تھے۔ پلاسٹک کی بائلی میں شراب کی بوتلوں کو برف کے نرم نرم بستری کچھ دیر پہلے لٹایا گیا تھا۔ عامل ظہوری شاہ، بشیر ڈوگر کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ وقت گزاری کے لئے میوزک اکیڈمی والا استاد شفقت عرف شنو اور پرویز، پراپرٹی ڈیلر بیٹھے تاش سے دل بہلا رہے تھے۔ حکیم جمالی نے اندر داخل ہوئے ہی سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”اُوئے! بند کرو یہ نفس تاش، پھینکو نملے دہلے گولے۔۔۔ اٹھو اور حکم کی رانی کا استقبال کرو۔ عیش ہی عیش، مزے ہی مزے،۔۔۔“ اس نے آنکھ دبا کر سب کو خوشخبری سنائی۔ اُوئے! دیکھو! استاد قریان آج یاروں کے لئے کیسی کبوتری لے کر آیا ہے۔۔۔“

اتنے میں استاد اور ملازم اس کبوتری کو ڈنڈا ڈولی کی صورت میں لئے اندر آئے۔ استاد قریان اسے پلنگ پہ لٹاتے ہوئے بتانے لگا۔

”حکیم جی! بڑا ستھرا مال ہے، آپ بھی کیا یاد کریں گے۔۔۔“

تاش کے پتے ابیلیوں کی طرح کمرے میں بکھر گئے اور یہ سارے چمکاڑوں کی مانند پلنگ کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ استاد شنو، چرس سے جھلے ہوئے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”استاد! اے شہزادی پیندی اے، پکھدی اے یا سو نکھدی اے۔۔۔“

حکیم جمالی اسے اشارے سے خاموش کرتے ہوئے استاد قریان سے پوچھنے لگا۔

”یہ معشوق لائے کہاں سے ہو۔۔۔؟“

”حکیم جی! ریس کو رس پارک کے باہر کھڑی تھی۔ میں نے سمجھا، سواری ہے۔ گاڑی روکی تو یہ خود ہی دروازہ کھول کر لیٹ گئی۔ میں نے بہتر پوچھا کہ کہاں جاؤ گی مگر زبان تو زبان

اس نے تو ابھی تک آنکھ بھی نہیں کھولی۔۔۔ میرا خیال ہے، پوڈری ہے اور آج کچھ زیادہ ہی خوراک لے گئی ہے یا پھر اتفاق سے خالص نمبرون پی گئی ہے۔۔۔

حکیم جمالی نے جھک کر اس کی آنکھ کی پتلیوں میں جھانکا۔ اس کا سانس سونگھا، نبض ٹٹولی۔۔۔ پرویز بے صبری سے بولا۔ ”حکیم صاحب! شنراوی نشے میں ہے۔ اس کے منہ پہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ماریں یا کوئی دوا سونگھائیں، دو منٹ سے پہلے ہوش میں آ جائے گی۔۔۔“

حکیم جمالی نے ایک نیلی شیشی سے کوئی دوا اسے سونگھائی، دو چار زبردست قسم کی چھینکوں کے ساتھ ہی اس نے آنکھیں پٹپٹانا شروع کر دیں۔ پاؤں کے تلوے اور ماتھا ٹھنڈے پانی سے تر ہوئے تو اس نے چیخنا شروع کر دیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑا دھر دیکھنے لگی، پھر اک دم اس پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ سب ہنکا ہکا اس نادر روزگار معشوق کو دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ اس سے کس طرح بننا جائے؟۔۔۔ اب شاید اس کے رونے کی باری تھی اور وہ معصوم بچوں کی مانند بلک بلک کر رو رہی تھی، ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر التجائیں کر رہی تھی۔ ”میری ماں بیاری ہے، اسے کینسر ہے۔ دوا، انجکشن، خوراک نہ ملی تو وہ مر جائے گی۔۔۔ میری چھوٹی بہنیں، ان کی تعلیم۔۔۔ مجھے کچھ روپے دے دو، میرا سب کچھ لے لو۔۔۔“

وہ بے دم ہو کر پلنگ سے نیچے لڑھک گئی۔۔۔ استاد قربان نیکی والا فکر مند لہجے میں

پوچھنے لگا۔

”حکیم جی! یہ کیس کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔۔۔؟“

جواب میں حکیم جمالی نے ہنستے ہوئے اپنے ملازم کو الماری سے ایک مخصوص دوا لانے کا اشارہ کیا اور دوا اس کے حلق میں انڈیل کر اسے پلنگ پر چت لٹا دیا گیا۔ اب حکیم جمالی، استاد قربان کی جانب متوجہ ہوا۔ ”قربان، سائیں! یہ سارے ڈرامے اور پیشہ دھندے کے ڈھنگ ہوتے ہیں۔۔۔ آم کھانے سے غرض رکھو اور پیڑ، پتوں کی جانب دھیان مت دو۔۔۔ دوستو! پیو اور جیٹو، موج کرو۔۔۔“

ملازم تکتے کباب لینے چلا گیا اور حکیم جمالی ٹیلی فون لے رک بیٹھ گیا۔۔۔ رات اپنی تمام تر ظلمتوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ عامل نظوری شاہ اور شیر ڈوگر ٹیلی فون آفس والا جب پہنچے تو شراب کی ایک ایک بوتل لانا نہیں بھولے تھے۔۔۔ اجتماعی زیادتی کے اس مکروہ اور ہولناک کھیل میں یہ ہوس آشام شکرے، تمام رات اس بے بس، تھکن الحواس، نشے میں مدہوش

کبوتری کو نوچتے اور کھوشنٹے رہے۔ صبح دم جب معرکہ قدرے ٹھنڈا پڑا تو حکیم جمالی کے علاوہ سب ہی کچلا کھائے کتوں کی طرح منڈیاں ڈالے پڑے تھے۔ شراب، چرس، کھٹی کھٹی تے اور انسانی غلاط کی ملی جلی بدبو اور تعفن نے اس ماحول کو مردار خوروں کے کسی مردار گھر سے مشابہ کر دیا تھا جہاں وہ مردہ جانوروں کی کھالیں کھینچتے ہیں۔ جدھر مرل کتے، حرلے کتے، گندے گدھے، او جڑیاں آنتیں کھینچتے کھینچتے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ حکیم جمالی نے یہ منظر دیکھ کر ایک عجیب سی تلخی محسوس کی۔ اس کا منہ کڑواہٹ سے بھرا ہوا تھا، پیڑی جتے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے، بستر غلاط بھری کبوتری کی جانب دیکھ کر ایک مادر زاد تنگی گالی ان دوستوں کے نام اچھالی جو عیاشی کرنے کے دعوے تو کرتے ہیں، شراب کی بوتل گردن تک بھری ہوئی تو لاتے ہیں، عورت کو سالم ہی کھا جانے والی نظروں سے تو دیکھتے ہیں، راتوں کے راجہ تو بنتے ہیں مگر شراب کی بوتل کا ابھی سینہ ننگا نہیں ہوتا کہ یہ آؤٹ ہو جاتے ہیں، عورت کا عورت پن ابھی انہیں چھو تا ہی نہیں کہ یہ گھٹنے ٹیک دیتے ہیں اور رات کا جادو ابھی ٹوٹا ہی نہیں کہ یہ چوہے بنے نیند کے بلوں میں دبک جاتے ہیں۔ ہمت ایسے عیاشوں کی!۔۔۔ منہ بھاڑ کھول کر اس نے ایک بھر پور انگڑائی توڑی، سستی اور نیم غنودگی کی ایک سرد لہر اسے چھو کر گزر گئی تھی۔ وہ اپنی خاص الماری کھول کر ایک چھوٹی سی شیشی سے دو طلائی گولیاں کپے دودھ کے ساتھ نگل گیا اور بھرا ہوا ایک سگریٹ پھونکنے کے بعد وہ پھر پلنگ کی غلاط کا حصہ بن گیا۔۔۔ ادھڑی نچی کبوتری، پتھر جسم، پتھر احساس، پتھر نصیب۔۔۔!

☆☆☆

جمالا!۔۔۔ المشہور حکیم جمالی، وید سنیا، ماہر امراض مخصوصہ و خبیثہ، گولڈ میڈلسٹ وغیرہ وغیرہ کے لئے کبوتریاں کبوتر، مرغ مرغائیاں، بکریاں بکرے، بھیڑیں چھترے نئے نہیں تھے۔ اس کا باپ حیدر ابھی یہی کسب کرتا تھا۔ قرب و جوار کے گاؤں قصبوں سے وہ جانور خریدتا، فروخت بھی کرتا اور دوکان پہ بھی بیچتا۔ جمالا آٹھ جہاتیں پاس کر کے سکول سے منہ موڑ بیٹھا۔ ہڈ گوڈوں کا مضبوط، تھتھ چھٹ اور منہ چپت لگنے والا تھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ کہیں خود ہی منہ سر کرتا، ہوشیار باپ نے اسے اپنے ساتھ دوکان پہ بٹھالیا۔ قصائی، ٹائی اور میراثی کا بچہ اپنا موروثی فن سیکھے نہ سیکھے، ہوتا جہانم روا استاد ہی ہے۔ جمالا جانوروں کے بند بند کاٹنے اور الٹی سیدھی کھال اتارنے میں خوب پرکاری دکھاتا۔ زبان اور ہاتھ میں ایسا جادو تھا کہ آنتیں، او جڑی، کبچی، کان کا قیمہ قلیہ بنا کر بیچ دیتا۔ مرل بکری کی پشت اور زانوں میں بکرے کی پوچھل اور کپورے پھنسا کر کسی بکرے کے طور پر بیچ دیتا مگر تباہ کے؟۔۔۔ دوکان کی ساکھ گیزی تو باپ

نے بگڑ کر دوکان سے اٹھا دیا۔ گوشت کا کام کرتے کرتے گوشت چڑھ گیا تھا اور گوشت کے ساتھ چربی بھی ہوتی ہے، وہ آنکھوں میں آگئی۔ خون بھی ہوتا ہے، وہ نسون میں فساد پانے لگا۔ ایک چھنل سی لڑکی سے آنکھ مٹکا ہو گیا۔ تعلقات کا مٹکا پھوٹا تو اس کے اجد بھائیوں سے اسے کھڑکا ہو گیا۔ باپ اس کی کڑوٹوں سے پہلے بیزار تھا۔ حمایت اور سرپرستی سے ہاتھ کیا اٹھایا کہ یہ گاؤں بدر کر دیا گیا۔

چار گاؤں پرے قلندروں اور ملنگوں کا ایک گاؤں تھا جہاں چھوٹی قوموں کے جرائم پیشہ لوگ رہتے تھے۔ بچے، بوڑھے، عورتیں، سب ہی منشیات کے عادی یہاں اس کا دوست طالب چنگر رہتا تھا۔ چھ فٹا جوان اور منشیات فروشی اس کا پیشہ تھا۔ اس نے جمالے کو ہاتھوں ہاتھ لیا، خوب آؤ بھگت کی۔ اس کا ڈیرہ گاؤں سے باہر، درختوں کے چھوٹے سے ذخیرے میں تھا۔ یہاں رات دن اس پاس علاقے کے بیکار، بدکار منشیات کے عادی لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ آگ کے مچ کے گرد بھنگ کے پیالے اور چرس چاندو کی چلمیں گردش میں رہتیں، لنگر پکتا۔ سرے، بے سرے ترنگ میں تانیں لگاتے رہتے۔ ڈھول دھمال، گھڑے گھنگھروا لگ اپنا ساں باندھتے۔

جمال بھنگ کے پیالے، مدک کے سونے، سلفے کی لاٹ اور چرس کی چس سے میس آکر آشنا ہوا اور یہیں اسے احساس ہوا کہ اب تک وہ بیکار زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ چھوٹی سی دوکان، وہی گوشت، وہی چھریاں ٹوکے، او جڑیاں، سری پائے، بوٹی بوٹی پہ نکرار کرنے والے غریب جاہل لوگ اور سڑیل، باپ پور پور چربی جمع کر کے فروخت کرنے والا۔ اسے اپنے باپ، گاؤں، پیشے سے سخت نفرت ہو گئی۔ ذہن، دل، دماغ اور زندگی کے بند سوتے تو یہاں آکر کھلے تھے۔ طالب کانوں میں سونے کے بالے، قیمتی گھڑی، ریشمی لاجا، بوسکی کی قمیض، تلے کا کھہر پنتا، ڈب میں نوٹ اور پستول رکھتا تھا۔ جمالے نے تہہ کر لیا کہ وہ ایک آسودہ حال، کامیاب اور امیر آدمی بنے گا۔ اپنے نجوس قصائی باپ اور خاص طور پر گاؤں والوں سے اپنی حیثیت منوا کر رہے گا۔ طالب کے خواہش اور کوشش تھی کہ کسی طرح جملا بھی اس کے دھندے میں شامل ہو جائے۔ ابھی آہستہ آہستہ راہیں ہموار کر رہا تھا کہ ایک دھندلی سی شام ایک سنیا سی بابا کہیں سے گرتا نبھلتا ڈیرے کی راہ پر آگیا۔ جٹا ہاری، ناف تک اتری ہوئی راکھ بھوبھل ریش، ہڈیوں کی ٹٹھ، تنگ دھڑنگ لنگوٹی پوش، کاندھے پہ جھولتا ہوا پٹنار پٹا جھولا، ہاتھ میں نر سنکھا، پیر کھڑواں، سر بھجوت، ماتھے کشک۔ ذخیرے سے باہر ہی اس نے سکھ پھونکا، شاید وہ سلفے کو بوسنگھ کر ادھر آگیا تھا۔ آتے ہی اس نے کسی جناتی زبان میں دہاڑ لگائی۔ سسے ہوئے حاضر باش ادبائوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ عزت نکریم سے بٹھایا اور جل بھوجن، بھنگ

کلیان سے تواضع کی۔ کھاپی، ڈکار، آسن جماروہ دھیان گیان میں مگن ہو گیا۔ آٹھ پہر آنکھیں میچے سوکھے کاٹھ کی مانند ساکت و جاہد گڑا بیٹھا رہا۔ ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ اسے بڑی عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے آسمان سے اتری ہوئی کوئی مخلوق ہو ورنہ آٹھ پہر بے حس و حرکت کوئی کیسے بیٹھ سکتا ہے؟۔۔۔ طالب اور جملا خاص طور پہ بڑے متاثر تھے، اس کی آمد اپنے لئے بڑی مبارک سمجھ رہے تھے۔۔۔ رات کے دوسرے پہر جمالے نے جرات کرتے ہوئے سنیا سی بابا کے سوکھے سڑے گھٹنے کو پو لے پو لے دبانا شروع کیا۔ سنیا سی بابا نے سرخ انگارا آنکھیں اس پہ گاڑتے ہوئے زور سے نہ سمجھ میں آنے والا نعرہ بلند کیا تو سوتے جاگتے، اونگھتے، سب ہی ہڑبرا کر سہم سے گئے۔

”پچہ! تم نے ہمارے دھیان میں کھنڈت کاہے ڈالی ہے۔۔۔؟“ سنیا سی بابے کا استخوانی ننگا پنڈرلرز رہا تھا۔

جمالے نے پاؤں پکڑ لئے۔ ”بابا! غلطی ہو گئی ہے، معاف کر دو۔۔۔ روٹی پانی کا بندوبست ہے، من چاہے تو کچھ کھاپی لو۔۔۔“

سنیا سی بابا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تیرے سریر سے ماس کی بو آرہی ہے۔۔۔ سادھو برہمچاری ہے۔ ناری، ماس، چھل کپٹ، کوٹھ و اسنا سے دور ہے پچہ۔۔۔!“ جمالے نے سر جھکا کر اعتراف کیا کہ وہ پیشے سے قصائی ہے، اب یہ کام چھوڑ چکا ہے۔ ”۔۔۔ بابے نے کہا۔ ”پر تیری رت میں کچے ماس کی پت ہے۔۔۔ تو نے مجھے چھو کر بھر شٹ کر دیا، میں تیرے ہاتھ کا جل بھوجن نہیں لوں گا۔“

جمال ہاتھ جوڑ کر گڑا کرتے ہوئے معافی مانگنے لگا۔ طالب نے ساگ پات کا بھوجن سامنے لا رکھا۔ دو چار لقموں کے بعد سنیا سی بابا نے ہاتھ کھینچ لیا اور کلیان طلب کیا۔ رات بھر میں اس مدقوق پیر فروت نے پاؤ بھر مدک پھونک ڈالی۔۔۔ جملا جان چکا تھا کہ یہی وہ ہستی ہے جو اس کی کلیا پلٹ سکتی ہے، لہذا جی جان سے وہ اس کی خدمت میں جٹ گیا۔ گوشت سے پرہیز کر لیا، جو نکس لگوا کر فالٹو خون نکلوا دیا اور دن رات اس کے چروں میں بیٹھ رہا۔ سنیا سی بابا بھی اب آہستہ آہستہ مائل بہ کرم ہو رہا تھا۔۔۔ ڈیرے پہ آنے جانے والوں میں پاس کے گاؤں کا ایک ادبائش چوہدری بھی تھا جو موج میلے اور وقت گزاری کی نیت سے اکثر یہاں آیا کرتا تھا۔ ایک روز وہ حلقے میں بیٹھا نشہ پانی کر رہا تھا کہ اچانک سنیا سی بابا کی نظر اس پہ آنکی۔ اشارے سے پاس بلایا اور کچھ لمحے گھورنے کے بعد جھولے سے ایک ریشٹھا نکالا، تنکے پہ کسی دوا کے چند ذرے نکل کر اسے چٹا دیئے اور ہولے سے کان میں کچھ پھونک کر وہاں سے رخصت کر دیا۔

”۔۔۔“ اعلیٰ صبح لوگوں نے عجیب چہرہ دکھا کر مریض ہشاش بشاش چل قدمی کر رہا ہے جیسے وہ ہوئی۔۔۔ دوسرے روز وہی چوہدری خوشی کے شادیاں بجاتا ہوا آیا اور سنیاں بابا کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ ایک پوٹلی نذر گزاری، ترے مڑے لمبے لمبے غلیظ ناخنوں والے ہاتھوں سے دیئے۔ سنیاں بابا نے مزید ایک اور خوراک کھلائی اور کہا۔ ”جا بچہ! اب ساری زندگی عیش کر۔۔۔ جان سے چھوٹ جاؤ، جوانی نہ چھوٹے گی۔۔۔“

ریشمی پوٹلی میں مصری، مدک، چرس کی بھیلی، سونے کا نگن اور بہت سے روپے تھے فروخت کر کے اس کی خوراک کا بندوبست کر لینا۔۔۔“

جملے کی آنکھیں چندیا گئیں۔ سنیاں بابا نے سب کچھ اس کی تحویل میں دے دیا اور کہا ”بچہ! مایا موہ اور لودھ لالچ سے بچنا ہی سنیاں ہے۔۔۔“

جملے پر اس کا کیا اثر ہونا تھا، وہ تو بنا ہوا ہی حرص و ہوا کے حرفوں کا تھا اور سونے کی کڑی اس کے ہاتھ آگئی تھی۔ وہ سانپ بنا، سنیاں بابا کے گرد کنڈلی مارے اپنے حصار میں لئے۔ ہر اناؤں، اٹھراء، لٹوہ فالج، مریضوں بیماروں کے پرے کے پرے دن رات یہاں جمع ہونے لگے۔ تھا، گیان دھیان کا عذر پیش کرتے ہوئے کسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ اس کا بگ مزہ علاج معالجے کی ضرورتوں کے مطابق جڑی بوٹیاں، ادویات، مفروات، سمیات، مٹی کی بانڈیاں اپنے ہاتھوں سے صاف کرتا، لنگوٹی کتے ہوئے ایک دن یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ یہ مسلمان نہیں کھائیں، اپنے گوبریاں اکٹھی ہونے لگیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا انتظام اور اہتمام جملے کے ہی ہے۔۔۔ اوھر طالبے کو اپنے کام دھندوں سے فرصت نہیں تھی، وہ اکثر غیر حاضر رہتا۔ ڈیر۔ سپرد تھا جسے وہ بڑی ذمہ داری اور دلچسپی سے سرانجام دے رہا تھا۔ اس نے اپنے کانوں، کا کرنا دھرتا جملہ ہی تھا۔

ایک دن ایک غریب دیہاتی ذخیرے میں روتا ہوا آیا اور سنیاں بابا سے فریادی ہوا کہ اگر دو ائیں تیار کرنے میں مگن نظر آتا۔ کشتے، قرص، بھسم تیار کرنے کے طریقے اور آنگ، الاؤ، کے بوڑھے باپ کو فالج کا اثر ہو گیا ہے۔ سنیاں بابا نے جملے کے ذریعے حکم دیا کہ اسے یہاں بٹھ، وزن، وقت، مقدار، خواص خاصیت، اندازے، کھل گھوٹ، پرکھ پرہیز، چھوٹی چھوٹی لے آؤ۔ وہ غریب کسی دور کے گاؤں سے پیدل آیا تھا، اپنی مفلسی کا رونا لے کر بیٹھ گیا۔ جملہ جزویات پہ گہری نظر رکھتا۔ سنیاں بابا کی صورت میں جو حکمت و کیمیا کا خزانہ اس کے ہاتھ لگا سے پچاس روپے پا کر وہ شام تک بیمار باپ کو لے کر واپس پہنچ گیا۔ سنیاں بابا نے ایک نظر تھا، وہ ہر قیمت پہ اسے حاصل کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ سنیاں بابا بھی اس کی دلچسپی، خدمت اور مریض پہ ڈالی، فالج زدہ ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر سہلایا۔ مریض کی انگلی میں تانبے کا ایک محنت دیکھ کر اعتماد کرنے لگا اور اب شہرت تھی کہ دور دور تک پھیل چکی تھی، ہن تھا کہ مینہ کی چھلٹا تھا اتروا کر جملے کے سپرد کرتے ہوئے مریض کو آگ کے الاؤ کے قریب لٹانے کا حکم دیا۔ مانند برس رہا تھا۔ نذر، نذرانے، نقد، اجناس کی ریل پیل تھی۔ جملہ اور طالبانہ دونوں ہاتھوں سے اس طور کہ اس کے پاؤں کے تلوے الاؤ کی جانب رہیں۔ کلیان بھرا کر انگارے کے نیچے آ کر سمیٹ رہے تھے۔ طالبے کو تو صرف مال و زر سے مطلب تھا جبکہ جملہ حکمت و کیمیا سیکھنے میں کاچھلا رکھ کر دو چار لمبے لمبے کش کھینچے، پھر آنکھیں موند کر بے سدھ لہا لہا بڑ گیا۔ حلقہ میں زیادہ دلچسپی رکھتا۔ اس کی چھٹی جس اشارے کر رہی تھی کہ جو کچھ سیکھنا حاصل کرنا ہے اس بیٹھے ہوئے عقیدت مند آنکھیں پھاڑے ہوئے، مہبوت سے ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ یہ مخزن حکمت و دولت زیادہ دیر تمہارے قابو میں نہیں رہے گا۔ اسی اچانک سنیاں بابا نے آنکھیں کھولیں۔ جھولے سے ایک چڑے کی تھیلی سے کوئی دوا نکال کر مصلحت اور خدشے کے پیش نظر ہرنے اور تیاری کے طریقے کو ذہن نشین کرنے کے علاوہ وہ مریض کی زبان پہ رکھنے کو حکم دیا اور کلیان الٹ کر نیم گرم تانبے کا وہی چھلا جواب سیاہ رنگ مکمل تفصیل سے اپنی ڈائری پہ بھی تحریر کر لیتا۔ اساک، قوت پاہ اور مردانہ بیماریوں کے دو اختیار کر چکا تھا، مریض کے بیٹے کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے مریض کے متاثرہ حصے والے چار نئے ایسے مشہور ہوئے کہ بڑی بڑی دور سے بڑے بڑے تماش بین، عیاش یہاں پہنچنے لگے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنا دو اور حقے کا پانی دو گھونٹ پلا کر اسے اسی جگہ صبح تک پڑا رہے

جو منہ مانگے داموں اپنے مطلب کے نسخہ جات حاصل کرتے اور سیاسی بابا کے حمن لگاتے۔  
ان ہی مشغلوں میں کئی برس پر لگا کر اڑ گئے۔

کہتے ہیں کہ سنیا سیوں، جو گیوں، فقیروں، درویشوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا مگر اس سیاسی بابا کو یہ ٹھکانا شاید پسند آ گیا تھا۔ ویسے بھی وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں انسان کے پاس سوائے لاغری، ناتوانی اور بے بسی کے کچھ بھی باقی نہیں بچتا یا پھر مزید در بدر خوار ہونے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ بینائی انتہائی ناقص اور جسم سوکھے کاٹھ کی مانند ہو گیا تھا۔ پہروں غنودگی اور بے حسی کے عالم میں اپنے جھونپڑے کے اندر پرالی۔ ادھ مو سا پڑا رہتا اور جب کبھی گہری اونگھ سے ہڑبوا کر چو نکتا تو حاضری میں بیٹھا ہوا جھلا سلگتا ہوا کلیان مٹھی پہ جما کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیتا، کھانتے کھانتے دو چار کس کھینچ کر وہ دوبارہ بے دم ساڑھک جاتا۔ جھلا، جان گیا تھا کہ سنیا سی بابا کی چڑیا اڑنے والی ہے۔ خاص خاص اہم قیمتی نئے تو وہ حاصل کر چکا تھا اور سونا بنانے کی ترکیب اب اس کا آخری مقصد تھا، اسی مقصد کے لئے وہ آنے جانے والوں کو غفلت سے بننا کر زیادہ وقت بابے کی حاضری خدمت میں گزار تاکہ شاید اس کی خدمت کے انعام میں آخری وقت وہ کچھ عطا کر دے، کئی مرتبہ جھلا کرید و رید بھی کر چکا تھا مگر جواب میں وہ ہلکے سے مسکرا کر، آنکھیں میچ لیتا۔

جوان جاڑوں کی ایک ٹھنھرتی ہوئی رات تھی۔ آس پاس، دُور دراز سے آئے ہوئے بہت سے مریض اور ان کے لواحقین ادھر ادھر گندے بوسیدہ خانوں چادروں میں سوئے جا گے پڑے تھے۔ برگد کے نیچے آگ کا لاؤ دہک رہا تھا اور لاؤ کے ایک حصے میں بے شمار مٹی کی ہنڈیاں کشتہ بخت ہو رہی تھیں۔ نیلے پیلے آگ کے شعلے، کثیف گد لادھواں۔ چربی کی چرائند، جڑی بوٹیوں کی ناگوار بو، ذخیرے کی پراسرار خاموشی اور ارد گرد نشے کی ترنگ میں اونگھتے سوئے جا گے ملنگ بے فکرے۔ جھلا سنیا سی بابا کی گندگی صاف کر کے، سلگتا ہوا کلیان تھما کر صاف سانس لینے اور طبیعت کے تھکد کو دور کرنے کی غرض سے جھونپڑی سے باہر نکلا اور لاؤ کے پاس کشتوں کی ہنڈیوں کو دیکھنے لگا۔ ایک ملنگ نے بھرا ہوا سگریٹ اسے تھمایا، پہلے بھر پور کش کا دھواں ابھی پوری طرح خارج کرنے نہ پایا تھا کہ سنیا سی بابا کے جھونپڑے سے دھوئیں کا ایک غبار بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلے بھڑکنے لگے۔ اس سے پیشتر کہ کوئی صحیح صورت حال کو سمجھتا، آگ پوری طرح جھونپڑی کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔ سوئے ہوئے لوگ ہڑبوا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور گھوڑے بیچ کر سوئے ہوؤں کو ٹھو کریں مار مار کر جگایا گیا۔ جدھر منہ اٹھا، بھاگ بھاگ شروع ہوئی۔ شور، چیخیں، بچاؤ، پانی لاؤ مگر پانی یہاں کہاں

تھا؟ ایک کنواں ادوہ بھی دور، رہٹ والا یا پھر ڈیزل ٹیوب ویل تھا مگر مستری غائب۔ ٹھاہ، ٹھاہ، ڈز، ڈز، جھونپڑے میں جڑی بوٹیاں، تیار تریاق ادویات، جل اور پھٹ رہی تھیں۔ نیلا پیلا خاکستری دھواں جھونپڑے کے اطراف سے نکل رہا تھا۔ ذخیرے کے درختوں پہ نحو استراحت پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ اور چیخ و پکار نے قیامت کا سماں پیدا کر دیا۔ اب تیزی پکڑتے ہوئے شعلوں نے آس پاس کے درختوں اور جھاڑ جھنکار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جنگلی خرگوش، چوہے اور تیز بیر پھڑ پھڑا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ آس پاس کے گاؤں والے جب تک پہنچے، یہاں جھونپڑا خاکستر ہو چکا تھا، اب صرف کہیں کہیں خشک گھاس اور جھاڑیاں سلگ رہی تھیں یا پھر آس پاس کے درختوں کی ٹہنیوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ آگ کی شدت اور تمازت کے کم ہوتے ہی درختوں کی آڑ میں دبکے ہوئے لوگ باہر نکل آئے اور قریب کے جوہڑ سے منکوں اور برتنوں میں پانی لا کر جھونپڑے کی جگہ پھینکنے لگے مگر وہاں بچا ہی کیا تھا جسے بچانے کے لئے پانی پھینک رہے تھے۔ طالباتو یہاں موجود ہی نہیں تھا اور جھلا بچٹی بچٹی آنکھوں سے ابھی تک جھونپڑے کی جانب حیران و پریشان دیکھ رہا تھا۔ چشم زدن میں سب کچھ راگہ ہو گیا۔ جمع شدہ پونجی، قیمتی ادویات، جڑی بوٹیاں، سنیا سی بابا کا گڈری جھولا، اس کے اندر کے اسرار، سونے بنانے کی آرزو اور سب سے بڑھ کر سنیا سی بابا جسے شائد سلگتے ہوئے کلیان کی کوئی چنگاری کشتہ اجل کر گئی تھی۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے سوئے چند پرانے ساتھیوں کے سب ہی آہستہ آہستہ کھسک گئے، آس پاس کے لوگ بھی اپنی اپنی راہ لگ گئے۔

صبح کے دودھیا اجالے میں جھلا جھونپڑے کی جانب بڑھا۔ گو جوہڑ کا پانی پھینکنے سے سلگتا ہوا گھاس پھوس بجھ چکا تھا اور تمازت بھی قدرے کم ہو گئی تھی پھر بھی آگ کی سڑاند اور دھوئیں کی کڑاند باقی تھی۔ مٹی کی ٹوٹی ہوئی ہانڈیاں، جلے ہوئے چیتھرے، جلی ادھ جلی لکڑیوں کے خستہ انبار، جھلے ہوئے ٹہنیاں پتے اس کے پاؤں تلے چر چر رہے تھے۔ ایک بڑا سا شیشم کا ٹہن پکڑے وہ جلا ہوا ملبہ کریدنے لگا راگہ کریدنے سے کبھی کبھی کوئی شرمیلی سلگتی چنگاری نکل ہی آتی ہے۔ سنیا سی بابا کی چند خستہ ہڈیاں اور کھوپڑی کا ٹڑکا ہوا ناریل اس کے ہاتھ لگا۔ ان باقیات کو کپڑے میں لپیٹ کر، سر جھکائے خاموشی سے وہ ذخیرے سے نکل آیا، پاس ہی کے ایک گاؤں کے رہائشی بشیر ڈوگر سے اس کی پرانی یاد اللہ تھی، بہت پہلے جھالے نے اسے ایک مکروہ پرافہ بناری سے نجات دلائی تھی، وہ اس کا مرہون احسان بھی تھا اور دل و جان سے اس کی عزت بھی کرتا تھا۔ دس جماعت پاس، وجیہ خوبصورت جوان، ماتھے پہ حرام کاری کی مہر، آنکھ میں سور کا بال، اس کا لاہور میں پبلک ٹیلی فون کا کاروبار تھا، یہ کاروبار اس کی بد فطرت اور

ضروریات بھی پوری کرتا۔ جمالے نے یہاں پہنچتے ہی مزار پہ حاضری دی۔ بڑی عقیدت سے پھول پتی کی چادر چڑھائی، اگر بتیاں سلگائیں۔ مزار کی خستہ حالت دیکھی تو فی الفور چار مزدور لگا دیئے۔ صفائی ستھرائی، کورے منگے، نیا جھنڈا، رنگ و روغن۔ مالی بلوا کر گلاب، نیاز بو اور رات کی زانی کے پودے لگوا دیئے اور گمرانی کرنے والے منگ کو بھنگ گھوٹے کا نیا کوئٹا ڈنڈا اور کپڑے بھی دلوائے۔

چند ہی دنوں میں اس نے اپنے ارد گرد کی ساری اجنبیت کو اپنے حسن سلوک اور زبان کی شیرینی سے دور کر دیا تھا۔ بشیر ڈوگر بھی ہر روز شام، اپنے جیسے دوستوں کے ساتھ پہنچ جاتا جو اسے بات بات پہ وید جی اور حکیم صاحب کہتے نہ تھکتے تھے۔ کسی کو دوا دارو دیئے بغیر ہی ایک ماہر پیچیدہ امراض خصوصی، تبت کے ڈیزھ سوسالہ سنیا سی بابا کے خاص شاگرد رشید کی حیثیت سے اس کی شہرت قرب و جوار میں طاعون کی طرح پھیل گئی اور مریضوں، عیش و عشرت کرنے والوں کے اصرار اور تقاضوں سے مجبور ہو کر بالا خراس نے اپنا دھندا شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دو عدد ہٹے کئے ملازم تلاش کئے گئے۔ فوری ضرورت کا کچھ سلمان خریدنا اور پچھلے دروازے کے سامنے کے میدان کا کچھ حصہ ہموار کرکھاں پھونس کا چھپر ڈال دیا۔ جب بھسم تیار کرنے کے لئے الاؤ روشن ہوا تو بھنگ چرس کے رسیا اور یار ان شب زندہ باش بھی جمع ہونے لگے۔

سونا بنانے کی جستجو اور بھسم بنانے کے شوقین لوگوں کے متعلق سب ہی جانتے ہیں کہ یہ جنونی اور حسرت سلمان لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر، اپنے مقصد اور تکمیل شوق کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں اور امید و یاس کے درمیان لٹکے بندھے آخر ایک دن سب کچھ لٹا کر مر کھپ جاتے ہیں۔ ان میں کچھ تو محض ان چیزوں کی تیاری کا عمل دیکھنے، معلومات اکٹھی کرنے اور ایسے پراسرار موضوعات پہ محض زبانی کلامی گفتگو کرنے کے ٹھہرے ہوتے ہیں۔ کیا ماری، حکمت اور ہسمیات تیار کرنے کا عمل جہاں بے پناہ ہنرمندی، مشاقی، محنت، صبر اور فراوانی وقت کا تقاضا ہوتا ہے وہیں کثیر سرمائے، وسائل، محنت، صبر، جبر اور مسلسل شب بیداریاں بھی چاہتا ہے۔ تریاق دم پخت کرنے والے، ہفتوں مشروں کھل کوئٹوں کی مسلسل پسائی رگڑائی کرنے والے، الاؤ لگ کی تمازت پہ دھیان اور سمجھنیں روغن قرص گولیاں بنانے والوں کو شب بیداریاں، مسلسل بیٹھکیں، مختلف مزاجوں کی ادویات کے لمس، بو اور ذائقے سمیات کے زہریلے اثرات تباہ و برباد کر دیتے ہیں، وہ انسان سے زیادہ جن بن جاتے ہیں۔ ویدول، سنیا سیوں، کیا گروں، مہوسوں کے جسم چمے طے دیکھیں تو وہ کوئی اور ہی مخلوق

عیاشانہ ذوق کے عین مطابق تھا۔ فارغ اوقات میں ٹیلی فون کے ذریعے گھریلو خواتین اور لڑکیوں کو تنگ کرنا، فحش گوئی، لطیفے بازی، عاشقانہ شعر سنانا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا، اسی ذریعے سے کئی لڑکیوں کو گمراہ کر چکا تھا اور ان دنوں وہ دو چار روز کے لئے گاؤں آیا ہوا تھا۔ ذخیرے میں آتشزدگی کی خبر اس تک پہلے ہی پہنچ چکی تھی، وہ آج ذخیرے پہنچنے کی تیاری کر رہا تھا کہ جملا خود ہی پہنچ گیا، ساری رام کہانی اسے سنائی، رفیق ڈوگر نے اسے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلانے ہوئے اپنے ساتھ لاہور چلنے کا مشورہ دیا۔

اگلے روز وہ دونوں لاہور پہنچ چکے تھے۔ دس پندرہ روز گھومنے گھمانے، سیر و تفریح اور دعوتوں میں گزر گئے۔ جملا بھی اب ذہنی طور پہ قدرے سنبھل چکا تھا۔ ذخیرے کی کمائی سے سونے کی دو موٹی موٹی انگوٹھیاں، گلے کی وزنی زنجیر اور چند ہزار روپے اس کی جیب میں تھے۔ طب و حکمت کی چند کتابیں، کچھ کپڑے اور ضروری سامان خرید کر وہ اب کسی مناسب سی جگہ کی تلاش کرنے لگا جہاں وہ اپنا کاروبار جما سکے۔ رفیق ڈوگر نے اپنے حلقوں میں اس کی حکمت اور خاص الخاص کشتوں کے پہلے ہی ہوا باندھی ہوئی تھی۔ عیاش، بدکار اور بیمار لوگ اس کے پاس آنے جانے لگے تھے اور اپنی لچھے دار گفتگو، بلند و بانگ دعوؤں اور کشتوں، بطلوں کی حشر سامانیوں سے وہ ان کی آتش شوق اور ضرورت و طلب کو بھڑکا رہا تھا۔ اپنے آنجمنی سنیا سی بابا کی خوفناک کھوپڑی اور بازوؤں کی دو ہڈیاں، سینہ بہ سینہ صدری نسخہ جات اور چند پوٹیاں اٹھائے آخر وہ پرانے سوڈیوال کے دو کمروں کے کواٹر نما مکان میں آ بیٹھا۔ یہ جگہ اس کی ضرورت اور خواہش کے عین مطابق تھی۔ مکان کا ایک عقبی دروازہ پیچھے میدان کی جانب بھی تھا، یہاں وہ آسانی اور آزادی سے دوائیں پخت کر سکتا تھا۔ ارد گرد دھماڑی دار مزدور، رنگ ساز، چھابڑی اور ریڑھیوں والے، دودھ بیچنے والے گجر اور ساتھ والی بعلی گلی میں ساز کاروں اور بیچروں کے ڈیرے تھے۔ لمبے چوڑے خالی میدان میں ایک طرف گجروں کی بھینسیں بندھی رہتی تھیں۔ سڑک کی جانب آہ مشین تھی، عمارتی لکڑیاں اور کٹے ہوئے پرانے پرانے درختوں کے انبار تھے اور دائیں کوئے پپل کے درخت کے نیچے ایک نیم پختہ مزار تھا جہاں ہر جمعرات کو قوالیاں ہوتیں اور دھمالیں ڈالی جاتیں۔ بیچروں کے مجرے مقابلے ہوتے اور ارد گرد سے محنت کش، بے کار، مستزی مزدور، لچے لٹکے، ٹھہرک باز، بھنگی چرسی، فحش حرکتوں اور اشارہ بازیوں سے ایک دوسرے کے سر یا گل پر نوٹ رکھ کر ویلیں نذر کرتے ہوئے ان کے رزق روزی کا وسیلہ بھی بنتے۔ یہی میدان ارد گرد کے کینوں کی رفع حاجت، نہانے دھونے، کپڑے سکھانے، گرمیوں میں باہر کھلی فضا میں سونے لینے اور گپ شب کی

اپنی اپنی نیت اور اپنے اپنے کرم، نرم گرم زمانے کی ہوا کے تھپڑے کھاتے کھاتے یہ سول منول، چٹا گورا صحت مند بچہ اب پانچ برس کا ہو چکا تھا کہ بڑا رہ ہو گیا۔ راستے میں وہ نیک انسان اپنی بیوی سمیت شہید ہو گیا مگر یہ بچہ کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں آکر وہ جیسے کھائی سے نکل کر کھڑے میں آگرا تھا، اس کی جنس کی وجہ سے کوئی بھی اسے قبول کرنے پر تیار نہ تھا، کئی مہینے بے یار و مدد مہاجر کیمپ میں گزارا۔ آخر ایک ہجڑوں کے گروہ نے اسے قبول کر لیا تب سے اب تک کا سفر اس نے اسی حیثیت سے طے کیا تھا۔ قدم قدم پہ ٹھوکریں، نفرت بھری نگاہیں، پھنکائیں، فالتے، مصیبتیں اس کا مقدر اور رسوائیاں اور تضحیک اس کے گلے کا طوق تھیں۔ نیا نیا ملک تقسیم ہوا تھا۔ جہاں جس کے سینگ سائے، وہ وہیں بیٹھ گیا۔ صاحب مزار بھی اپنی منڈلی کے ساتھ مندر کی کنڈی میں براہمن ہوئے تھے اور یہ خوبصورت بچہ انہیں شروع ہی سے بہت اچھا لگا تھا۔ اس کی صاف ستھری عادتیں، مذہب، گفتگو، ادب و آداب دیکھتے ہوئے اسے اپنا متنبی بنالیا۔ ناچ گانے میں دلچسپی دیکھی تو پاؤں میں گھنگھرو ڈال دیئے۔ شب و روز کی محنت، ریاض، توجہ اور شوق نے رچی کو ایک شعلہ جوالا بنا دیا۔ درویش منش بابا کی صحبت خاص اور ہمہ وقت مصاحبت کی وجہ سے طبیعت کچھ تصوف کی جانب بھی مائل ہو گئی تھی۔ اشراف کا خون تھا، بابا نے اس کا رجحان دیکھ کر اس کی تعلیم و تدریس پہ بھی توجہ دینی شروع کی۔

میں بھگیں تو یہ میٹرک پاس کر چکا تھا۔ نماز روزہ، دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ ناچ گانے کا شغل بھی جاری تھا۔ تعلیم، تجربہ، سکرار اور تعلقات انسان کے ذہن، فہم اور شعور کے بند در پیچے کھول دیتے ہیں، سوچ خیال اور ادراک کی نئی نئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ وہ اپنی اس حالت، قدرت کی بے نیازی اور مقدر کی ستم ظریفی کا شاک بھی ہوتا، اندر ہی اندر کڑھتا بھی رہتا۔ اکثر سوچتا کہ آخر میرا قصور کیا ہے اور کیا کوئی ناکمل بچہ، ماں کے پیٹ میں اپنی جنس کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے پہ قادر ہے؟ اگر نہیں تو یہ نفرت، یہ حقارت ایسے بچوں کے نصیب میں کیوں لکھ دی جاتی ہے، اللہ کو قادر مطلق اور بے نیاز کہنے والے اس کی مشیت کو تسلیم کیوں نہیں کرتے۔ انسانی، اخلاقی اور قانونی منافقت کے اس دہرے معیار پہ وہ اکثر خون کے آنسو رو دیتا، اس کے آنسو پونچنے اور دم دلا سہ دینے والے یہی ہجڑے تھے جو شانہ دنیا والوں کی نظر میں انسان، اشراف المخلوقات تو کیا، اللہ کی ادنیٰ سی مخلوق بھی کہلانے کے مستحق نہیں تھے۔ وہ کبھی کبھی نفرت کا آتش فشاں بن جاتا۔ اس کا جی چاہتا کہ اس دنیا کے تمام مردوں کو ہجڑا بنا کر ان کے پاؤں میں گھنگھرو باندھ دے۔ مندر میں متروکہ الماک کے کچھ جھڑے پیدا ہو گئے

دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ الاؤ کے گرد اونگھتے جاگتے ملازم، نشے کی ترنگ میں گائے بجائے۔ اور تاش کی بازیاں جمانے والے ساری ساری رات انگڑائیاں توڑتے رہتے۔ چھ سات کو ارٹرا دھر ڈوم میراثی اور ہجڑوں کے ڈیروں سے شام اُترتے ہی بنے سنورے بیجڑے اپنے پچھلے دروازے کھول دیتے، پانی کا چھڑکاؤ کرتے، بڑے اہتمام سے چارپائیاں اور تخت پوش بچھا کر اپنی منڈلی جماتے اور بھانت بھانت کی بے سری آوازوں، اشاروں، آواؤں، نغزوں سے ارد گرد کے چھڑوں کی دلہنسی کا ماحول پیدا کرتے۔ ان کا استاد گرو حاجی رچی بیگم بڑے ٹھسے اور رکھ رکھاؤ سے، ریشی چادر، پچھی چارپائی پہ تنکے سے ٹیک لگائے نیم دراز اپنے شاگردوں سے پاؤں دلاتا رہتا۔ حکیم جمالی سے اس کی ایک دوسری سی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ اس کی زمانہ دیدن اور مردم چشیدن نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ آدمی بڑے کام کا ہے۔ خاص طور وہ اس کی مزار کی مرمت خدمت سے بے حد متاثر ہوا تھا اور اب وہ اسے کسی مناسب موقع پہ دعوت دینے کی سوچ رہا تھا۔ اگلے ہفتے ہی حکیم جمالی نے مزار کے اوپر پکلی نثر ڈلوایا اور دو دیکھیں تیجن کی چڑھوائیں تو اس کی عقیدت اور دریا دلی کے مزید چرچے ہونے لگے۔ حکیم جمالی نے حاجی رچی بیگم کے ہاتھوں ہی فاتحہ اور لنگر تقسیم کروایا تھا۔ اس رات بھی خوب ناچ گانا، ہواب پاس پڑوس کے غریب غریاء، محنت کش، ڈوم مرالی اور ڈیروں والے ہجڑے کھسرے تو خاص طور پر اس کے گرد ویدہ ہو گئے۔ پھر بہانے بہانے آنا جانا ہونے لگا اور چھوٹے موٹے کاموں میں پیش پیش رہنے لگے۔ راہ رسم بڑھی تو ایک دن حاجی رچی بیگم نے اسے اپنے ہاں دعوت پہ مدعو کر لیا۔

حاجی رجب علی عرف حاجی رچی بیگم ان ڈیروں کے ہجڑوں کا سرپرست اور استاد گرو تھا۔ ساٹھا پٹھا ہونے کے باوجود بڑا طر حدار، ٹھسے ٹھکے والا، پکا نمازی، حاجی اور جہاندیدہ، کپور تھلے کے ایک خوشحال سکھ گھرانے میں پیدا انکی ہجڑا پیدا ہوا تھا۔ عزت دار باپ نے کرپان نکال کر اسے ختم کرونا چاہا تو ممتا کی ماری ماں نے پاؤں پکڑ لئے، دہائی دی کہ میرا پہلو ٹھکی کا معصوم نرودش بالک ہے، یہ انیائے نہ کرو۔ رات کی تاریکی میں باپ نے اس پوٹ کو پوٹلی میں لپیٹ کر شہر سے باہر ایک بے آبادی مسجد کی میڑھیوں پہ پھینک دیا۔ صبح سویرے ایک بے اولاد نمازی ادھر آیا تو اس معصوم کو سینے سے لگا کر گھر لے گیا۔ کچھ لوگ اس قسم کی پاپ پوٹلیاں مسجدوں، مندروں، گردواروں کے پاس خدا، بھگوان، گرو کی گمرانی میں چھوڑ آتے ہیں۔ خدا نے اپنے اس بندے کے دل اور گھر میں اس معصوم کے لئے شفقت، جگہ اور رزق پیدا کر دیئے۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ پیدا انش ہجڑا ہے مگر اس اللہ کے نیک بندے نے تو اسے انسان اور معصوم سمجھ کر اپنایا تھا۔

تھے۔ اثر و رسوخ والوں نے ملی بھگت سے ان کو ناجائز قبضے کے نوٹس دلوادے اور ویسے بھی وہاں کے کینوں کی اکثریت اس ہجڑا پارٹی کو وہاں سے نکالنا چاہتی تھی۔ کسی لمبے چوڑے چکر میں پھنسنے کی بجائے وہ ایک اچھی خاصی رقم تھام کر وہاں سے نکل کر اس مضافاتی بستی میں چلے آئے۔ کوڑیوں کے مول زمین خریدی اور کچے پکے کمرے بنوا کر ڈیرے ڈال دیئے۔ ساز سنگت، ہنرمندوں اور شاگرد پیشہ ہجڑوں کی اچھی خاصی نفری ساتھ تھی۔ ملک بھی اپنے قدموں پہ کھڑا ہو چکا تھا، ان کے حالات اور کار روزگار میں بھی برکت پڑنے لگی۔

یہاں پہنچنے کے ٹھیک پندرہ برس بعد بابا معمولی سی علالت کے بعد چل بسے۔ آدھی رات، خاموشی سے پیچھے کے میدان میں پپیل کے سائے تلے انہیں دفن کر دیا گیا۔ ساری منقولہ، غیر منقولہ جائیداد اپنے اسی متنبی یعنی حاجی راجی بیگم کے نام کر گئے تھے۔ بابا کا خلیفہ اور با اختیار گرو ہوتے ہی اس کی کاپی لٹ گئی تھی، جیسے وہ اب تک مردوں اور سماج کے منافقانہ رویوں سے نفرت کا ایک ایک ذرہ اپنے اندر کہیں اکٹھا کرتا رہا اور اب وہ ذرے، پتھر ٹیلے اور پہاڑ بن گئے ہوں، وہ اوپر کھڑا ہوا اور نیچے وادی میں ہجڑوں سے نفرت کرنے والوں ان کو جنمی اور لعنتی گردانے والوں پر اتنے پتھر برسائے کہ وہ اپناج ہو جائیں، نامرد اور ہجڑے ہو جائیں۔ ہر طرف ہجڑے ہی ہجڑے ہوں۔ رزق برق لباس پہنے، سولہ سنگھار کئے، گھنگھرو باندھے، منک منک لہک لہک لہراتے ناپتے لگتے اور پھر وہ انہیں دلیں پھینکے۔ وہ اب تک کئی صحیح الوجود لڑکوں کو ”زنانہ“ بنا چکا تھا۔ اس عمل سے اسے بے پناہ تسکین حاصل ہوتی، خاص طور پر اس وقت تو اس کی حالت دیکھنے لائق ہوتی جب کہیں کسی خوبو، تیکھے نین نقش، زنگیت پسند لڑکے کو دیکھ لیتا۔ پھر اسے شیشے میں اتارنے کی خاطر وہ ہر حربہ استعمال کرتا۔ دائے، درے، قدے، سنے، ہر طرح سے اپنے ڈھب پہ لانے کی کوشش کرتا۔ چاند عرف چاندنی، قدیر عرف نیلم، نواز جو اب نازو بن چکا تھا۔ اقبال، صابر، دیک بنگالی، نذیر، نمو، ریشم سندھن، گوگو، ڈینی عرف لیڈی ڈیانا، رحمت پانڈی عرف ریکھا، سینڈائر کا طالب علم سرور اقبال عرف سری دیوی۔ ایسے ہی کئی ایک لڑکے اپنا مردانہ تشخص گنوا کر زنانه صورتیں بن چکے تھے۔ لمبی لمبی زلفیں، مٹنے ہوئے امرو، خوبصورت خدو خال، نازو نزاکت میں ڈھلے ہوئے پیکر، انگ انگ بجلیاں، روم روم ردھم۔ محفلوں، شادیوں اور شوقیہ فرمائشی پروگراموں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور اپنی حق حلال کی کمائی لاکر اپنے گرو کے آگے ڈھیر کر دیتے۔ ان کے مداحوں، قدردانوں میں جہاں نچلے طبقے، ستے ذوق شوق والے لپے لفٹے اور بد فطرتے ہوتے وہاں متوسط اور اونچے طبقے کے شوقین مزاج بھی تھے جو محض تقض طبع اور شغل میلے

کے لئے پرائیویٹ محفلوں میں ان کی پذیرائی کرتے۔ میٹے منڈیاں عرس، موت کے کنویں، دیہاتی تھیٹر، غرض ہر عوامی تفریحی سلسلوں میں ان کی جلوہ آفرینیاں نمایاں ہوتیں۔ اس طرح جہاں حاجی راجی بیگم کی دولت میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا تھا وہیں اس کی شہرت و منزلت بھی بڑھتی تھی۔ اچھے بھلے مردوں کو ہجڑا زنانه بنانے کے کئی ایک سینہ بہ سینہ صدری نغے اور طریقے اس کے پاس موجود تھے جنہیں وہ موقع محل، حالات اور ضرورت کے تحت استعمال کرتا تھا۔ میڈیکل سائنس اور حفظان صحت کے اصولوں کے خلاف یہ خطرناک ٹوکے، ننانوے فیصد خاطر خواہ نتائج سے ہمکنار ہوتے۔ حاجی راجی بیگم کے پیرو مرشد بھی مجرب و نیم ہجڑے تو تھے ہی، ان کے مسلک مقام کے متعلق کوئی بھی صحیح سے نہ جانتا تھا۔ کوئی انہیں گپت ولی سمجھتا اور کوئی محض تارک الدینا درویش مگر وہ جو بھی تھے اس مخلوق کے جلاواوات تھے جو اس دار فانی سے پردہ پوشی کے بعد ان کے لئے مستقل ٹھور ٹھکانے اور روزی رزق کا بندوبست کر گئے تھے۔

حکیم جمالی کے یہاں آجائے سے اسے اپنے پیرو مرشد کی کمی پوری ہوتی ہوئی محسوس ہوئی، ایک آدھ بار اس نے دے دے الفاظ میں اس کا اظہار بھی کیا کہ میاں جی نے حکیم جمالی کے روپ میں ان کے لئے ایک مددگار بھیج دیا ہے، اب اس کی حکیم و معاونت میں کسی قسم کا کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں ہونا چاہئے۔ کچھ ہی عرصہ میں راجی سہی اجنبیت بھی دور ہو گئی۔ میراثیوں، ہجڑوں اور دیگر آس پاس کے کینوں نے مزار کے انتظامات اور آپس داری کے معاملات میں حکیم جمالی کی سرپرستی قبول کر لی۔ واقفیت اور شہرت، دھند کی مانند پھیل گئی، مریضوں کی قطاریں لگ گئیں اور ظاہر ہے کہ مریضوں میں اکثریت امراض خبیثہ اور داو عیش دینے والے عیاش لوگوں کی ہی تھی جو منہ مانگے داموں نشاط آور دوائیں حاصل کرتے۔ دواؤں، شتوں کی پیداواری استعداد بڑھانے کی ضرورت پیش آئی تو عملہ ملازمین بھی آگئے مگر صاحب حیثیت مریضوں، مہمانوں کی نشست و برخاست کے لئے یہ ذبہ نما کواڑ کسی طور بھی موزوں نہیں تھے۔ کاروباری نقطہ نظر سے بھی اب اسے نسبتاً بہتر اور کشادہ جگہ کی ضرورت تھی چنانچہ دوائیں تیار کرنے والے شاگردوں اور دو چار ملازموں کو یہاں اسی جگہ چھوڑ کر وہ خود اس موجودہ دفتر میں اٹھ آیا تھا جس کے پچھلے حصے میں اس کا عشرت کدہ تھا جہاں وہ اس وقت اپنے بد قماش دوستوں کے ساتھ داو عیش دے رہا تھا۔

☆☆☆

حکیم جمالی کے ظلمت خانے کے باہر صبح کا اجالا پھیل چلا تھا۔ رات اپنی بساط الٹ چکی تھی، سارے مہرے باری باری پٹ کر اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ حکیم جمالی ابھی تک غسل

خانے میں گھسا ہوا تھا اور اطلاعی گھنٹی کی آواز اس نے وہیں پہنچی۔ باہر خوش نصیب میرج یورو کی مالک مس عاشی کی لاش لاش سیاہ شیشوں والی گاڑی کھڑی تھی۔ مس عاشی کو اس نے رات ہی ٹیلیفون پہ اطلاع کر دی تھی۔ جلدی جلدی نہادو کر اس نے گالیوں اور ٹھوکروں سے دوستوں کو جگایا۔ کبوتری کو بھی جھنجھوڑا مگر تو بے سدھ پڑی تھی، شاید اسے احساس ہی نہیں تھا کہ رات اس کے ساتھ کیا بیت چکی ہے۔ ادھ کھلی، بے چارگی، غنودگی اور بے بسی کے غبار سے جل تھل سرخ آنکھیں عجیب سا نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ اندر داخل ہوتے ہی مس عاشی نے ناک پہ رومال رکھ لیا اور چرس، شراب، تمباکو اور غلاطت کے تعفن سے بیزار ہو رک اٹنے پاؤں دفتر میں واپس آگئی۔ حکیم جمالی کیلے بالوں میں کنگھی کرتا ہوا اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

”کیسی ہے کبوتری۔۔۔؟“ سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے مس عاشی سے پوچھا۔

”حکیم صاحب! پہلے بتائیے کہ رات یہاں آپ مڑے جلاتے رہے ہیں، سزاوند سے نہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔ توبہ توبہ! اتنی بدبو۔۔۔!“

وہ کمال ڈھٹائی سے بولا۔ ”مس! بدبوئیں اور خوشبوئیں تو ساتھ ساتھ ہیں۔ آپ ایک نظر لڑکی کو دیکھ لیں، پسند آئے تو بات کریں ورنہ میرے پاس اور خواہش مند بھی ہیں۔۔۔“

”کوئی پھڈے کا خطرہ تو نہیں۔۔۔؟“ وہ بھی سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ پوڈوری ہے، گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔ ایسی کبوتری کا کوئی آگا پیچھا نہیں ہوتا، آپ مطمئن رہیں۔۔۔ اندر آکر اچھی طرح دیکھ لیں، میں اسے زیادہ دیر یہاں نہیں رکھ سکتا۔۔۔“

مس عاشی نے اندر پہنچ کر اسے بھرپور نظروں سے ٹٹولا۔ پانی کے چند چھینٹے اس کے چہرے پہ پھینکے، چادر ہٹا کر اس کے وجود کو دیکھا، گالوں کو تھپتھپایا تو اس نے ”اوں“ کرتے ہوئے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”ہوش کرو، بے بی! ہوش کرو۔۔۔“ وہ اسے سہارا دیتے ہوئے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ حکیم جمالی نے کوئی مشروب اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ چند گھونٹ حلق سے اترے تو اس نے موٹی موٹی آنکھیں کھول دیں۔

”میں۔۔۔ میں۔۔۔“ وہ دائیں بائیں متوحش نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ”میں کہاں ہوں۔۔۔ آپ کون ہیں؟“ وہ مس عاشی کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”میری چند! میں تمہاری بہن ہوں۔۔۔ اٹھو، نہادو کر فریش ہو جاؤ۔۔۔“ وہ اسے

سہارے دے کر غسل خانے میں لے گئی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ مس عاشی کی گاڑی میں بیٹھی کسی نئی منزل کی جانب جا رہی تھی۔



عشرت جہاں عرف عاشی دو عدد خاوندوں سے مطلقہ، بے شمار بد قماشوں کی داشتہ، دو عدد بچوں کی ماں، تعلیم یافتہ، تین عدد اسکولوں کی معطل استانی، کئی پولیس کیسوں میں ملوث، ابھی تک مس ہی تھی۔ خوبصورت، چھریے سنبھالے ہوئے جسم کی مالک، لچھے دار گفتگو اور رجھانے بھانے کے فن کی ماہر، دوسروں سے اپنی بات منوانے کے فن میں طاق، پہلی نظر میں معصوم کنواری دکھائی دیتی۔ بظاہر بے حد ملنسار، سوشل، ہمدرد، خدا ترس۔۔۔ اس کے اصل جوہر تو اس وقت کھلتے جب کسی کا اس سے پالا پڑتا، اس ناگن کا کانپانی نہیں مانگتا تھا۔ بڑے بڑے پرانے کھلاڑیوں کا اس کے روبرو پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ کئی اخباروں میں باقاعدگی کے ساتھ، خوش نصیب میرج یورو کے اشتہار شائع ہوتے تھے جن میں شریف گھرانوں کی لکھی پڑھی، دولت مند، دین دار سنگھڑ لڑکیوں، کئی کئی مربعوں اراضی کی واحد مالک بیواؤں کے لئے شہری دہائی، پڑھے، ان پڑھ، خود مختار، عقد ثانی کے خواہش مندوں کے لئے خوشخبریاں ہوتیں۔ خوف خدا، انسانی ہمدردی، دکھی عوام کی بے لوث خدمت کے جذبے کا ذکر ہو تا۔ امریکہ کینیڈا کے دیڑھے، فیکٹریوں، زرعی زمینوں اور لاکھوں کے بینک بیلنس کے لالچ میں بڑے بڑے حرصی ٹو، چوہوں کی مانند اس کے چوہے دان میں پھسنے کے لئے جوق در جوق آتے رہتے۔ اس کی خوبصورت کشتی آنکھوں والی کرچن، مس مارگریٹ دن بھر ان غرض مندوں کے رجسٹریشن فارم پر کبترتی اور لال ہرے نوٹ لے لے سرخ ناخنوں والی پتلی انگلیوں سے وصول کرتی رہتی۔ مڈل فیل، گریجویٹ، رنگے بالوں، مصنوعی دانتوں اور دوگ برادر نوجوان، کئی کئی بچوں والے کنواریے ایک دوسرے سے بچتے بچاتے، نظریں چراتے، اپنی اپنی قسمت کے فیصلوں کے منتظر رہتے۔ بد مزہ چائے کی سرکیاں لیتے ہوئے، غیر معروف ماڈل اور پرائیویٹ خوبصورت لڑکیوں کی تصویروں والے البم سے اپنے اپنے خوابوں کی شہزادیوں اور خیالی بیویوں سے راز و نیاز کرتے رہتے۔ ان کے متعلق جملہ کوائف، ان کی عمر، قد، رنگ، اٹاٹوں جائیداد کا

جائزہ لیتے رہتے۔۔۔ خوبصورت لڑکیوں کی رنگین تصویروں والے یہ قیمتی البم خاص طور پر ان ضرورت مندوں کے لئے میزبہ نمایاں طور پر رکھے جاتے۔ رجسٹریشن کی بھاری فیس وصول کرنے کے بعد ان لوگوں سے تین مختلف انداز کی تصویریں، تعلیمی اسناد، ملازمت، کاروبار، شناختی کارڈ اور ذاتی جائیداد کی تفصیل، گاڑیوں اور بینک بیلنس کی نقول طلب کی جاتیں۔ ان کی فراہم کردہ معلومات اور نقول کی روشنی میں ان کو مختلف درجوں یعنی اے بی سی میں تقسیم کر کے ان کی حیثیت کے مطابق ان سے سلوک کیا جاتا۔ تیسرے درجے کے پھکڑ، محض خوبصورت لڑکیوں کے شوقین حضرات کو مسلسل وعدہ فردا میں رکھ کر بے دم کر دیا جاتا، بد بخت چکر لگا کر خود ہی چکر اجاتے اور آخر کار کسی اور شادی دفتر کا رخ کرتے یا داتا دربار چلے جاتے، اس کلاس کے لوگوں سے محض رجسٹریشن فیس ہی وصول ہوتی۔ بی کلاس کے کلاسٹ ہوئے جن میں تھوڑا بہت مالی استحکام دکھائی دیتا، اس سے مختلف جیلوں بہانوں سے پیسہ بڑا جاتا۔ خوب خاطر مدارت ہوتی، آج کل میں کامیابی کی امید دلائی جاتی۔ کبھی کبھی کسی فرضی لڑکی یا والدین سے انٹرویو کر دیا جاتا۔ کمیشن پہ کام کرنے والی آبرو یافتہ لڑکیوں سے ملاقات کرائی جاتی، ایک دوسرے کو سمجھنے جاننے کے بہانے ان کو تنہائی اور ہوٹلوں، پارکوں، تھیٹروں، شاپنگ سنٹروں میں گھومنے کے مواقع فراہم کئے جاتے، اس طرح بھی ان کو ہلکا کیا جاتا اور سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک اس غریب کی جیب خالی نہ ہو جاتی۔ اے کلاس میں وہ لوگ ہوتے جن کا مالدار باپ نیا نیا فوٹ ہو ا ہو یا پھر جن کے پاس کہیں سے حرام کامال آیا ہو۔ دی پلٹ، بیوقوف حرصی بوڑھے، وہ دیہاتی جن کی بجز زمینیں کسی سکیم میں آگئی ہوں۔ پھوڑے بیویوں سے بیزار دولت مند عیاش ادھیڑ عمرے یا پھر کوئی اولاد زینہ کے طلب گار جو اپنی بکلی بیوی سے چھپ کر دوسری شادی کرنا چاہتے ہوں یا پھر وہ لوگ جو اپنی ساجی حیثیت یا کسی بھی اور وجہ سے ”اس بازار“ جانے کے متمحل نہ ہوں۔ اس قبیل کے لوگ ان کے لئے وی آئی پی کی حیثیت رکھتے۔ جو کوئی منہ مانگے دام دیتا تو فوراً اس کا دامن مراد بھر بھی دیا جاتا۔ ان امیدواروں میں کئی ایک گائندھ کے بچے یا جھگڑا لڑکے کے پرانے پاپی بھی ہوتے، ایسے لوگوں سے نہنٹے اور معاملہ صحیح رکھنے کے لئے چند پڑھے لکھے بد معاش ٹاپ کے ملازم بھی موجود تھے کہیں معاملہ بگڑنے پہ اپنی پہچان کے پولیس ملازموں سے بھی مدد لی جاتی اور ایسے لوگوں کا باقاعدگی سے ماہوار خرچ پانی پینچایا جاتا۔ کئی ایک کو جسمانی اور جنسی طور پر کمزور لاغرتا کر عجم جمالی سے مشورہ اور علاج کی ترغیب دی جاتی، رہی سہی کسر یہ نکال دیتا اور اگر اس کے پورے طرح نچوڑنے کے باوجود بھی لیموں میں چند قطرے رس کے رہ جاتے تو پھر اسے عامل ظہور

شاہ کے آستانے میں داخل کروا دیا جاتا جو پہلے اس کا زانچہ بناتا، ستاروں کی چولیس چالیس درست کرتا۔ برجوں کے گھر مرمت کرتا، سعد و خس کے راستے صاف کرتا۔ پھر الو کی چونچ، چیتے کی چنی، ہما کھیل، تنفس کی کلفی طلب کرتا اور پھر سائل کی سہولت کے لئے خود ہی تکلیف کر کے تبت سے منگواتا۔ سائل اس دوران میانی صاحب، جیل خانے، پاگل خانے یا بہت ہی غیرت والا ہو تو ریل کی پٹری تک پہنچ جاتا۔

عامل ظہوری شاہ کے آستانے پہ مردوں سے زیادہ خواتین آتی تھیں۔ لڑکیاں زیادہ ہوتیں جو من پسند شادی کی خواہش مند اور محبوب کو اپنے قدموں میں زیر کرنے کی متمنی ہوتیں۔ ان سادہ لوح بیوقوف بد نصیب لڑکیوں میں کئی ایک ان بھیڑیوں کے نرغے میں گھر کر رہ جاتیں۔ عامل ظہوری شاہ ان کے ملن کے ستارے سیدھے کرتا کرتا ان کی جیبیں الٹی کر دیتا، حساس قسم کی معلومات حاصل کر کے بلیک میل کا سامان بھی تیار رکھتا یا پھر مس عاشری سے ملا دیتا جو ان کو پڑھے لکھے متمول رشتوں کا جھانسا دے کر مزید مال، بیورٹی، طاہری ہمدردی، انسانی خدمت، گاڑی، بنگلے، ہوٹل، کپڑے، میک اپ، کھانا پینا، آسائش، آسانی کو پاگل کر دیتیں۔ اب اس بد قسمت کی قسمت کہ وہ خلع کی ریاستوں میں کہیں سمگل ہوتی ہے، کسی نئے نئے دولت مند کے عشرت کدے کی زینت بنتی ہے یا پھر کسی وڈیرے کے حرم میں داخل ہوتی ہے اور اگر کچھ نہیں تو پراسٹیوٹ قبضہ گیری تو مقدر۔ حرام کی مہرجن کی پیشانیوں پہ ٹھکی ہوتی ہے وہ لاکھ کوشش کے باوجود کسب حلال نہیں کر سکتے اور جو حمال نصیب ان کے پھنگل میں ایک بار پھنس جائیں، ان کے پاؤں تلے دلدلیں آ جاتی ہیں اور آزاد ہونے کی ہر کوشش پہ وہ مزید دھستے چلے جاتے ہیں۔ سہارے کا ہر تنکا تیر اور ہر تار اڑدھا بن کر ان پر اپنا منہ کھول دیتا ہے۔

وہ نوچی کھوٹی نو گرفت کبوتری بھی فکر سود و زیاں سے بے نیاز، تردد آفغلاں سے بیزار، جسم و جان سے بے خبر، منہ کھولے سا گوان کے دراز پلنگ پہ ریشمی بستر میں گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ کھلے لبوں کے کونے سے رال کی پتلی سی دھار، تار عنکبوت کی مانند تکیے سے تنی تھی جیسے معصوم بچے بے سدھ سوتے ہیں۔ کمزور سادایاں ہاتھ پھولے ہوئے گال کے نیچے اور گردن، چہرے پہ نیلے نیلے نشان۔ ابھرے، پچکے ہونٹ جیسے پھٹے ہوئے غبارے کو بچے پھنچنے سے کھینچ کھینچ کر چھوٹے چھوٹے بلبلے سے بنا لیتے ہیں۔ بے آب و رنگ الجھے ہوئے بال، نیند کے اندھے جنگل میں کہیں کسی بھٹکے ہوئے غزال کی مانند، نیم دا سہمی ہوئی متورم آنکھیں۔ کیسی بے بسی، بے کسی اور بے نوائی کی تصویر تھی۔ ان تصویروں سے کتنی مختلف، جو اس بیڈ روم کی دیواروں پہ آویزاں تھیں۔ نیم عریاں، جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والی شیطان زاد یوں کی

ملاقات! — دوسرے روز، وہ اسی وقت پھر اپنے عزیز کے پاس دوائیں پہنچانے کی غرض سے پہنچا تو وہ دس روپے والی کو بھول چکا تھا مگر لینے والی کو یاد تھا۔

”لیجئے، یہ اپنے دس روپے۔“ بڑے گیٹ سے ذرا آگے فروٹ والے کے پاس وہ کھڑی تھی، ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جو شکل صورت سے اس کی چھوٹی بہن دکھائی دیتی تھی۔  
”آپ بھولی نہیں۔“ میں نے کہا تھا، ”کسی فقیر کو دے دیجئے گا۔“  
وہ زبردستی نوٹ تھماتے ہوئے بولی۔ ”یہ نیک کام آپ خود ہی انجام دیں، اس مدد کا ایک بار پھر شکریہ!“

پیسے جیب میں رکھتے ہوئے وہ پوچھنے لگا۔ ”یہاں آپ کا کوئی مریض داخل ہے۔؟“  
”میرے ماموں داخل ہیں۔“  
”او، ہو۔۔۔ کیا تکلیف ہے انہیں۔؟“ ازراہ ہمدردی وہ بات بڑھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”السر بگڑ چکا ہے۔۔۔ اور بھی کچھ تکلیفیں ہیں۔۔۔“  
”اللہ انہیں صحت دے۔۔۔ میں کچھ آپ کے لئے کر سکتا ہوں؟“ رما اس نے پوچھ لیا۔  
ساتھ چھوٹی بہن شاید غلٹ میں تھی، وہ اسے کھینچتے ہوئے کہنے لگی۔ ”چلو نا، باقی ماموں انتظار کر رہے ہوں گے۔“

وہ کچھ جواب دیئے بغیر ہی گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔  
چوتھے روز ایک بڑی سی خون آلودہ تے کے بعد کبوتری، یعنی نعمت کا ماموں قید حیات سے رہا ہو گیا اور اس کے بعد ان کی ملاقات ہی نہیں ہوئی، وہ اسے بھول چکا تھا۔ دواڑھائی ماہ بعد مال روڈ پہ خواتین کسی سلسلے میں احتجاج کر رہی تھیں، سڑک بلاک تھی۔ چیئرنگ کراس کے پاس وہ موٹر سائیکل پہ سوار، کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ خواتین کا چھوٹا سا جلوس احتجاجی بینر اٹھائے سڑک سے گزر رہا تھا، معا اس کی نظر نعمت پر پڑی اور آپ اسے اتفاق یا کچھ بھی کہہ لیں کہ اسی لمحہ اس کی نظر بھی اس کی نظر سے ٹکرائی، ہلکا سا مسکرا کر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جلوس آگے بڑھ گیا اور وہ ٹریفک کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ سگریٹ سلگا کر وہ موٹر سائیکل اشارت کرنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

”آپ کے پاس پانچ سو کا پیسہ ہو گا۔؟“  
دیکھا تو وہ نعمت تھی، وہی ہسپتال والی لڑکی۔۔۔ قدرے دلی لیکن اسماٹ، ہلکا سا میک

تصویریں! — سائیڈ ٹیبل پہ موسمی پھل، جوس اور ٹیلی فون پڑا تھا۔۔۔ انسانی دماغ بھی ایک ٹیلی فون کی مانند ہوتا ہے، شعور اور تحت الشعور سے جڑا ہوا۔ انسان چاہے سوئے یا جاگے، اپنے تحت الشعور سے جڑا رہتا ہے۔ اس کی کھوپڑی کے اندر کا شعوری حیاتیاتی ایکسیجنگ ہر حالت میں اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ اس وقت بھی اس کے دماغ میں مسلسل ٹرن ٹرن گھنٹیاں بج رہی تھیں، قدرے ہوش و حواس میں ہوتی تو سوال و جواب کا یار ا کرتی مگر وہ تو ایک نیم مردہ کبوتری کی مانند کلبک میں بے یار و مددگار پڑی تھی۔

\*\*\*

شوکت، عورتوں کا شکاری نہیں تھا۔ بس اتفاق سے یہ کبوتری خود بخود اس کی چھتری پہ آ بیٹھی تھی۔ سروسز ہسپتال میں وہ اپنے کسی عزیز کی عیادت کے لئے گیا تھا۔ فراغت کے بعد چائے پینے کی غرض سے کنٹینن پہ پہنچا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک آواز آئی۔  
”جی، آپ کے پاس پانچ سو کا پیسہ ہو گا۔؟“

رکشہ کے پاس ایک لڑکی اس سے پوچھ رہی تھی، اتفاق سے اس کے پاس بھی کھلے روپے نہیں تھے۔ ادھر سے معذرت سن کر وہ پھر اپنے پرس کی الٹ پلٹ کرنے لگی۔ رکشے والا کہنے لگا کہ لائیے، میں باہر سے لا دیتا ہوں مگر پرس کی تلاشی سے اسے دس بارہ روپے مل گئے۔ دس روپے پھر بھی کم تھے۔ شوکت نے صورت حال دیکھتے ہوئے، دس کانوٹ رکشے والے کو دے کر فارغ کر دیا۔

”شکریہ! — یہ لیجئے مجھے کنٹینن سے پیسہ لے دیں۔“ وہ پانچ سو کانوٹ اسے تھماتے ہوئے بولی۔

”آپ دس روپے کی فکر نہ کریں۔۔۔ آپ کا مسئلہ حل ہو گیا، یہی کافی ہے۔۔۔“ وہ بولا۔

”مگر مجھے بھی تو کھلے روپوں کی ضرورت ہے۔۔۔ آپ کنٹینن سے تڑوا دیں اور مہربانی سے اپنے دس روپے بھی لے لیں۔۔۔“ وہ اصرار کرتے ہوئے بولی۔

”اچھا، آئیے، چائے پیتے ہیں۔ اسی بہانے پیسہ مل جائے گا۔“  
وہ لڑکی معذرت کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے جلدی ہے اور پھر کچھ دوائیں بھی خریدنی ہیں مگر آپ کے دس۔۔۔“

”کسی فقیر کو یا ہسپتال کے فنڈ میں دے دیجئے گا۔“  
یہ سن کر کوئی جواب دیئے بغیر وہ غلٹ سے ہسپتال کی جانب بڑھ گئی۔ یہ تھی پہلی

آپ دُلکش لباس پر سر جھلاتی ہوئی وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ رسمی حال احوال پوچھنے کے بعد بولا۔  
”گو کیا آج بھی آپ سے ملاقات چہنچ کے حوالے سے ہی نصیب میں لکھی ہے۔۔۔ ویسے  
آپ خود بھی کافی چہنچ سی لگ رہی ہیں۔۔۔“

اس نے شرارت آمیز نظروں سے اس کے سراپے پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا تو وہ پھیکا سا  
مسکرا دی اور لمبی سانس بھرتے ہوئے بولی۔ ”ہاں، چہنچ تو جیسے اپنی زندگی کے ساتھ چپک سی گئی  
ہے۔۔۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں۔۔۔“ وہ اسے کھیتے ہوئے بولا۔

”آپ سے چہنچ کے سلسلے میں ملاقات ہوئی۔۔۔ ماموں جی اسپتال داخل تھے، وہ مر  
گئے۔ بہت بڑی چہنچ آئی۔ پھر ماں بیمار پڑی، ہمیں فیس ادا نہ کرنے کی وجہ سے سکول سے  
خارج کر دی گئیں۔ اب ایک دو روز ہی مکان کا کرایہ ادا نہ کر سکنے کی صورت میں ایک اور  
چہنچ۔۔۔“ کتے کتے وہ خاموش ہو گئی، دونوں طرف سے خاموشی کے چند لمحے گزرے۔

”آگے بولو۔۔۔ رک کیوں گئیں۔۔۔؟“

وہ دائیں بائیں دیکھتے ہوئے، بڑے بچھے ہوئے لمبے میں کہنے لگی۔ ”اس وقت اگر فارغ  
ہوں تو چلیں، لارنس گارڈن میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں، ذرا چہنچ ہو جائے گی۔۔۔“

اس کی زخمی مسکراہٹ میں چھپی ہوئی آہیں کراہیں اس نے محسوس کر لی تھیں اس لئے  
نہ چاہنے کے باوجود وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ لارنس گارڈن وہ خاموش رہی۔

”چلیں، گراؤنڈ میں شاہ بلوط کے نیچے بیٹھتے ہیں۔۔۔“

”اتنی دور؟۔۔۔ یہاں ریسٹورنٹ کے لان میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔۔۔“ وہ اسے

مشورہ دیتے ہوئے کہنے لگا۔

”نہیں، ادھر ہی بیٹھتے ہیں۔ چائے بھی ادھر ہی منگوائیں گے۔۔۔“

شاہ بلوط کے چھتار تلے، تنگی نیچ پہ وہ کسی مہارانی کی طرح براجمان ہو گئی۔ وہ سامنے کھلے  
ہوئے پیلے گلابوں کے قطعہ کی جانب بڑی محویت سے نظریں گاڑے دیکھ رہی تھی۔ ایک  
بھورا، پھول کے رخسار پہ بیٹھا رس چوس رہا تھا۔ اس کے اڑتے ہی اس کے منہ سے بے  
ساختہ نکلا۔

”چہنچ۔۔۔“

”کس چہنچ کا ذکر کر رہی ہو۔۔۔ کو، کیا کہنا چاہتی ہو۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔“ وہ جیسے راگہ کھیتے ہوئے بولی۔ ”ایک چہنچ یہ بھی کہ میرے منگیترے

منگنی توڑ دی ہے۔۔۔“ وہ اپنے ہاتھ کی ایک خالی انگلی پہ سفید سے نشان کو سہلانے لگی۔ پھر  
پرس کھول کر ایک پڑیا دکھاتے ہوئے بولی۔ ”ایک دکھانے کی چہنچ یہ ہے۔۔۔“  
وہ غور سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”یہ کیا ہے۔۔۔؟“

”یہ وہ تریاق ہے جو سوجوں کے زہر اور دکھوں، محرومیوں، مجبور یوں اور میری بے بسی کے  
قہر کا بہترین علاج ہے۔۔۔ یقین کرو، اگر یہ سہارا نہ ہوتا تو میں ماموں کی بے بسی کی موت سے  
بہت پہلے ہی مر گئی ہوتی۔۔۔ میں جانتی ہوں، مرنا برحق ہے مگر میں وقت سے پہلے مرنا نہیں  
چاہتی۔ ہر حال، ہر طور جینا میری مجبوری ہے بیمار ماں کے لئے، دو چھوٹی بہنوں کے لئے جن کی  
کفالت کرنے والا میرے سوا اور کوئی نہیں۔ کرائے کا مکان، منگائی۔۔۔“

”ذرا رکھو۔۔۔“ وہ پڑیا پکڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”اس کا مطلب کہ تم یہ ہیروئن جیتی  
ہو؟“

وہ پڑیا احتیاط سے واپس لیتے ہوئے بولی۔ ”میری باتیں سننے اور یہ پڑیا دیکھنے کے بعد بھی  
تم یہ پوچھ رہے ہو؟۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔“

وہ سگریٹ کی ڈبیا کی پتی پہ چٹکی سے پوڑ پھیلائے لگی اور چادر کے گھونگھٹ کی آڑ میں  
ماہجس جلا کر زور زور سے سانس کھینچنے لگی۔ شوکت گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا، اتفاق سے ادھر  
پاس قریب کوئی اور نہ تھا ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ اسے ادھر  
تھائی میں لے کر کیوں آئی تھی۔۔۔ اس کے سوچتے سوچتے وہ اپنا کام کر چکی تھی۔ ہلکے ہلکے  
سرور میں لہراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی، استعمال شدہ پتی کی گولی بنا کر پرے پھینکتے ہوئے وہ  
بولی۔ ”کوئی نصیحت کرنے کی کوشش نہ کرنا، نہ کوئی ہمدردی جتانے مجھے ان بیکار چیزوں کی قطعی  
کوئی ضرورت نہیں۔ میں ان منافقانہ باتوں سے بہت آگے نکل چکی ہوں۔۔۔ مجھے ساتھی کی  
ضرورت ہے، ناصح یا مشورہ دینے والی کی نہیں۔۔۔“ یکدم اس کی آنکھوں میں شعلے سے  
دھنکے لگے اور وہ بڑے گھمبیر لہجے میں کہنے لگی۔ ”ایک بات اور سنو!۔۔۔ میری بسراوقات جسم  
فروشی سے ہوتی ہے۔ میری بیمار ماں کے لئے قیمتی دوائیں، گھر کے اخراجات، بہنوں کی  
ضرورتیں، سب اسی سے چلتا ہے۔۔۔“

شوکت اپنا سر ہاتھوں سے تھام کر جھک گیا۔ وہ بھی کوئی فرشتہ نہیں تھا۔ کالج، محلے میں وہ  
بھی چھوٹی موٹی منہ ماریاں کرتا رہا مگر شرم، پردہ، حیا بھی کوئی چیز ہے۔ اس قسم کی بے باک  
لڑکی اور ایسی صورت حال سے کبھی اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا، وہ واقعی کچھ گھبرا گیا تھا۔۔۔  
سامنے میدان میں کچھ بچے فٹ بال کھیلنے آ گئے تھے۔ وہ اپنے خیالات کے دھارے کا رخ

بدلنے کے لئے ان کا کھیل دیکھنے لگا اور نگہبند آ نکھیں بند کئے، پیچھے ٹیک لگائے کسی اور ہی جہاں میں پہنچی ہوئی تھی۔ شوکت سوچنے لگا کہ جو کچھ اس نے کتنا کرنا اور دکھانا تھا وہ دکھا چکی ہے۔ نش پانی بھی کر لیا ہے۔ اب سکون لے رہی ہے، چپکے سے کھسک لو۔ وہ اسے گہری نظروں سے تولتے ہوئے اٹھنے ہی والا تھا کہ بند آنکھیں بند ہونٹ پہلے اور بڑبڑانے کے انداز میں وہ بولی۔ ”مجھے چارہ گر اور ساتھی کی ضرورت ہے، ناصح کی نہیں۔“

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے مسائل کا کوئی شرفانہ حل ہے۔؟“

”نہیں۔۔۔“ وہ جیسے قطعیت سے بولی۔ ”میں جس ریڈی میڈ ملبوسات کی فیکٹری میں کام کرتی تھی وہاں کپڑے بناؤ، نہ بناؤ مگر سر جھکانا ضروری تھا لہذا انکار کی صورت میں فارغ کر دی گئی۔ انارکلی میں خواتین کے لئے مخصوص بازار میں ایک سٹور پہ نوکری ملی تو سفید واڑھی والے حاجی صاحب نے پرائیویٹ شادی کی دعوت دے ڈالی۔ ایک پرائیویٹ کلینک میں جاب ملی تو ایک ڈاکٹر صاحب میرے ہی مریض بن گئے۔ کس کو بتاؤں کہ ماموں کی بیماری اور پھر تجیز وہ تکلیف پہ اٹھنے والے اخراجات کہاں سے پورے ہونے، کہاں سے آئے۔ سنو! وہ مالک مکان نے دیئے تھے جو نیچے کی منزل میں رہتا ہے۔ کیا بتاؤں کہ رات ہسپتال میں گزارنے کے بہانے، میں کہاں ہوتی تھی، ماموں کے انتقال کے وقت بھی میں اسی ”محسن“ کے پاس تھی۔ میں نے اسے کہا بھی کہ مجھے آج جلد فارغ کر دو، میرے ماموں کی حالت بہت نازک ہے مگر جانتے ہو کہ اس نے کیا جواب دیا؟۔۔۔ اس نے کہا کہ میری بھی حالت بہت نازک ہے۔ صبح اس نے میرے ہاتھ پہ پانچ سو روپے دھرے، میں بھاگی بھاگی ہسپتال آئی تو میرے ماموں کی لاش مردہ خانے میں دھری تھی۔۔۔“ وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولی۔ ”پہلے دن جس پانچ سو روپے کے نوٹ کے لئے تم سے چھینچ مانگا تھا وہ نوٹ بھی اسی کی عطا تھا، اس وقت میں اس کے پہلو سے اٹھ کر آئی تھی۔۔۔ میں اپنے کئی ہمدردوں کے پاس بھی گئی مگر انہوں نے بھی منہ موڑ لیا۔۔۔“ پھر جیسے وہ کسی کنویں سے بولی۔ ”اب تو میری بوڑھی بیمار ماں بھی میرا ذریعہ معاش جانتی ہے۔۔۔ ماں ہے نا۔۔۔ اس مجبور اور بے بس نے اپنے ہونٹ سی لئے ہوئے ہیں، ایک لفظ تک نہیں کہتی۔ شائد وہ میرے ہی انداز سے سوچتی ہے کہ جن عورتوں کے سر پہ خاوند نہ ہو، بہنوں کا بھائی نہ ہو انہیں مرجانا چاہئے یا پھر زندہ سلامت رہنے کے لئے ضمیر کو مردہ آنکھیں بند اور کان بہرے کر لینے چاہئیں۔۔۔“

اس نے پرس سے پیکٹ نکالا، سگریٹ سلگاتے ہوئے پھر گویا ہوئی۔ ”۔۔۔ اور سنو! آج بھی میں اسی چکر میں مل روڑ پہ آئی تھی۔ عورتوں کا جلوس دیکھا تو شامل ہو گئی اور اچانک تم

دکھائی دیئے۔۔۔ دوست! آج جیب خالی ہے۔ مالک مکان کرایہ مانگ رہا ہے۔ خیر! اس سے تو میں بٹ لوں گی مگر ماں کی دوائیں، گیس اور بجلی کے بل۔۔۔ چلو، ساتھی بنو۔ کچھ دو، کچھ لو۔ سیدھے ہاتھ کا سودا۔۔۔“

اچانک بولتے بولتے وہ رکی اور ذرا خاموشی کے بعد اپنا پرس بچ پڑا لٹتے ہوئے دکھانے لگی۔ ”دیکھو۔۔۔ یہ بجلی، گیس اور پانی کے بل۔۔۔ یہ دیکھو، میرے ماموں کی تصویر۔۔۔ یہ میرے ذلیل منگتیر کی تصویر۔۔۔ یہ میری پرائیویٹ ڈائری جس میں میرے گاہکوں کے ٹیلی فون نمبر کوڈز میں لکھے ہیں۔۔۔ یہ شیشی، یہ خالص گولیاں۔۔۔“ پھر اپنا جوتا اتارا۔ ”یہ ہیروئن کی پڑیاں۔۔۔ یہ میرے ”ساتھی“ ہیں، ”ہمد“ ہیں۔۔۔“ وہ رونے لگی۔ ”دیکھ چکے ہو سب کچھ، اب سینے کا پرس کیسے الٹوں۔ تمہیں وہ سب کچھ کیسے دکھاؤں۔۔۔ جو کچھ اندر ہے وہ نہ دیکھو تو بہتر ہے۔۔۔“ پھر وہ یکبارگی سب کچھ الٹا سیدھا پرس میں ٹھونسنے لگی اور بولی۔ ”اٹھو۔۔۔ چائے پلاؤ، سر پھٹنے لگا ہے۔“

چائے کے دوران دونوں جانب سکوت اور سکون رہا۔ جیسے کھل کر مینہ برسنے کے بعد پراسرار سی کیفیت اور خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔

وہ اٹھتے ہوئے بولی اور شوکت تو جیسے حوط کیا ہوا پتلا بن گیا تھا، خاموشی سے ساتھ چل دیا۔ ریس کورس پارک میں گھومتے وہ جھیل کے پیچھے ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ نگہبند نے اپنی اور ناچس نکالی۔ شوکت پہلے ہی پراسرار خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے بعد وہ فارغ ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں وہی کیفیت پیدا ہو گئی، پھر یکبارگی اس نے شوکت کا ہاتھ تھام لیا۔ ”مجھے ہر حال میں کچھ معقول سی رقم چاہئے۔۔۔“

وہ اس کی گردن سہلانے لگی اور شوکت نے اپنا پرس نکال کر اس کی گود میں رکھ دیا۔ ”جو موجود ہے، حاضر ہے۔ اپنی ضرورت کے مطابق نکال لو۔ اگر یہ کم ہے تو کل جہاں کو گی، پہنچا دوں گا۔۔۔“

نگہبند نے چند لمحے اسے گھورا، پھر پرس کھولا اور ایک ہزار روپے علیحدہ کر لئے۔ ”سب رکھ لو، کام آئیں گے۔۔۔“ وہ مسلسل اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔ کوئی جواب دینے کے بجائے نگہبند نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگانا چاہا۔ شوکت نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اس کا دایاں آزاد ہاتھ پوری قوت سے نگہبند کے بائیں گل سے ٹکرایا، مبین سی جج ابھری، اگلے ہی لمحے شوکت جاچکا تھا۔

ذرا دبا کر ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے تین ادباز جو شاید انہی کی تاک اور تاڑ میں

کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے، پلک جھپکتے ہی نگہت کے پاس پہنچ گئے۔ نشے کی ترنگ اور بھرپور مردانہ تھپڑ سے حواس باختہ وہ اوبھ موٹی سی پڑی تھی۔ بڑا، پرس اور اس پاپ گھڑی کو ڈنڈاؤلی کرتے ہوئے وہ ٹیلے کی دوسری جانب، پرانے ٹیوب ویل کی شکستہ کوٹھڑی میں اتر گئے۔ اس قسم کے اوباش لفٹنگے اکثر ایسی تفریح گاہوں اور سیرپائے کی جگہوں پہ ”نوداردان محبت“ اور نئے نئے شادی شدہ جوڑوں کی کھوج میں چھپے ہوتے ہیں، موقع پاتے ہی یہ انہیں دبوچ لیتے ہیں اور ڈرا دھمکا، تھانہ پولیس، عزت بے عزتی، ہر حربہ استعمال کر کے لوٹ لیتے ہیں۔ گھڑیاں، زیور، کپڑے تک اتار کر روفو چکر ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اکیلی دو کیلی کی عزت خراب کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

نگہت کا پالا بھی ایسے ہی درندوں سے پڑا تھا۔ نشے میں تو وہ پہلے ہی بے دم تھی، اچانک تھپڑ نے اسے مزید بے جان سا کر دیا ہوا تھا۔ وہ اپنی مدافعت کیا کرتی اور کچھ زور تو پلے تھا نہیں جو لٹا بیٹھتی۔ شوکت کا پرس جو وہ وہاں چھوڑ گیا تھا، اس پہ لٹیروں نے قبضہ کیا۔ اس کے اپنے پرس میں سے جو کچھ برآمد ہوا، وہ اس کی شناخت کے لئے کافی تھا۔ وہ جان گئے کہ یہ ہیروئن کی عادی اور جسم بیچنے والی لڑکی ہے جبکہ وہ خود بھی منشیات کے عادی تھے۔ پہلے تو خود انہوں نے موج میلہ کیا پھر کئی اور بھی ان جیسے شامل ہو گئے۔ منشیات کے انجکشن، سگریٹ، شراب، خود بھی اور اسے بھی زبردستی استعمال کراتے رہے۔ ایک لڑکی، کئی درندے اور ساری رات۔۔۔ کوئی جا رہا ہے، کوئی آ رہا ہے۔ جو شراب پی رہا ہے، اس کے حلق میں بھی زبردستی انڈیل رہا ہے۔ جو انجکشن لے رہا ہے، اسے بھی ٹھونک رہا ہے۔ رات شرمندہ سی، نچل سی تاریکی سے اپنا منہ ڈھانپنے کن آنکھیوں سے وحشت، شیطنت اور بربریت سے بھرپور یہ دل خراش تماشا دیکھتے دیکھتے کہیں سو، مر گئی اور صبح کا اجالا آنکھیں ملتے ملتے بیدار ہوا۔ ٹیوب ویل کی ناکارہ مشینری کے پاس نگہت کا ادھڑا ہوا وجود بکھرا پڑا تھا۔ انجکشنوں کی سرنگیں، خالی بوتلیں، سگریٹوں کے ٹوٹے اور انسانی غلاظت کا ڈھیر رات گئی، بات گئی کی داستان بنا رہا تھا۔ الگ تھلگ جگہ تھی، سیر تفریح کرنے والے ادھر کارخ نہیں کرتے تھے۔ دوپہر تک وہیں کروٹ لئے بغیر بے سدھ، بے جان پڑی رہی۔ کہیں سے بدبو سوگھتے ایک مرہل سی کتیا اندر آگئی اور اس کا غلاظت سے نشتر ہوا پنڈا چاٹنے لگی۔

ہلکی سی حرکت ہوئی، سوچی ہوئی سرخ انگارہ آنکھیں پل کی پل کھلیں اور پھر بند ہو گئیں۔ حواس کہیں بیدار ہو چکے تھے، آہ کرتے ہوئے کروٹ بدلی، کتیا نہ جانے کیا ہوج کر ہلکا سا بھونکی۔ اب نگہت بھی ہلکا سا سنبھالا لے چکی تھی، کراہتے ہوئے اٹھی، دونوں ہتھیلیوں سے

سر تھامے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگی۔ سورج سر پہ آگیا تھا، دھندلی دھندلی سی یادداشت صاف ہونے لگی۔ اچانک کوندالپکا اور بیمار یاد آگئی جس کی دوا کا بندوبست کرنے وہ گھر سے نکلی تھی، بہنیں یاد آئیں تو آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ شوکت یاد آگیا، گزرے ہوئے لمحے پل پل ابھرتے چلے گئے۔ دھندلے دھندلے کمروہ چہرے۔۔۔ اٹھنے کی کوشش میں پیٹ نیچے ایسی نہیں اٹھی کہ دوہری ہو کر پانی کی مردہ بیکار موٹر پر گر پڑی۔ پھر ہوش اس وقت آیا جب سورج آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکا تھا۔ کپڑے درست کئے، باہر نکلی، جھیل کے پانی سے ہاتھ منہ پاؤں دھوئے، بال ٹھکانے کئے۔ نیم غنودگی کے عالم میں ہچکولے کھاتی ہوئی سڑک کے کنارے کھڑی تھی جدھر سے اسے ٹیکسی ڈرائیور استاد قریان نے اٹھایا تھا۔

☆☆☆

یوں سمجھئے، مس عاشی نے نگہت کو حکیم جمالی اینڈ پارٹی سے کونوں کے مول خریدا تھا، یعنی صرف بیس ہزار۔۔۔ مس عاشی اس سے زیادہ قیمت بھی دے سکتی تھی اگر یہ صاف رنگت اور خوبصورت سے خدوخال کی حامل ہوتی، جوان اور تندرست ضرور تھی مگر چہرہ مہرہ جاذب نظر نہ تھا۔ الزماریوں جیسی نزاکت اور زیبائی نہیں تھی۔ ناک کے نیچے مونچھیں ہوں اور سر کے بال ترشوائے جائیں تو بالکل لڑکا لگے۔ پھر بھی اسے امید اور اندازہ تھا کہ ٹھیک ٹھاک کر کے ستر، اسی ہزار میں کہیں نہ کہیں لونڈیا نکال دے گی یا اس کا ناک نقشہ درست کر کے اپنی چنڈال چوکر می کاہرہ بنا لے گی۔

نگہت جب سے یہاں لائی گئی، مسلسل غنودگی اور بے حسی کے عالم میں تھی۔ حکیم جمالی نے مس عاشی کے ساتھ روانہ کرتے وقت احتیاطاً اسے ایک انجکشن لگا دیا تھا اور ایک خاص دوا بھی ترکیب استعمال کے ساتھ سمجھا کر دی تھی اور بتا دیا تھا کہ اس کے استعمال سے انسان بظاہر ٹھیک ٹھاک نارمل نظر آتا ہے، کھاتا پیتا اور سوتا جاتا ہے مگر کوئی فیصلہ کرنے، ماضی حال مستقبل کے بارے میں سوچنے جاننے یا کوئی رائے قائم کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتا ہے، انتہائی ڈرا ڈرا اور بزدل رہتا ہے۔ مہربانی، شفقت اور دم دلا سے خوش۔۔۔ یعنی وہ رپوٹ بن کر اپنے ماسٹر کا مطیع رہتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ اس دوا کا عادی ہو جاتا ہے اور دوا نہ ملنے پہ اس کی طبیعت بھاری ہو کر جی متلانے اور دم گھٹنے لگتا ہے۔ مس عاشی نے یہ دوا لے تو لی مگر ابھی اس کا استعمال کرنا مناسب نہ سمجھا۔ جیسی بھی تھی، تھی تو عورت ذات! اس کے پتھر دل میں ابھی تک کہیں نہ کہیں اپنی جنس کے لئے کوئی نرم گوشہ ضرور موجود تھا۔ وہ نگہت کے ٹوٹے ہوئے حواس میں آنے کا انتظار کر رہی تھی اور اس کا رد عمل جاننا چاہتی تھی۔ اس کا بیک

آہستہ آہستہ جیسے دھند صاف ہوتی جا رہی تھی۔ تیکے پہ سر ڈال کر اس نے پھر آنکھیں بندھ لیں مگر یادداشت کی الجھی گرہیں جیسے دھیرے دھیرے کھل رہی تھیں۔ شوکت چہرہ ماں، بن، دوایتیں، بل۔ لارنس گارڈن، ریس کورس پارک۔ خوفناک رے۔ رات بھر کی اذیت، قہقہے، چیخیں، کتیا۔ ایک ایک منظر، ایک ایک سلائیڈ کھٹ کھٹ مرنے لگی۔ ٹیکسی، کھٹ سے دروازے کا بند ہونا اور پھر۔ پھر یادداشت کا بند۔ حکیم جمالی کا دفتر، وہی بھیانک چہرے، وہی اذیت۔ پھر یادداشت بند۔ سوچتے دیتے وہ پھر سو گئی یا نہ حال ہو گئی۔

آنکھ کھلی تو وہ پلنگ اور کمرے میں اکیلی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پہ کھانے پینے کا سامان ڈھکا پڑا، ہلکا سا میوزک چل رہا تھا۔ شاید شام کا وقت تھا، کھڑکیوں پہ پردے پڑے ہوئے تھے۔ ہلکی لی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ پیاسی محسوس ہوئی، تازہ مالتوں کا رس، جگ میں پڑا تھا۔ کانپتے نھوں سے گلاس بھرا، ہونٹوں سے لگایا۔ سگریٹ کے پیکٹ پہ نظر پڑی تو جسم میں اینٹھن سی نے لگی، یاد آیا کہ کئی روز سے سگریٹ نہیں پیا۔ پھر وہی کش لئے تھے کہ سر جکڑنے لگا۔ اسگریٹ الٹش رے میں مسل دیا اور تھپی بغیر کسی آہٹ کے مس عاشی داخل ہوئی۔

”ماشاء اللہ۔۔۔!“ وہ اسے سگریٹ بچھاتے ہوئے دیکھ کر بولی۔ ”بے بی! اب طبیعت یہی ہے۔۔۔ انٹر کام پڑا ہے، مجھے بلالیا ہوتا۔۔۔“

”شکریہ، باجی!۔۔۔ مجھے ہاتھ روم جانا ہے۔۔۔“

وہ اسے سہارا دیتے ہوئے ہاتھ روم تک لائی۔

”اچھی طرح شاور کرلو۔ شمو، ہاتھ آئل، ہاتھ بیل، سوپ، ہر چیز انڈر موجود ہے۔“ اتنی دیر میں تمہارے کپڑے لاتی ہوں۔۔۔ فریش ہو جاؤ، پھر اکٹھے مل کر کھانا کھائیں۔۔۔“

انتاشا اندر ہاتھ روم؟۔۔۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ ہر چیز دیکھ رہی تھی۔ ہنس کے پروں جیسا یہ ہاتھ شپ، سنہری ٹوئیں، شاور، میچنگ ٹوائلٹ سیٹ۔ اسی رنگ کے ٹوائلٹ پیپر رول، وٹس بڑے خوشبودار توبلیے، مختلف پروڈیوم، نئے پیک تو تھ برش، ٹوتھ پیسٹ۔۔۔ وہ ایک چیز کو چھوتی، دیکھتی رہی خوبصورت شیشے کا کینٹ۔ شیشے میں اپنا حلیہ دیکھا تو احساس ہوا کہ کتنی بدل گئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے، ستاسا سا چہرہ، اجڑے اجڑے بال۔۔۔ پھر جونہی ہنٹ کھولی تو حیران رہ گئی۔ امریکن، انگلش، فرنج رسالے ایسے کہ دیکھتے ہوئے نظروں کو نہ آجائے۔ دیکھتے دیکھتے اچانک کوئی بند کرہ کھلی اور وہ سوچنے لگی کہ وہ کن لوگوں میں

گراؤنڈ، اچھائی برائی، خیالات حالات، کچھ بھی تو وہ نہیں جانتی تھی اور نہ ہی حکیم جمالی استاد قریان ٹیکسی والا کچھ جانتے تھے۔ رہائش، پتہ، ماں، باپ، نام اور نہ ہی اس کے پاس ڈائری، شناختی کارڈ تھا۔ پرس تھا مگر خالی۔۔۔ تین روز سے وہ دفتری اوقات کے علاوہ اس پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی۔ سوپ، جوس، دلیا، اپنے ہاتھوں سے اس کے حلق میں ڈال ایسی بے ہوشی اور گہری نیند؟۔۔۔ جب کبھی آنکھیں کھولتی بھی تو یوں لگتا جیسے کسی نا خوفناک ہستی کو دیکھ رہی ہو۔ وہ گہرائے ہوئے انداز میں پھر آنکھیں بند کر لیتی، جھنجھوڑ جگانے سے فقط، ”ہوں“ ہاں، ”تک ہی رہتی۔ کروٹید لوانے پہ وہ سخت اذیت کا اظہار کر لباس تبدیل رواتے وقت مس عاشی نے اس کے جسم کی حالت دیکھ لی تھی، جنسی تشدد واضح نشان موجود تھے۔ حکیم جمالی نے بتا دیا تھا کہ اس کے پاس پہنچنے سے پیشتر یہ لڑکی بہت مردوں سے خراب ہو چکی تھی لیکن اسے یہ بتانے کی چنداں ضرورت پیش نہ آئی کہ یہ اسے کے ڈیرے پہ کتنے درندوں کی درندگی کا نشانہ بنی تھی۔

مس عاشی کے لئے یہ سب کچھ روزمرہ کا معمول تھا، ان درندوں اور اس لومڑی صرف جنس کا فرق تھا۔ یہ ایک ہی ہوس ناک، خون آشام جرائم پیشہ درندوں کا گروہ تھا۔ کوئی بھی کرے، کھائیں گے سب اکٹھے اور ان کی بقا اسی اصول پہ کاربند رہنے میں تھی۔۔۔ دوپہر سے ذرا پہلے، نگہت نے ہلکی سی حرکت کی، چھوٹی سی انگڑائی توڑی اور آٹا پشٹائیں۔ مس عاشی نے جھٹ سے اسے گود میں بھر لیا اور پوٹے پوٹے ہاتھوں اسے دبائے لگی، گیلے تولے سے اسے کر گردن، چہرہ، سینہ صاف کیا۔ کمر کے پیچھے تیکے جھا کر اسے اور مسکراتے ہوئے چچے چچے مرغ کی نیم گرم یخنی اس کے حلق میں ٹپکانے لگی۔ پندرہ منٹ بعد نگہت قدرے عالم ہوش میں آئی، گونقاہت اور غنودگی ابھی نہیں ٹوٹی تھی۔۔۔ ماحول، انجانی صورت۔ وہ اجنبی نظروں سے مس عاشی اور کمرے کے درو دیوار دیکھ رہی مس عاشی کمال محبت اور شفقت سے مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”طبیعت کیسی ہے۔۔۔“ سوچے ہوئے کئے پھٹے ہونٹوں پہ کپکپاہٹ سی پیدا ہوئی، ہمیں سی ڈوبی ہوئی آواز ”جی۔۔۔ میں کہاں ہوں۔۔۔“ پھر عاشی کی جانب اجنبی نظروں سے تکتے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہیں۔۔۔؟“

مس عاشی نے بڑھ کر اس کی پیشانی کو بوسہ لیا اور شہد بھری مٹھاس سے بولی۔ ”نہی گھر میں ہو اور میں تمہاری بڑی بہن ہوں۔۔۔ زیادہ نہ بولو، میری جان! نہ ذہن پہ زہ ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔“

ڈیک کو آن کر کے، اس کا منہ چوم کر وہ چلی گئی اور نگہت کو پکارتیں ہو گیا کہ یہ عورت  
یانی کلاس کی سلاڑ ہے گردوا۔ عجب سی دوا تھی جو خلق سے نیچے اترتی ہی آسمان کی  
دول پہ لے گئی۔ بلوں سے بھی اوپر، کبوتر کی بغل کی نرم روئیں سے بھی ہلکی وہ نیلگوں  
ن کی دسعتوں میں کہیں اڑی جا رہی تھی۔ عجب سی کیفیت تھی جو احاطہ اور اک سے ماورا  
— اس کا اپنا دل تو شائد دل ہی نہیں تھا، پتھر بھی نہیں تھا جو کچھ محسوس کر سکے اور تواب  
مقام سے بہت آگے نکل چکی تھی۔ خوف و ہراس، پریشانی، گھبراہٹ، عزت بے عزتی،  
ادحیا، احساس سودوزیاں اور ماضی، حال، مستقبل، سب کچھ بہت پیچھے رہ گیا تھا اور اگر تھی  
رف ایک چھین، کک جو آہنی یا کانٹے کی نوک ٹوٹ جانے سے محسوس ہوتی ہے۔ دو چھوٹی  
اور پیار بے آسرا مل! ان کا کیا ہو گا، کون انہیں سنبھال دے گا۔ اب وہ زمانے، وقت  
علاقت کی تندو سرکش آبشار میں ٹوٹی ہوئی ٹہنی کی مانند تھی جس کی منزل کا اختیار، اس کے  
میں نہیں ہوتا۔ اب بہاؤ کی لپٹ جھپٹ نے اسے ایک دلدل میں لاپیٹھا کھا اور بھانگی سے  
کر پنجرے میں پھنس جائے تو پرندے کے لئے کیا فرق پڑتا ہے۔ اب یہاں اسے اس  
ت کا دار اک بھی ہو چکا تھا کہ جو کچھ وہ باہر بے قاعدگی سے کرتی رہی ہے، یہاں اسے وہ  
کچھ اب باقاعدگی سے کرنا پڑے گا جس کے لئے وہ ذہنی طور پر تیار تھی۔

مس عاشی کو سمجھنے میں اس نے غلطی نہیں کی تھی، جاننے کے لئے اگر کچھ باقی تھا تو وہ یہ  
وہ کس جگہ ہے۔ کسی کوٹھے پہ ہے یا شریفوں کی کُسی بستی میں، مس عاشی کون ہے۔  
ف، کل گرل، بروہ فروش یا ڈیرہ دار؟ — مس عاشی سے اپنا نام دریافت کرنا اس کی  
نت کی کمزوری نہیں تھی، اس کی مصلحت کا حصہ تھا۔ وہ صحیح سلامت سامنے آکر اس  
جان نہیں چھڑا سکتی تھی۔ وہ اس کا اعتماد حاصل کر کے کوئی راستہ نکال سکتی تھی، مقابلہ  
لے نہیں۔ کاش! وہ اپنی ماں اور بہنوں سے اگر مل نہیں سکتی تو کسی طرح کچھ رقم بھجوا  
— دوا کا اثر، کمزوری، الجھے ہوئے خیالات — ترس کھا کر نیند کی مہربان دیوی نے اس  
بے نرم نرم پر پھیلا دیے۔

عالم ظہوری شاہ سے مس عاشی اکثر کاروباری معاملات یا کسی الجھن پریشانی میں مشورہ لیا  
تھی جبکہ وہ اسے حمام میں سب سے زیادہ ننگا اور گندہ تھا۔ اس کے باوجود وہ اور بہت سے  
والے اس کی روحانی علیقت، تجربے، پامسٹری، زانچہ سازی اور پیش گوئیوں کے معترف  
لہ جمل وہ اس کے صاحب مشوروں سے بہت سے پیش آنے والے مصائب سے بچ نکل  
نیں بے شمار فوائد بھی حاصل کر چکی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ عامل ظہوری کے قبضے میں

پھنس گئی ہے، یہ باجی کون ہے، اس کا کیا پیشہ ہے؟ اتنی خاطر مدارت، ہمدردی، یہ  
شوکت — آہستہ آہستہ سب گرہیں کھلتی گئیں۔ وہ جان گئی کہ وہ کس قماش کے لوگوں  
پھنس چکی ہے۔ اس وقت وہ کہاں ہے، کس جگہ ہے، یہ لوگ اس سے کیا چاہتے ہیں  
اسے کیا کرنا چاہتے؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ غلت میں اس نے فیصلہ کر  
وہ ہر ممکن ان سے تعاون کرے گی، تاوقتیکہ وہ ان کے بارے میں سب کچھ جان نہ لے۔  
عاشی نے اسے بڑے خوبصورت کپڑے پہنائے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے بل سناوا  
میک اپ کیا اور جدید کہ اپنے ہاتھوں سے جوتے تک پہنائے۔ پھر ڈائمنڈ ٹیبل پہ دو نور  
کھانا کھا رہی تھیں۔ بریانی، قورمہ، شامی، کباب، سلاڈ، رائتہ، مس عاشی اصرار کر کے  
ہاتھوں سے چھوٹے چھوٹے لقمے کھلا رہی تھی اور ساتھ ساتھ پیار بھری نظروں سے  
ہوئے اس کی بلائیں بھی لیتی جا رہی تھی۔

”باجی! برانہ مائیں تو ایک بات پوچھوں —؟“ نگہت نے جیسے ڈرتے ڈرتے سوال  
”بسم اللہ، ہزار سوال پوچھو۔ جو جی میں آئے، بلا تکلف پوچھو۔“  
”باجی! — آپ میری باجی ہیں نا۔؟“ اس کے سوال میں بلا کی معصومیت او  
ساخنگی تھی۔

”میری بنو! اس میں تمہیں کوئی شک نظر آتا ہے — میں تمہاری بڑی آپا اور تم  
پیاری سی، چاند سی چھوٹی بہنا ہو۔“

”باجی! میرا نام کیا ہے، مجھے کچھ یاد ہی نہیں آرہا۔“  
مس عاشی اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری یادداشت ایک حادثے میں  
چکی ہے اس لئے تمہیں اپنا نام یاد نہیں، بہت جلد تم ٹھیک ہو جاؤ گی اور پھر تمہیں سب  
آجائے گا۔ تمہارا پیارا نام شمسہ ہے اور میرا نام باجی عاشی ہے۔“

مس عاشی گھبرا سی گئی تھی، اس کے اچانک اس سوال کے جواب کے لئے وہ تیار  
تھی۔ ایک چھوٹا سا خدشہ بھی اس کے دل میں جڑ پکڑ کر بیٹھ گیا کہ کہیں اس کی یادداشت  
نہ آجائے؟ اس کا پیشہ ہی ایسا تھا کہ خدشات پیدا ہی نہیں ہونے دیا جاتا تھا، ہر ممکنہ خد  
سرکوبی کے لئے کئی کئی حل موجود ہوتے ہیں — کھانے کے بعد اس نے حکیم جمالی کی  
دوا کی ایک خوراک اسے پلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ دوا پی کر کچھ دیر آرام کرو، آرام تمہارے  
بہت ضروری ہے۔ میں ہلکا سا میوزک لگا کر دروازہ باہر سے بند کر دیتی ہوں تاکہ تمہیں کو  
آرام نہ کرے۔ کوئی ضرورت ہو تو انٹر کام پہ بتا دیتا۔“

کے پیچھے چوڑے چوڑے سپید دانت، قدرتی سرمئی غلابی آنکھیں، چہرے پہ نفیس تراشی ہوئی باہ داڑھی، سر سے کندھے تک لہراتی ہوئی عنبریں زلفیں، آنکھیں بولتا جادو، زبان و بیاں کا تلا گور کھنک دار پُر اثر لہجہ۔ دسویں فیل، منڈی بہاؤ الدین کے نواح کا رہنے والا، ذات کا لہا باپ سے تعویذ گنڈے، نقش باندھنے سیکھے۔ قرآن شریف، تسبیح دانے سے قال لینا لہجہ، پھر لوٹے گھانے اور انگوٹھے پہ موکلات حاضر کرنے لگا۔

اس کے والد بھی چوکی حال کھلاتے اور جن پریت نکالتے تھے۔ قریب کے گاؤں کی ایک اس سال خوبصورت لڑکی کے عاشق جن سے ہاتھ پائی ہو گئی۔ جن بڑا اڑیل، زبردست قسم کا تھا رعاع صاحب بھی کچھ کم نہ تھے۔ اگر جب گدی سے بال پکڑ کر سرخ مچوڑ اور کالے تے زہر ملا دھواں نیتھوں میں چڑھایا تو جن کو کھانستے اور بھاگتے ہی بنی لیکن جاتے جاتے بطور انی لڑکی کی منڈی مڑو گیا۔ جن نکالنا ان کا کام، جان نکالنا عزرائیل کا کام تو عامل کا کیا مور؟ گمران کی یہ دلیل مرنے والی کے بھائی جو فوج میں ملازم تھا، کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ ایک ات چیکے سے ان کے حجرے میں داخل ہوا اور اٹے ہاتھ کے ایک بھرپور بے آواز وار نے میں زندگی سے بے دخل کر دیا۔ گو یہ واردات بھی اس کینہ توڑ کینے جن کے انتقامی کھاتے با ڈال دی گئی لیکن کسی نہ کسی طرح ظہور علی المعروف ظہوری شاہ کو معلوم ہو گیا کہ اس کے پ کو لڑکی کے بھائی نے قتل کیا ہے۔ اس نے داویلا کیا، تھانے جانے کا ارادہ کیا۔ ایک رات ی بھائی اس کے پاس آیا، اس کو پکڑ کر زمین پہ او نہا کیا اور گردن پہ بھاری پاؤں رکھتے ہوئے لا۔

”تمہارے باپ نے میری بہن کو تشدد سے ہلاک کیا تھا لیکن میں نے تمہارے مردود باپ دانے پیار سے جنم واصل کیا کہ اسے مرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ جان کے بدلے جان، ملے میں نے اپنے اصولوں کے مطابق کر دیا ہے۔ اب میں نے سنا ہے، تم تھانے کچہری کی مکی دے رہے ہو۔ چاہوں تو ابھی تمہارا حشر بھی باپ جیسا کر سکتا ہوں۔ تم بے وقوف اور بے قصور ہو، تمہاری جوانی اور نالائی پر رحم آتا ہے۔ زبان، طبیعت اور جذبات پہ کنٹرول رو۔ اسی وقت، ابھی گاؤں چھوڑ کر کہیں دور شکل گم کرلو، آج کے بعد تمہاری زبان کھلی یا ل نظر آئی تو منڈی مڑو دوں گا۔“

اپنی جان بچا کر اسی رات وہ خاموشی سے اپنے باپ کے ایک پیر بھائی کے پاس کراچی نکل بیٹھ یہ حضرت بھی تعویذ گنڈوں اور جن بھوتوں کا کاروبار کرتے تھے۔ منگھو پیر مزار کے قریب ب مسجد میں پیش امام بھی تھے۔ مرنجان مرنج سے عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ سارا حال ان کے

جنات ہیں۔ ہزار، موکلات، محاضرات ہاتھ باندھے اس کے حکم کے منتظر رہتے ہیں۔ صبح دس بجے کے قریب اس نے عامل ظہوری سے ٹیلی فون پہ رابطہ کیا، تمام تفصیل کرتے ہوئے اس نئی لڑکی کے بارے میں مشورہ چاہا۔ ظہوری نے صاف صاف بتایا کہ یہ اس کے حق میں کچھ زیادہ سعد دکھائی نہیں دیتی البتہ کوشش، محنت کی جاسکتی ہے اور نفی چانس ہے۔ اخلاق اور پیار، ہمدردی سے اس کا دل جیتنے کی کوشش کرے، اس ضمن میں تفصیلاً بات کرنے کا بہانہ کر کے اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ یہ حرفوں کا پتلا، دراصل اپنی و حرص کے ستاروں کی چال ٹھوک رہا تھا۔ حکیم جمالی کے ڈیرے پر اجتماعی زیادتی کے موقع پہ بہتی لڑکیاں اس نے بھی اپنے گندے ہاتھ پوتر کئے تھے۔ چور، چوری سے جا مگر ہیرا پھیری سے نہیں اور یہ نجوی اور ہاتھ ریکھا دیکھنے والے بھی ایسے ہی ہوتے گدھی اور کتیا بھی سامنے آجائے تو اس کے کھر ریکھا، دم تھو تھن اور نسل زردھ کی چتا کریں گے۔ سعد، نحس ضرور نکالیں گے۔ بدکاری کے اس جلسے میں، اس بدکار مکار حسب عادت، بیہوش و بے دم شمسہ کے ماتھے اور پاؤں کے تلووں پہ پڑی تھی۔ کد نسل کی یہ لڑکی ایک لمبے عرصے کے بعد اسے دکھائی دی تھی۔ ایسی نسل اور ستارے کی بڑی سعد اور بھاگوان ہوتی ہے اور جو اپرا دھی اس سے انیائے کرے اس کانت بھرشت ہے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ سب سے کہے کہ اسے چھوڑ دو، اس کا اچھا نہ کرو ورنہ جاؤ گے۔ یہ تم سب کو لے ڈوبے گی مگر وہاں کون سنتا تھا۔ شیطان اور شراب سرچڑھے بربادی کا باعث بنے بغیر نہیں ملتے۔ اس نے خود بھی پچھتا چاہا مگر چاریاری اور شراب نے باری میں نہ چاہتے ہوئے بھی بھیک گیا۔ اس کا مکروہ علم اسے تیار ہاتھ کہ یہ لڑکی جس سما گی، اسے ”کشمی رام“ بنا دے گی۔ اس کے دل میں تھی کہ وہ ہر صورت اس لڑکی عاشی سے حاصل کرے گا۔ وہ چانس پہ تھا، ایسے حالات پیدا کرنا چاہتا تھا کہ عاشی خود ہی اس کے حوالے کر دے۔ اسے یقین تھا کہ مس عاشی اس کے سلسلے میں اس سے ضرور لے گی اور اس نے آج اسے نحس بتا کر اپنے منصوبے کی پہلی منزل مار لی تھی۔ وہ اسے ستاروں کی چال، رخ بدلنے میں کمال مہارت حاصل تھی۔ اس کی زندہ مثال ار زندگی تھی۔ اس نے اپنا نام اور کام تبدیل کر لیا۔ ذات، پیشہ، شہر، شخصیت اور حلیہ تک کچھ بدل لیا۔ دو چار رازداروں کے علاوہ شاید ہی کوئی اس کے ماضی کے بارے میں ہو۔

آدھ انچ کم چھ فٹ قد، چھریا بدن، موٹی کھڑی گردن پہ مضبوط نمایاں جڑا، موٹے

رود بیان کیا، سرپرستی اور شاگردی کے لئے درخواست کی جو قبول ہو گئی۔ باپ کے ترکے پر چھوڑی ہوئی چیدہ چیدہ چند کتابیں، زاپٹوں کے نقشے، تعویذات کے قلمی نسخے، سوالکھ تسبیح، سبز عمامہ وہ ساتھ لے کر آیا تھا۔ اگلے دو برس بڑی سعادت مندی، محنت اور ذوق و شوق۔ وہ علوم، خفی، نوری، سفلی سیکھتا رہا۔ عملیات، تخیرات، حاضرات، موکلات میں بھی خاصہ دراصل حاصل کر لیا۔ منگو پیر کی ویران پہاڑیوں میں چلے اور مجاہدے بھی کئے۔ اک حلقہ معتقدان پیدا ہو گیا تھا۔ بزرگ استاد نے بھی جی جاں سے اپنا سینہ اس پر کھول دیا تھا۔

وقت نے ایک کموٹ بدلی، وہاں لسانی فسادات شروع ہو گئے۔ اکاؤ کا قتل ہوئے تو پھر سلسلہ چل نکلا۔ مسجدیں، گوتھیں، علاقے، محلے، نسل، قومیت، زبان اور علاقائی تعصب۔ خانوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک بلوے میں اس کے استاد مارے گئے تو چند روز بعد یہ اپنا اور کا سب کچھ سمیٹ سمٹ کر لاہور آگیا اور یہاں جو پہنچتا ہے، داتا سرکارؒ سلام کے لئے ض حاضر ہوتا ہے۔ جن کا مسلک حاضر ہونے میں مانع ہوتا ہے، کبھی نہ کبھی ادھر سے گزر ہوئے وہ نہ سہی، لیکن ان کا دل اور جھکی ہوئی نگاہیں ضرور سلام کرتی ہیں۔ جس کے پا کھانے رہنے کا کوئی آسرا نہ ہو وہ داتا ہی کے مہمان ہوتے ہیں۔ داتا سرکارؒ بلا تخصیص تفریق، نسل و رنگ سب کی دلجوئی اور خاطر مدارت کرتے ہیں۔ ان کے دامن عافیت میں کشادگی ہے۔ اپنے قدموں میں حاضر ہونے والوں کا ماتھا چومتے ہیں اور یہ تو پانے والے ظرف اور نیت و عمل پر منحصر ہے کہ وہ کتنا فیض یاب ہوتا ہے۔ یہ بھی ناک کی سیدھ سرکارؒ کے قدموں میں حاضر ہو گیا۔ ایک آدھ روز لنگر، مسجد پر گزارہ کیا، آرام تلی کی پھر آیا تو ہر چیز بدلی سی نظر آئی۔ سامنے کامیدان اب پلازہ میں تبدیل ہو رہا تھا۔ بازار، دکان، ارد گرد بڑے بڑے ہوٹل، وہی گہما گہمی، دیگوں والے اور بھیک مانگنے والے، بھائی چوک وہی رونق، لوگوں کا جوم، ٹریفک۔۔۔ بھائی کے گندے نالے کے پاس ایک نمایاں بڑے بورڈ پر نظر پڑی، ایک نورانی صورت والے باریش بزرگ کی تصویر تھی۔ اسے اپنا باپ آگیا، وہ بھی جوانی میں ایسا ہی تھا۔ کافی دیر وہ کھڑا بورڈ کو دیکھتا رہا۔ بورڈ پر لکھے ہوئے فقرہ الفاظ تھے۔۔۔

”جادو شکن، عملیات کے ماہر۔ ایک ہی رات کے عمل سے بگڑے مسئلے سنوارنے و عوے دار، کالیا پلٹ۔ روٹھے ہوئے محبوب کو قدموں میں لایٹھانے والے بابا۔۔۔ پردہ! وہ اندر داخل ہوا، باہر کے بورڈ کی تصویر سے بہت ہی مختلف ایک خجل سی صورت والے، نہ سے بابا فرشی نشست پر تشریف فرما تھے۔ گولے کے ستاروں والی سبز چادر، سیاہ مخملی چہار

ٹوپی جس پر نفرتی تلے سے ”یا العلم الغیب“ کڑھا ہوا تھا۔ خضاب آلود واڑھی اور پال منجے سر کے گرد ایک جھار کی صورت میں تھے۔ اگر تپوں کے دھوئیں سے اندر کی فضا خاصی کدر اور ٹھنڈی رہی تھی۔ اتفاق سے عامل صاحب فارغ بیٹھے چائے نوش فرما رہے تھے۔

”آئیے آئیے، جھکے مت۔۔۔ آپ صبح جگہ پر تشریف لائے ہیں۔۔۔“ اس کے بیٹھے ہی وہ کپ میں چائے انڈیلنے لگے۔ ”لیجئے، گرم گرم چائے۔۔۔“

ظہوری بھی اسی دھندے میں تھا، عامل لوگوں کی ذومعنی باتوں کو سمجھتا تھا۔ اس نے مختصر سا اپنا تعارف کرایا، باہمی بات چیت شروع ہوئی تو شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتی چلی گئی۔ ظہوری کی اذان تک وہ اس طرح باہم شیر و شکر ہو چکے تھے جیسے مدت سے ان کے مابین رفاقت و شراکت کے تعلقات ہوں۔۔۔ وہ اب ان عامل صاحب کی معاونت اور مصاحبت میں آگیا تھا۔ یہاں اس نے وہ سب کچھ سیکھا، جانا جس سے وہ اب تک محروم رہا۔ چال ڈھال، گفتگو، نفیات، جب خالی کروانے کے حربے، زاپٹے تیار کرنا۔ آنے والے پہ اپنی بلا دستی قائم رکھنا۔ ذومعنی جواب دینا جس سے کامیابی، ناکامی دونوں کے مطلب نکلتے ہوں۔ جاہل بلربازوں سے بچنے کے ڈھنگ۔۔۔ اب شاید کچھ بھی باقی نہ رہا جس کو سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ استاد کی دعا، برکت اور اجازت سے یہ ملتان روڈ پہ ایک مارکیٹ کی پہلی منزل پہ دو کشادہ کمروں کے دفتر میں آگیا جس کے قریب ہی ایک پلازہ کے تیسرے فلور پر مس عاشی کا خوش نصیب میرج بیرو تھا، قریب ڈیڑھ کلومیٹر پرے حکیم جمالی کا دفتر بھی اسی سڑک پر تھا۔ گویا یہ سارے پٹے بڑے ایک ہی حلقہ زنجیر کے سلسلے تھے۔

ظہوری شاہ نے پہلے اپنے دفتر کو بڑے جدید انداز میں آراستہ کیا، روایتی غریب عالموں کے طور طریقوں سے ہٹ کر ایک پروقار سنجیدہ ساما حول پیدا کیا۔ جاذب نظر فرنیچر، قالین، ریشمی پردے، ویٹنگ روم، سیکرٹری، جدید انداز کا ٹیلی فون، فرشی نشست کے بجائے خوبصورت میز، کرسیاں، صوفے، سائیڈ ٹیبل، دفتر کے باہر اردو انگلش میں خوبصورت بورڈ۔۔۔ عامل ایم اے ظہوری شاہ محبوبی، ماہر فلکیات۔۔۔ یہ ظہور کا نیا روپ تھا۔ اس دفتر میں آکر وہ اپنے محس ستاروں کا رخ کامیابی اور خوش حالی کے برسوں کی جانب موڑ چکا تھا۔ دنیا جھکتی ہے، جھکانے والا چاہئے۔ دنیا آلو بنتی ہے، بنانے والا چاہئے۔ بڑے بڑے بیوقوف ابن بیوقوف، امحقوں کی جنت میں رہنے والے، جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والے، ایک رات میں امیر کبیر بننے والے، خوبصورت امیر لڑکیوں کو محبت کے جال میں پھنسا کر اپنے قدموں میں جھکانے والے اور پرائز بانڈز کے انعاموں سے حج عمرے، من پسند شادیوں، موٹر گاڑیوں، موٹر

سائیکلوں کے متنی لوگوں کی کمی نہیں۔ ان بد نصیبوں کو اپنی ان خواہشوں کے حصول کا طریقہ تعویذ گنڈوں اور اٹلے سیدھے عملیات میں نظر آتا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ ان نا عالموں کے پاس ہی ان کی نا آسودہ آرزوؤں اور محرومیوں کے زہر کا تریاق ہے۔ اگر ایسا پاکستان کا ہر عامل ڈیفنس اور گلبرگ کی کوٹھیوں میں بیٹھا ہوتا۔۔۔ یوک، مرسیڈز اور رائس ان کے قدموں تلے ہوتیں۔ ایئر پورٹ پہ ان کے ہیلی کاپٹر اور جہاز کھڑے ہوئے تو خود ہی جہاز ہوتے ہیں۔ سگریٹوں کے ٹوٹے اور گھٹیا منشیات استعمال کرتے ہیں، کرا کوٹھڑیوں اور کبوتروں کے ڈربوں میں سڑتے رہتے ہیں۔ یہ ڈھنگ کا لقمہ تو کھانسیر دوسروں کی کالپٹ کیا خاک کریں گے۔ ان کا سارا کھیل تماشا جاہل، اُن پڑھ، عقلمندوں کی حسی حصری بیماریوں اور کسی نہ کسی طرح راتوں رات لکھ پتی بننے کے خواہش ہمتوں، بے کروتوتوں کے لئے ہوتا ہے۔ مردوں سے کہیں زیادہ عورتیں اپنے غلوں، ساسوں، مندوں اور سوکنوں کو راہ راست پہ لانے یا ٹھکانے لگانے کے لئے ایسے عالموں کرتی نظر آتی ہیں۔ محبوب کو قدموں میں جھکانے والے، من پسند شادی جیسے حوصلہ افز پر کشش اشتہار پڑھ کر خود ان کے چنگل میں ایسی پھنسی ہیں کہ مال و زر کے علاوہ گوبر بھی لٹا بیٹھتی ہیں یا پھر زندگی بھر بلیک میل ہوتی رہتی ہیں۔

عامل ظہوری شاہ بھی ایسے ہی باکمال عالموں کے درمیان ایک معتبر اور مشہور نام کے مخصوص دوستوں کے علاوہ کوئی بھی اس کی گھناؤنی خصلت، گنڈائی ذہنیت اور بد کے واقف نہ تھا۔ یہ سارے دوست ایک دوسرے کے کانے تھے۔ ایک جیسے زانی، کے عادی بلیک میلر، بردہ فروش۔۔۔ انہی صفات کی بنا پر ایک دوسرے کے قریب اور دبیالہ تھے، ہر شب یہ لوگ کسی نہ کسی کے ہاں شغل میلے کے لئے اکٹھے ہو جاتے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری جانب مس عاشری تھی جو اسے آج رات اپنے دفتر لڑکی یعنی شمس کے بارے میں مشورے کے لئے بلا رہی تھی۔ عامل ظہوری نے رات پہنچنے کی بجائے اسے رات اپنے ہاں آنے پہ اصرار کیا۔

”کوئی خاص وجہ۔۔۔؟“ مس عاشری نے پوچھا۔

”آؤگی تو جان جاؤگی۔۔۔ ہلکا سا اشارہ دیتا ہوں، تمہیں ایک نادر سی چیز دکھ

ہوں۔۔۔“

اس نے لفظ ”نادر“ پہ زور دیا۔ مس عاشری نے لمبی سی ہوں کی اور بولی۔

”ٹھیک۔۔۔ میں حاضر ہو جاؤں گی۔۔۔“

عامل ظہوری کا دفتر جس مارکیٹ میں تھا۔ تین منزلہ اس عمارت میں سولہ دوکانیں گراؤنڈ فلور پہ تھیں۔ دوسرے اور تیسرے فلور پہ آٹھ فلیٹ تھے۔ جن میں کچھ تو کرائے داروں نے اپنی ضرورت کے مطابق دفاتروں میں تبدیل کر لئے تھے، باقی میں رہائش تھی۔

مارکیٹ کے مالک حاجی عنایت اللہ کے اکلوتے بیٹے شایان سے اس کی ملاقات اور تعلقات اسی دفتر کے سلسلے میں ہوئے تھے۔ لاہور میں وہ پرائیویٹ پڑھتا بھی تھا۔ بلڈنگ کی دیکھ بھال، معاملات اور کرائے کی وصولی بھی وہی کرتا تھا۔ دو گھریلو ملازموں کے ساتھ سب سے اوپر والے فلیٹ میں رہتا تھا۔ سترہ اٹھارہ کاسن، پانچ بہنوں کا اکلوتا لاڈلا بھائی تھا۔ بچپن کا زیادہ حصہ، بہنوں اور لڑکیوں سے کھیلتے کھیلتے گزارا۔ کھلی صاف و شفاف رنگت، نیلم کے نگینوں ایسے نیلگوں نین، کھڑا ناک، چھوٹا سا دہانہ، نازک نازک ترشے ہوئے سرخ سرخ ہونٹ، چہرہ رابن، سنہری بال، گھر بھر کا دارا اکلوتا ہونے کی وجہ سے انتہائی نگہداشت میں رہا اور گھر سے باہر نکلنے نہ دیا گیا۔ مدر سے مسجد بھی نہ بھیجا، معلم ماسٹر گھر پہ پڑھانے لگے۔ گلی ڈنڈانہ کبڈی کھیلی، فٹ بال نہ کرکٹ۔ گلی سحلے کے لڑکوں سے لڑانہ دوستی بڑھائی۔ گھر، ماں باپ، بہنیں اور صحن، کوٹھا، دالان۔ بہنیں اٹھائے اٹھائے پھرتیں، اپنے ساتھ اس کی کنگھی پٹی بھی کرتیں۔ رنگ دار شوخ کپڑے، گڈی گڈا کے بیاہ، گھر گھر کھیلتے، زر کسی انداز جو در آئے تو نزاکت اور نفاست بھی آگئی، چال اور بات چیت میں لڑکیوں جیسا انداز آگیا اور پتاوا بھی لڑکیوں کا پسند آنے لگا۔ ماں باپ، بہنوں نے لاڈ پیار میں اس کے بدلتے ہوئے رجحانات پہ کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اسی لولا پٹوپی میں وقت آگے سرکنا رہا اور وہ وقت بھی آن لگا جب لڑکے بالے چہرے پہ استرا پھرانا شروع کر دیتے ہیں لیکن اس کے مخملی چہرے پہ ابھی تک سبز نازک روئیں اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ایک ستم یہ بھی ہوا تھا کہ بچپن میں گھر کے کنویں کی منڈیر پہ ننگے نہاتے ہوئے اس کی میسی پہ پیلے بھرنے ڈنک مار دیا۔ لوہا بھسا، نکچر

خواہش تھی کہ شایان خوب پڑھے اس طرح وہ مصروف بھی رہے گا، اپنی محرومی کو بھی بھول سکے گا اور کل مستقبل بھی سنور جائے گا۔ ظاہر ہے، وہ اس کے مستقبل کے خواب کی ایک حسین تعبیر تھا۔ ماریٹ کے سب ہی لوگ شایان کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ بھی ان کے مسائل مشکلات میں دلچسپی لیتا، انہیں ہر ممکن سہولتیں بہم پہنچانے کی کوشش کرتا۔

منشی کرم الہی اور ملازموں کی مدد سے وہ اپنے کاروباری معاملات بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہا تھا۔ عامل ظہوری سے شایان کی دلچسپی یا عقیدت کی وجہ اس کی مسکور کن شخصیت، پُر اسرار علوم کا ماہر ہونا تھی اور ویسے بھی وہ لوگ جو کسی نہ کسی جذباتی، جسمانی یا روحانی وجوہ کی بنا پر غیر متوازن شخصیت کے حامل ہوتے ہیں وہ پیروں، فقیروں، بابوں، سانیوں وغیرہ سے بڑی عقیدت و دلچسپی رکھتے ہیں، وہ انہیں اپنا نجات دہندہ اور جلوہ ماوا سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس نے شروع سے عامل ظہور شاہ کو کرائے اور سیکورٹی میں خاص رعایت دی تھی۔ دفتر، آرائش اور ٹیلیفون کے سلسلے میں مالی معاونت بھی کی اور عامل ظہوری شاہ بھی خوب سمجھتا تھا کہ یہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی سدا بہار ہے۔ وہ اس سے انڈے حاصل کرنا چاہتا تھا مگر دھیرے دھیرے، مکمل طور پر اس پہ قابو حاصل کر کے اور اس ضمن میں پورا پلان اس کے شیطانی دماغ میں محفوظ تھا۔ وہ ہر کام اپنے صحیح وقت پہ سرانجام دینے کا قائل تھا۔ شایان اسے کوئی سپر آفاقی مخلوق تو سمجھتا ہی تھا، وہ محض شوقیہ طور پہ اس سے خفیہ علوم سیکھنے اور ان سے استفادہ کرنے کا بھی خواہش مند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر اوقات اس کے پاس اٹھنے بیٹھنے لگا۔

شایان کے ذاتی فلیٹ کے نیچے، استاد شفقت حسین شفو کی میوزک اکیڈمی تھی جہاں اکثر اوقات طلبہ کھڑکتے اور گھنگھرو جھنکتے رہتے۔ پروفیشنل، نان پروفیشنل لڑکیاں، لڑکے یہاں گانا بجانا اور ناچ سیکھنے آتے تھے۔ تانوں، تھاپوں، گتوں، توڑوں اور گھنگھروں کی چھنا چھن کے آہنگ سے ماحول لرزتا رہتا۔ پچھلی کھڑکیوں سے چریلے دھوئیں سے بادل اوپر اٹھتے تو اس کی کھلی کھڑکیوں سے داخل ہو کر اس بھی محسوس کر دیتے۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ نیچے جا کر وہ بھی گگ گگ گگھرو ڈال لے اور ناچے، لہرائے، بل کھائے۔ رقص سیکھنے والے زیادہ تر لڑکے نیم غنٹ، تنیکھے تنیکھے نین نقشوں والے، ادائیں، نخرے، عشوے دکھانے والے۔ وہ تھے ہی ایسے یا اس ماحول اور اس فن کا اثر کہ زنانہ پن ان کی ضرورت اور فطرت ثانیہ بن چکا تھا۔ ان کے استاد بھائی شمشاد بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے تھے۔

فنون لطیفہ میں رقص بڑی لطیف، حساس اور جمالیاتی نزاکتوں، لطافتوں اور اشاروں

لگایا۔ نوٹے ٹوٹکے کئے مگر آرام نہ آیا۔ دو روز بعد ڈنگ والی جگہ پہ جنگلی پیر جیسی گانٹھ سی گئی، پیشاب کے اخراج میں دقت ہونے لگی۔ ڈاکٹروں کو دکھایا۔ انہوں نے بھی اپنا اپنا علاج مگر معمولی زخم ایک مستقل کٹلی کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ماں باپ کی سٹی گم ہو گئی اسے اٹھایا اور لاہور لے آئے۔ روپے پیسے کی کمی نہیں تھی اور اکلوتا بچہ! نئے سرے۔ علاج معالجہ شروع ہوا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آپریشن کا آپشن بھی سامنے آیا، اب بات یہ سب متفق تھے کہ ہر دو صورت میں یہ شادی کے قابل نہیں رہے گا۔ ایک بھلے ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ ایک دو برس انتظار کر لو، شاید بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔ اب تک۔ علاج سے یہ ہو کہ آسانی سے پیشاب خارج ہو جاتا تھا ورنہ یہ ہو تا کہ مٹانے میں ٹیوب ڈال دی جاتی جو مستقل عذاب تھا۔ باپ کو یہ مشورہ مناسب معلوم ہوا۔ اسے لاہور رکھنے کا فیصلہ لیا گیا۔ یہ بلڈنگ خریدی گئی، دو گھر یلو ملازم اور اپنا ذاتی منشی ساتھ کر دیئے جو اس کی اور بلڈنگ کی دیکھ بھال کے لئے کافی تھے۔

لاہور آکر جیسے وہ جنت میں آ گیا ہو۔ کہاں شیخوپورہ اور کہاں لاہور، شہر نگاراں! ٹھیلوں، جلے جلوسوں، ہنگاموں اور زندگی کی رعنائیوں توانائیوں سے لبالب ہر دم جو اس زندہ باش لاہور، اسے یہاں رہنا بہت اچھا لگا۔ اس کا ایک سگاموں بھی یہاں رہتا۔ بجزی، اینٹ، روڑی کا کاروبار کرتا تھا۔ سینٹ کی انجینی بھی لے رکھی تھی۔ پڑھا لکھا کاروبار آدمی تھا۔ عرصہ دراز سے لاہور میں کاروبار کرنے سے اس کے گھر کا ماحول، طور طریقہ خیالات بڑا اچھا رخ اختیار کر گئے تھے یا کم از کم اپنی برادری اور رشتے داروں سے بہتر تھے۔ بچے بھی بڑے اچھے ماحول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس کی اکلوتی بیٹی نین تارا ایک مٹ کالج میں سیکنڈ ایئر کی سٹوڈنٹ تھی، شوخ و شنگ اور بڑی تیز طرار طبیعت والی، کہیں بچپن اس کی نسبت شایان سے ملے کر دی گئی تھی۔ اسے وہ پسند بھی کرتی تھی، شیخوپورہ جاتی تو۔ ضرور ملتی اور پیروں اس کے ساتھ باتیں کرتی۔ اس کی دلداری کرتی رہتی۔ وہ اس بیماری سے واقف تھی، اس کے باوجود بھی اس کی محبت کا دم بھرتی۔ وہ اس کا پھوپھی زاد منگیترا تھا، خوبصورت شہزادہ سا۔ وہ من ہی من میں مستقبل کے سہانے خواب بنا کرتی۔ اس کی جمال پسند اور رومانی طبع کے عین مطابق تھا۔ عید، تہوار، سالگرہ، وہ اسے خوبصورت کارڈ بھیجتا، بھولتی۔ اس کے لاہور شفٹ ہونے سے وہ بہت خوش ہوئی۔ وہ بھی اکثر ماہ کے گھر آ جاتا۔ خوب باتیں ہوتیں، ویڈیو، فلمیں چلتیں اور کھاتے پیتے وقت رنگین تیلیویر ماند کہیں اڑ جاتا۔ مناسب موقع پہ وہ اسے اپنی پڑھائی جاری رکھنے کی تاکید کرتی رہتی۔ ار

کنائیوں، کیفیتوں کی منظر صنف ہے۔ اسے سیکھنے کے لئے جہاں ریاضت، صبر اور ذوق و شوق کی ضرورت ہوتی ہے وہیں چہرہ ابدن، مناسب و متوازن اعضا، بولنے ہوئے خد و خال، خاص سن و سال اور رنگ و رامش سے معمور ماحول بھی ضروری ہے۔

رقص کو اعضاء کی شاعری کہا گیا ہے، ہڈیوں سے گودا نکلا کر ریڑھ کو ہانا پڑتا ہے۔ پاؤں کو پمب پور، پوریوں پر رکھیں تو وہ نہ ٹوٹیں۔ لبوں کی تھر تھراہٹ، آنکھوں کی جنبش و تاثرات اعضاء کی حرکات و سکنات سے مانی الضمیر بیان کرنا پڑتا ہے۔ انگ انگ انگڑائیاں، روم روہ ردھم، یہ خالص نسائی، نرمی، جمالی اظہار دلاری کا فن ہے۔ جنس ثقیل اپنی اعضائی عصبیت اور جبلی کشاف کی مجبوری کی بنا پر بھرپور توجہ اور پذیرائی حاصل نہیں کر سکی۔ گو اس فن کے ماہرین اور اساتذہ میں بڑے بڑے گرانڈیل شہرت یافتہ مردوں کے نام موجود ہیں مگر ماننا پڑے کہ یہ خالص نسائی سلسلہ فن ہے۔ جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا۔ مور میں لاکھ وجاہت خوبصورتی و خوش رنگی ہو اور ناچنے میں وہ کیسا ہی طاق و طرار ہو مگر اس کے نمایاں عیب اس نر ہونا اور بھدے پاؤں ہیں۔ راوہا ہی ناچتے ہوئے بھلی لگتی ہے اور یہ بات مردوں سے زیادہ زنانے بہتر سمجھتے ہیں اسی لئے وہ زنانہ روپ دھارتے ہیں۔ میک اپ اور مصنوعی بالوں کی دگر استعمال کرتے ہیں۔ ٹڈا کرا، شیو بڑھا، مردانہ لباس پہن کر اگر ناچنا شروع کر دیں تو لوگ تھوکیں گے بھی نہیں۔ مرد یا نیم مرد، جب اس فن کو سیکھنے کی منزل میں ہوتا ہے تو دھیرے دھیرے اس کی مردانہ شناخت شانت پڑنا شروع ہو جاتی ہے اور پھر یہ ماحول ہی ایسا ہوتا ہے کہ اچھا خاصا بال بچے دار مرد اگر ادھر محض بیٹھنا اٹھنا ہی شروع کر دے تو چند ہی روز میں اس کی مردانہ غدودیں سکڑ کر تباہ ہو جاتی ہیں اور یہ پھر آہستہ آہستہ ”مورت“ کی صورت میں بدلنا شروع ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ زرخا اور سانپ ہی کیا جو سیدھا چلے۔۔۔ غدودوں کی ردور ریخت کا پہلا رد عمل چال اور اعضاء متحرک کے نچانے ہارنے اور تالی تپانے سے ظاہر ہوتا ہے۔

شایان یہ بھی یہ ماحول اثر انداز ہونے لگا۔ آتے جاتے ان لوگوں نے مڈ بھڑ ہو جایا کرتی تھی۔ ان کی چھت، اس کا فرش تھا اور پھر طلبہ ڈھولک اور شہنائی، دائلن، بانسری تو ایسے ساز ہیں جو سلت پردے ڈھکے بجیں تو کن ریسے، کلن دھر لیتے ہیں۔ یہاں صرف چار پانچ انچ کا پردہ تھا۔ پہلے پل کچھ الجھن ہوئی جو آہستہ آہستہ خوش آہنگی اور لطف و کیف میں بدل گئی۔ ہلکا سا آنا جانا شروع ہوا۔ اس کا نازک خوبصورت وجود، ناز و ادا اور زنانہ پن بھلا ان کی زمانہ اور زنانہ شناس نگاہوں سے کیسے چھپا رہ سکتا تھا۔

اس روز بھی نیچے حسب معمول ساز و سنگیت کا سلسلہ جاری تھا جس کا وہ اب عادی ہو چکا تھا مگر آج کچھ زیادہ ہی شور و غلغلہ مپا تھا، ٹوہ لینے کی خاطر وہ نیچے اتر آیا۔ بڑے کمرے میں آرائش و صفائی کا آج کچھ خاص اہتمام تھا، کچھ آسودہ حال سے نئے چہرے بھی بیٹھے تھے۔ مند خاص پہ بھائی شمشاد کے ساتھ ان کے پیر بھائی حاجی رجب بیگم بھی بڑے ٹھارٹھے سے نیم دراز تھے۔ طلبہ پکائی کے ہیڈ ٹیچر ماسٹر رؤف نیا جوڑا، تازہ شیو کئے، تزک دھم، تزک دھام، فرما رہے تھے اور فریہ اندام سی خوبصورت لڑکی گھنگھر و باندھے، پیر سیدھے کر رہی تھی۔ گردن، ماتھے پہ پسینے کی ابرک چمک رہی تھی۔ بھائی شمشاد کی گردن، چنے ہوئے لہر و اور مند کے ہتھے پہ دھری انگلیاں طلبے کی گت کے ساتھ ساتھ گویا رقص کر رہی تھیں جبکہ حاجی رجب بیگم کے پاؤں پڑے پڑے جنبش لے رہے تھے۔ بھائی شمشاد کا شاگرد خاص فلموں میں نووارد لڑکی کو اس کے سر پرستوں کی موجودگی میں ریسرسل کردار ہاتھا۔ شاگرد پیشہ مودب، باتمیز بیٹھے بڑے ڈسپلن کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر جب شایان داخل ہوا تو آنکھوں کے شیشوں کو جیسے پسینہ آگیا۔ غلمان صفت، شعلہ رو۔۔۔ نگاہیں ہیبت جمال سے تراز ہو گئیں اور ہنگامہ و آہنگ کو جیسے سکتہ نکل گیا۔ حاجی رجب بیگم کے سفید بالوں کی جڑوں کے خشک سوتوں میں تازہ خون اہل پڑا۔ ایسی مست خرامی جیسے کوئی آہو چو، انجانے میں کسی نکل اندامیں داخل ہوا ہو۔ ایسی چھب، ایسی دھج، کہ گریاں کی دھجیاں اڑا، ویرانوں کو نکل جائیں۔ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی، وقت جیسے ختم گیا ہو۔۔۔ پھر استاد شفو لپک کر آگے بڑھا، بڑے احترام سے ایک نمایاں جگہ بٹھانا چاہا مگر حاجی رجب بیگم نے ہاتھ کے اشارے سے پاس بلا کر اپنے دل کی جانب بائیں پہلو بٹھالیا، سرک کر ماتھے پہ بوسے کی مہر ثبت کی اور ہاتھ دھرے پلٹا کر بائیں زد کیں۔ ”ماشاء اللہ! چشم بد دور“ کہتے ہوئے زر ہفت کے بڑے کی طنائیں ڈھیلی کیں، ایک سو ایک روپیہ سر پہ سے وارتے ہوئے نایبے نعمت اللہ نال نواز کو بطور صدقہ عطا کر دیئے۔ یہ دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ اب کہاں کی محفل اور کدھر کی ریسرسل، سب کچھ پس منظر میں ڈوب گیا۔ رجب بیگم کے سامنے بس ایک ہی منظر تھا، ایک ہی چاند تھا جس کی شیش کرنوں نے اس کے اندر کے سارے اندھیرے چشم زدن میں ختم کر دیئے تھے، اتنا اجالا، ایسی روشنی۔ ہزاروں قدیں لیں، لاکھوں شمعیں اور کروڑوں فانوس ایک دم جگمگ، جگمگاٹھے ہوں۔

بوڑھا ہجرا ہو، بوڑھی طوائف یا کوئی بوڑھا دولت مند، ان کا عشق بڑا قیامت توڑ ہوتا ہے۔ جسم و جان کے فرسودہ اعضا، ایک جھنکا برداشت نہ کر سکیں لیکن دل و نیت کی

حشر سامانیاں بڑی دلولہ خیز ہوتی ہیں۔ ان کے پوئلے منہ اور عشق اٹھائیں اور اظہار الفت (تائیں اتنی پر شدت ہوتی ہیں کہ اچھے اچھے توانا عاشق شرمندہ ہو کر، داڑھی بڑھا کر نماز روز شروع کر دیتے ہیں۔ سریر سے سریر جڑا ہوا تھا۔ اس کے تپتے ہوئے خیالات، جلتے ہوئے جسم کی حدت اور دھک دھک دھڑکتا دل۔

شایان کو کیا خبر ہوتی۔ وہ معصوم طور قص کے توڑوں کی تکرار میں مگن تھا۔ لڑکی شاید بھار پاؤں، وزنی تھکھڑوؤں سے فرش کے لینئر کی روڑی کوٹ رہی تھی۔ بار بار ایک ہی گت، ایک ہی توڑے کی تکرار۔ مسلسل ناچتے ناچتے لڑکی کی فاضل چرپی پسینے کی شکل میں جسم سے رہی تھی، بغلوں سے پر نالے چھٹے ہوئے تھے۔ اسے گھن سی محسوس ہوئی، وہ اٹھنے کی سوچ رہا تھا کہ محفل برخواست ہو گئی۔ کچھ دیر بعد تنائی میسر ہوئی تو استاد شفوئے باقاعدہ تعارف کرایا اور بات چیت کے دوران ہی حاجی رجبی بیگم کے شک کو تقویت مل گئی کہ وہ اس کے کار بندہ ہے، کچی مورت ہے۔ رجحان اور میلان نرمحیت کی جانب ہے، یہ تو خیر پہلے ہی بتا دیا تو رجبی بیگم تو وہ جادوگر تھا کہ اگر چند رچھوں کے باپ کو چندہ منٹ پاس اٹھالے تو جنم جنم کی مورت بنادے۔

شایان جلدی اٹھ کر آیا، شام ظہوری شاہ سے ملنے کا وعدہ تھا۔

مس عاشی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب حسب وعدہ عامل ظہوری کے دفتر پہنچ گئی۔ شام کے دھچھے رنگ کالباس، ہلکے سے میک اپ میں وہ بڑی فریش نظر آ رہی تھی۔ خوبصورت نفیس پیکنگ میں وہ گورے ڈیٹلائٹ سویٹ والوں کی مٹھائی لانا نہیں بھولی تھی۔ یہاں عامل صاحب بھی اپنے پسندیدہ گیروے رنگ کے سندھی کڑاھی والے کھلے لباس میں مشک بسائے چنبیلی کے تیل سے چھڑی دراز زلفوں پہ سندھی ٹوپی پہنے شایان سے محو گفتگو تھے۔ کالی پینٹ، مروں کلر کی بین کالر شرٹ، براؤن اٹالین شوز، سواتی یاقوت کے آتشیں نگینے والی انگشتری، گلابی کانوری موی کلائی پہ وزنی کندن زنجیر، سرامک اسٹریپ، کرسٹل سفار، قیمتی راڈو۔ بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کا آدھ انچ لمبا پالش کیا ہوا ناخن اور فرانسسی شینیل فایو کی مخصوص مدھم سی مہکار۔ وہ اسے مبہوت سی دیکھتی رہ گئی۔ یہ نہیں کہ وہ پہلی مرتبہ ملی تھی، اس سے پیشتر بھی سرسری سی دو چار ملاقاتیں اسی بلڈنگ کے اسی دفتر میں ہو چکی تھیں لیکن آج تو شایان، شایان شان تھا۔ نیلم سی نیلگوں آنکھیں، سونا براوے بال، لعل یمن سے تراشے لب، سپی پید دانت۔ وہ ایک رنگین مزاج عورت تھی، دانت کچکپاتی رہ گئی، اتنا خوبصورت، اتنا سیلا کہ کچا چبا جانے کو دل چاہے۔ مٹھائی کا ڈبا تھا۔ وہ سحرزدہ کھڑی تھی۔ ظہوری شاہ، اس کے اندر باہر کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے، مترنم شعر بڑھنے لگا۔

”اے دیکھنے والے اس درجہ گستاخ نہ بن، بے باک نہ ہو

اس طرح لطافت جلوؤں کی مجروح نظر ہو جاتی ہے“

”میڈم! تشریف رکھیں پھر جی بھر شایان صاحب کو دیکھتی رہئے، دیکھنے پہ کوئی ٹکٹ نہیں۔“

ملازم ٹھنڈے مشروب کی بوتلیں میز پہ سجا کر باہر نکلنے لگا تو مس عاشی نے اسے روک لیا اور سو روپے کا کور نوٹ تھماتے ہوئے کہنے لگی۔

”شایان صاحب کا سر صدقہ۔۔۔ باہر محتاجوں میں تقسیم کر دو۔۔۔“

پھر اپنے ہاتھوں ظہوری شاہ اور شایان کو مشروب پیش کرنے لگی اور بولی۔

”ہاشا اللہ، نظرد سے بچیں، آج تو شایان صاحب پہ نظر نہیں ٹھہرتی۔۔۔“

گلوں ہونٹوں سے ٹھنڈا مشروب سب کرتے ہوئے تعریف کرنے لگی۔ ظہوری شاہ نے شرارت اور متانت کے ملے جلے لہجے سے اس کی بات پہ گرہ لگائی۔

”نظریں تو آپ کی کافی عرصہ سے ان پہ ٹھہری ہوئی ہیں۔۔۔“

جیسے ایک ساتھ کئی گلاس چھناکے سے ٹکرا گئے ہوں، وہ اتنا ٹوٹ کر ہنسی کہ آنسو نکل پڑے۔

”بہت خوب، شاہ جی! مزہ آگیا۔ کیا بر محل چوٹ کی ہے۔۔۔“ وہ ننھے سے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”اسی لئے تو ان کا صدقہ اتارا ہے۔۔۔ اور آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کم از کم میری نظران پر ٹھہر تو سکتی ہے مگر لگ نہیں سکتی۔۔۔“

وہ اسے معنی خیز نظروں سے تولتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”وہ کیوں، کیا آپ کی نگاہوں میں ذوق نگارگی کی کمی ہے۔۔۔؟“

”جی نہیں۔۔۔ ذوق نگارگی کی کمی ہے، نہ جلوہ بینی کی، آپ تو جانتے ہیں کہ ہیرے پہ کنکر کی چوٹ سے کوئی اچھا برا اثر نہیں پڑتا۔۔۔“

شایان بھنا کر بولا۔ ”آپ دونوں کی تو برابر کی چوٹ ہے، مجھ غیوب کو درمیان میں کیوں رگید رہے ہیں۔۔۔ کون ہیرا، کون کنکر؟“

ظہوری شاہ لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ”واہ، بہت اچھے۔۔۔ بڑی بی سو بڑی بی، چھوٹی بی سجان اللہ۔۔۔!“

اب شاید شایان کے ہنسنے کی باری تھی، اس ہنسی پر بھی قربان۔ وہ ہنسا تو ملے ہوئے غلابے ریلے ہونٹوں کے کناروں کے پاس ننھے ننھے ڈھل نمایاں ہو گئے۔ بالکل جیسے یکے ہوئے آلوچے نمازت اور شیریں رس کی فراوانی سے پھوٹنے کو ہوں۔ ہنسی کیا تھی، جلت رنگ کا آہنگ تھا۔ مس عاشی اب بھی محفوظ ہوئی، بولی۔

”آپ کی ہنسی پہ بھی قربان جانے کو جی چاہتا ہے۔۔۔“

شایان، ظہوری شاہ سے مخاطب ہوا۔ ”آپ دونوں نے میرا کافی مذاق اڑا لیا ہے، اب میرے لئے یہی بہتر ہے کہ میں ”نیواں نیواں“ ہو کے یہاں سے نکل لوں، لیکن جانے سے پہلے آپ سے ایک شعر ضرور سنوں گا۔ مجھے تو آج معلوم ہوا آپ اتنا اچھا ترنم اور اتنا معیار

نہری ذوق رکھتے ہیں۔۔۔“

ظہوری اپنی تعریف سن کی مسکرایا، خوش ہوا۔ اک لمحہ آنکھیں میچیں اور بولا ”لو بھئی، موقع کی مناسبت سے ایک شعر یاد آگیا۔“

”پھیل ہوئی ہے آس پاس آنکھوں کے دھوپ سی

یہ آپ ہیں تو آپ پہ قربان جائیے“

سجان اللہ۔۔۔ ”شایان نے داد دی اٹھتے ہوئے پرس سے پانچ سو کانوٹ نکال کر سپرائیٹ کی خالی بوتل میں پھنسیا۔ ”میری طرف سے مس عاشی کی خوش اخلاقی، خوش ذوقی اور خوش طبعی کا صدقہ اتار دیجئے گا۔۔۔“ کوئی جواب لئے بغیر وہ باہر کھسک گیا، دونوں منہ کھولے ایک

سرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ چند لمحے ساکت و جلد سے گزر گئے پھر مس عاشی نے اس کھولا، بینسن کا بیٹ نکالا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے سگریٹ سلگائے۔

”اجازت ہو تو اب کچھ لڑکی کے بارے میں گفتگو کر لیں۔۔۔“ بھرپور دھواں اگلے ہوئے ظہوری شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ مس عاشی نے کہنا شروع کیا۔

”شاہ جی! لڑکی بڑی سوبر اور کوپریوٹ ہے، میرا خیال ہے، اس سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔۔۔ گو شکل و صورت واجبی سی ہے لیکن تھوڑی سی محنت اور نوک پلک درست کرنے سے کہیں نہ کہیں کھپ ہی جائے گی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟۔۔۔ ہاں، یاد آیا۔۔۔ آپ نے

اس کے سیارے خمس ہونے کی متعلق کچھ کہا تھا۔۔۔“

ظہوری شاہ نے کانڈ پہ کچھ تحریر کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اس کی موجودہ حالت کیسی ہے؟“

وہ دماغ پر زور ڈالتے ہوئے بتانے لگی۔ ”ستر فیصد ہوش و حواس میں ہے۔ بہادھو، پڑے بدل، کھانا پینا کر کے میوزک سن رہی ہے۔۔۔“

لمبی سی ”ہوں“ کرتے ہوئے اس نے پھر سوال کیا۔ ”کوئی سگریٹ وغیرہ۔۔۔؟“

”سداھے سگریٹ نہیں لیتی، تین بار بھرے ہوئے پیئے۔ پنی اور پوڈر کا تقاضا کرتی ہے۔۔۔ ایک بار آپ کی دو ابھی دی تھی۔“

”گزری رات کی کوئی بات، اس نے اپنے یا تمہارے متعلق کوئی سوال پوچھا ہو۔۔۔؟“

رات وہ بے سدھ سوئی۔ اپنے اور میرے متعلق اس نے پوچھا تھا، میں نے اسے بتایا کہ معمولی سے حادثے میں اپنی یادداشت وقتی طور پہ کھو چکی ہے وہ میری چھوٹی بہن شمرہ ہے، اس کی بڑی باجی ہوں۔۔۔ ”وہ کچھ توقف کرتے ہوئے بولی۔ ”شاہ صاحب! وہ اپنا ماضی لپچکی ہے، اسے کچھ بھی یاد نہیں۔۔۔“

عامل ظہور شاہ کچھ سوچتے ہوئے پھر حساب کتاب میں مشغول ہو گیا اور کچھ دیر آنکھیں موندھ کر کہنے لگا۔

”اس کا زانچہ تیار کرنے کے لئے اس کا اور اس کی ماں کا نام تاریخ پیدائش جاننا ضرور ہے۔ میں نے پہلے جس خدشے کا اظہار کیا، وہ محض ماتھا دیکھ کر کیا تھا۔ یہ محض آدھا حار ہے پورا نہیں۔“

وہ قدرے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ”اب کیا کریں۔ اس کے پاس تو ایسا نشان یا اتا پتا نہیں۔ جس سے اس کا نام، ماں کا نام یا پیدائش کی تاریخ معلوم ہو سکے۔“ تم ٹھیک کہتی ہو۔ استاد قریان کو یہ لڑکی بڑی بری حالت میں ملی تھی، اس دن ہی کی جسمانی اور ذہنی حالت کا اندازہ ہو گیا تھا پھر اس کا لباس بھی بتا رہا تھا کہ کسی جگہ اس ساتھ بہت زیادتی ہو چکی ہے۔ لڑکی کافی عرصہ سے منشیات استعمال کرتی چلی آرہی۔ زیادتی سے پہلے، زیادتی کے درمیان اور بعد میں بھی اسے منشیات کے انجکشن دیئے۔ مختلف انجکشنوں کی زیادتی نے اس کے دماغ کے اندر یادداشت کے خلیوں کو بے ناکارہ کر دیا ہے۔ رہا اس کی شناخت کا مسئلہ تو ظاہر ہے کہ زیادتی کرنے والوں نے اس پرس کے ساتھ بھی کوئی شریفانہ سلوک نہیں کیا ہو گا۔ نقدی، شناختی کارڈ، ڈائری وغیرہ، کچھ صاف کر دیا ہو گا۔“

مس عاشی مایوس ہو کر بولی۔ ”اب۔۔۔؟“

”اب صرف انتظار کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی کھوئی یادداشت واپس آجائے یا پھر کبھی نہ آئے۔“

کچھ دیر دونوں پر خاموشی کی دھند چھائی رہی، پھر جیسے مس عاشی کو امید کی کوئی کرن پڑی۔

”شاہ جی! آپ کوئی ایسا عمل کریں کہ اس کی یادداشت کبھی واپس نہ آئے۔ اس طر اس کو نیا نام، نیا کام اور نئی زندگی دیں گے۔ اپنے ڈھب پہ لا کر نوٹ کمائیں گے۔“

”میڈم! آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کچھ دن تیل دیکھیں، تیل کی دھار دیکھ پھر دیکھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔۔۔ فی الحال آپ اس کا دل جیتنے کی کوشش کریں طرح سے آرام اور سکون بہم پہنچائیں۔ اور ہاں، میری دی ہوئی دوا کا استعمال رکھیں۔۔۔“

وہ قدرے مطمئن سی اٹھتے ہوئے بولی۔ ”کبھی شایان صاحب کو ہمارے غریب خا

ی لائیں، کچھ ہمیں بھی ان کی خدمت کا موقع ملے۔“

وہ دزدیدہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میڈم! یہ مرغی کاٹ کر کھانے والی ہے، انڈے دینے والی ہے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ آج بھی آپ نے صدقہ اتار کر کچھ اداہی بے تکلفی برتی ہے۔“

”شاہ جی! واقعی وہ آج بڑا پیارا لگا اور پیاری چیز کو میری نظر بڑی جلد لگ جاتی ہے، اسی نے صدقہ اتارا۔ ورنہ ایسی دلی کوئی بات نہیں۔“

وہ زیر لب مسکراتی ہوئی، اللہ حافظ کہہ کر دروازہ کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

عامل ظہوری شاہ خوب جانتا تھا کہ شایان اس کی شخصیت اور عامل ہونے کے حوالے سے کی بڑی عزت کرتا ہے، اس سے متاثر اور مرعوب بھی ہے۔ وہ جب سے اس کا کرایہ دار ہوا تھا، اس کی ذات کی شخصیت کو دار طبیعت کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کی ساتویں شیطانی جس تجربے نے اشارہ دے دیا تھا کہ یہ دوہری شخصیت کا شہزادہ اس کے لئے سونا نہیں بلکہ ٹینم کے انڈے دینے والی مرغی ثابت ہو گا۔ وہ اس کی بدترتیب بدلتی ہوئی نرگسی تبدیلی سے آگاہ تھا، اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ شایان ہمیشہ اس وقت اس کے پاس آنے کی جستجو کرتا ہے جب دفتر خالی ہوتا ہے۔ اس نے اشارہ بھی دیا تھا کہ وہ اپنے کسی ذاتی پر اہم پہ بات کرنا ہوتا ہے مگر ظہوری شاہ جان بوجھ کر اسے وقت فراہم نہیں کرتا تھا۔ وہ اس کی طلب کو ہوا دے تھا، وہ شروع ہی سے ٹھنڈا کر کے کھانے کا عادی تھا اور اب شاید کھیر ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

ایک روز، ٹھنڈے سپرد دروازے پہ ملازم بیٹھا تھا۔ عام ملاقاتیوں کے لئے داخلہ بند تھا، روہ ایک امیدوار کو نسلر کا زانچہ تیار کر رہا تھا۔ میز پر کتابیں، ستاروں برجوں کے نقشے، ہاتھ پر پرنٹ پھیلے پڑے تھے۔ ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھری پڑی تھی۔ چرس، تمباکو، دلی شراب کی ملی جلی بدبو سے کمرے کی فضا بو جھل تھی کہ تب ہی اچانک شایان کے آنے کا اطلاع ملی اور وہ لپک کر خود ہی باہر کمرے میں آ گیا۔

”شاہ صاحب! آپ مصروف دکھائی دیتے ہیں، میں بے وقت آنے کی معافی چاہتا ہوں۔ اب دوسرے گزرا، باہر ملازم کو بیٹھے دیکھا، اس سے آپ کی طبیعت کا معلوم کیا اور سنے، نہ کرتے ہوئے بھی اس نے آپ کو میرے آنے کی اطلاع کر دی۔“

ظہوری شاہ بڑے دلار سے اس کے شانے پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔

”میاں صاحب! جب آپ آہی گئے ہیں اور آپ کے مقدر کی چائے میرے ہاں لکھی ہی گئی

ہے تو پھر تکلف کیسا اسی بہانے میں بھی چائے پی لوں گا۔ آئیے۔۔۔

اس کے پرائیویٹ کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے الٹائی سی آئی۔ کھٹی کھٹی بدبو۔۔۔ اس کا دماغ پھٹنے لگا جب اندر آہی گیا تو منہ سے کیا بولتا صبر کر کے بیٹھ گیا اور بکھرے ہوئے ”لبے“ کو تجسس بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”شاہ جی! آرزو کچھ زیادہ ہی مصروف دکھائی دیتے ہیں۔۔۔“

”ہاں، شایان صاحب! ایک سیاسی شخصیت الیکشن لڑنا چاہ رہی ہے، اس سلسلے میں وہ ہوں۔۔۔“

وہ دلچسپی لیتے ہوئے مزید کیریدنے لگا۔ ”الیکشن کے سلسلے میں آپ اس کی کیا مدد ہیں۔۔۔؟“

”یہ باتوں کے پرنٹ آپ دیکھ رہے ہیں۔۔۔“ وہ ایک پرنٹ لائٹ بکس کی سکرین دکھاتے ہوئے دکھانے لگا۔ ”یہ ریکھائیں، ابھار، دائرے، جھرٹ، مکھٹ، کھکھائیں، کے اندر اس کی ناکامی یا کامیابی چھپی ہوئی ہے۔۔۔ اور یہ دیکھیں اس کا زانچہ، اسی کتاب اور ستاروں کی چالوں کے حوالے سے وہ اپنی کامیابی کے امکانات کا اندازہ لگانا چاہتا ہے اور میرے حساب کتاب کے مطابق اس کی کامیابی کا چانس ساٹھ فیصد ہے۔ عطارد، دلو، کے قریب بھٹک رہا ہے اور بس یہیں خرابی پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔۔۔“

وہ مزید دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”آپ کے خیال میں اس کی کارگراف ساٹھ فیصد سے اوپر جاسکتا ہے۔۔۔؟“

”دعویٰ تو نہیں، کوشش کی جاسکتی ہے۔ کامیابی، ناکامی تو اللہ کے ہاتھ ہے۔ بندہ محض کوشش اور دعا کر سکتا ہے۔۔۔“

ذرا وقفہ ملا تو ظہوری شاہ سگریٹ بنانے لگا اور بولا۔

”شایان صاحب! موڈ اور ماحول بنانے کے لئے مجھے بھرے ہوئے سگریٹ کی طلب ہے، خصوصاً اس حساب کتاب میں دماغ خشک اور ڈل ہو جاتا ہے۔ اسے فعال اور رکھنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی چیز نہیں۔۔۔“ وہ چرس کی پھٹی کو گرم کر کے سگریٹ تباکو میں مسل رہا تھا۔ ”وجدانی کیفیتوں اور باطنی توجہ کو ایک نقطے پہ جمع رکھنے کے لئے اکیر ہے۔۔۔“

سگریٹ بھر کر سلگایا۔ ایک دو لمبے لمبے دم، دو کشوں میں ہی سگریٹ آدھا جا سگریٹ کی جلی ہوئی راکھ، تھیلی پہ جھاڑ کر زبان سے چاٹ لی۔ کمرہ غلیظ اور کثیف دھواں

بھر گیا، شایان کو کھانسی کا پھندا لگ گیا۔ اتنے میں ملازم چائے لینے اندر آ گیا۔

”شایان صاحب! کھل کر کھائیں، سینے میں رکی ہوئی کھانسی بلیغم پیدا کرتی ہے اور اسی طرح دل میں دباؤ ہوئے دکھ اور غم بھی انسان کے لئے موت کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ جو سینے اور دل میں ہو، اسے فوراً باہر نکال دینا چاہیے۔۔۔“ کثیف دھوئیں کے مرغولے اور چھلے بنا کر اس کے چہرے پہ پھینکتے ہوئے ظہوری شاہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ ”جب آپ اندر داخل ہوئے تھے، آپ کو اندر کی فضا بڑی بو جھل اور کچھ بدبودار سی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے آپ کے چہرے کے تاثرات سے محسوس کر لیا تھا مگر آپ نے اظہار نہیں کیا اور بات اندر رکھ لی۔ یہی بات میں آپ کو سمجھانا چاہتا تھا کہ دھواں یا دکھ، بات یا مات اندر رہے اور کمرے یا منہ کی کھڑکی نہ کھلے تو بڑی کنھن اور کنھنا پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔ ظہوری شاہ نے اٹھ کر بند کھڑکیاں کھول دیں، تازہ ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ ”دیکھا آپ نے، پل بھر میں فضا بدل گئی۔۔۔“

وہ مسکراتے ہوئے ایک اور سگریٹ تیار کرنے لگا۔ شایان بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔۔۔ کتنی خوبصورت مثالیں تھیں، کیسے دل نشیں اور پُر اثر انداز ہیں اس نے سمجھا دیا تھا کہ بات کو باہر نکالو۔ کوئی مخلص انسان نہ ملے تو دیواروں، دروازوں، کھڑکیوں سے ہی اپنا دکھ کہہ دو کہ اس طرح انسان ہلکا اور تروتازہ ہو جاتا ہے۔ سگریٹ بنا کر سلگاتے ہوئے پھر ظہوری شاہ کمنٹری شروع ہوا۔

”یہ بھرا ہوا سگریٹ اندر کی بھڑاس نکال دیتا ہے۔ اس کی کڑواہٹ، اندر کی کڑواہٹ کو کٹ دیتی ہے۔ یہ انسان کو اس کی اوقات کے حصار سے باہر نہیں نکلنے دیتی اور اس کے اُبلتے ہوئے جذبات، خیالات اور احساسات کو آہستہ آہستہ تھک کر میٹھی نیند سلا دیتی ہے۔ اس کا دھیان اندر کی طرف دھکیل دیتی ہے۔۔۔ یہ چرس ہے۔“ وہ اسے چرس کی گولی دکھانے لگا۔ ”شایان صاحب! یہ درویشی تحفہ اور فقیری دھواں ہے، دھیانی گیانیوں کی دین ہے۔ مہاتما بدھ نے جب دھیان گیان کی خاطر برگرد کے نیچے آسن جمایا تو من کی چتا، سنار کے جو کھم اور اکھوں کی ننڈیا کارن جب بہت دکھیا ہوا انگلیاں ڈال ڈالے نکال باہر پھینک دیئے۔ ڈیلے مٹی کے ڈھیلے سے ملے تو حشیش کا پودا پھوٹ پڑا۔ تب سے اب یہ کل دیوی، دھیانیوں، گیانیوں، منیوں، ریشیوں اور خفی علوم کے طالبوں پہ اپنی مدھرتا کی چھپر چھایا کئے ہوئے ہے۔۔۔“ شایان تو چرس پیئے بغیر ہی قریب قریب مدھوش ہو گیا۔۔۔ حلق خشک لیکن دماغ تر ہو گیا تھا۔ ایسی باتیں کبھی نہ تھیں۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کے آدھے دلدر دور ہو چکے ہیں،

وہ خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگا۔ یہ نہیں کہ اس نے کبھی سگریٹ نہیں پیا تھا، نہ کے طور اکثر وہ سگریٹ پی لیا کرتا تھا۔ چرس ورس کے چکر میں نہیں پڑا تھا مگر اتنی تعریف فائدے سن کر اس کا دل چاہا کہ شاہ صاحب ایک آدھ کش اسے بھی عنایت کریں۔  
”لو، شایان صاحب! ہلکے سے ایک کش لگا کر دیکھو اور میری ان باتوں کی خود ہی تصدیق کرلو۔“

جیسے اس نے شایان کا ذہن پڑھ لیا تھا۔ دو چار کشوں سے واقعی وہ ہوا میں اڑنے والا دماغ کافور کی ڈلی کی مانند ٹھنڈا، روئی کا گھلا بن گیا۔ ایسا سرور، ایسا سکون، سرمستی اور فراموشی اسے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ نیلگوں خواب خواب غزالی اکھڑوں میں کے دیئے سے روشن ہو گئے۔

”واہ، سرور آگیا، شاہ جی!۔“ وہ خشک لبوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے کہنے لگا۔  
جی! کبھی میرا حساب یعنی زانچہ بھی بنائیے۔“

عادل ہو شیار اور مکار تھا، معمول مد ہوش اور معصوم۔ ظہوری شاہ کے ہونٹوں پر برفیلی سی مسکراہٹ خیر رہی تھی۔ اس نے سرور کے سمندر میں ڈوبتے ہوئے شایان کو جو دیا۔

”گولی کدی تے گبنے کدے۔۔۔ جب آپ حکم کریں، زانچہ تیار ہو جائے گا لیکن زانچہ تو دکھی، پریشان اور زندگی کی دوڑ میں ناکام لوگ بنواتے ہیں۔ اس نے کمال مکاری اسے کریدتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔ وہ تو بڑا تجربہ کار، عیار شکاری تھا، شکار کو قوت اور تکلیف دے کر شکار کرنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ حالات اور ماحول پیدا کر کے اسے اپنا وزن، کسی غلطی یا کمزوری کے ہاتھوں بے بس کر کے شکار کرنا پسند کرتا تھا۔ بڑی لمبی پلاننگ انتظار صبر کے بعد، آج وہ موقع حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہ اس کی کوئی دھمکی پکڑنا چاہتا تھا، کسی کمزوری یا خامی کو نظر میں رکھنا چاہتا تھا۔ اسے نامحسوس شرفانہ بلیک سے اپنا آلہ کار بنا کر وسیع تر مفاد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شایان چرس کے سرور میں یا شاہ کی بات پہ غور کرتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا یا وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اپنی بات سے شروع کرے؟۔ ظہوری شاہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے پھر اسے جھجھکے

”شایان جی! آپ کو ماشاء اللہ کس چیز کی کمی ہے۔ جو زانچہ بنوانے کی سوچھی۔؟“

”شاہ جی! جیسے ہر خوبصورت چیز کے پیچھے کوئی نہ کوئی بد صورتی چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ طرح ہر امیر کے ساتھ بھی کہیں غریبی لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ بظاہر خوش اور مطمئن دکھائی

والا چہرہ ہو سکتا ہے کہ اپنی اوٹ میں ناآسودگی اور اضطراب اضمحلال کی کوئی کیفیت رکھتا ہو۔“

ظہوری شاہ تو جیسے کش لے کر دھواں خارج کرنا ہی بھول گیا تھا۔ ناک، منہ کی بجائے کانوں سے دھواں نکلنے لگا، اس کے کانوں سے بات ہی ایسی ٹکرائی تھی۔ ایسے شیشہ بدن سے صفتگو میں ایسی سنگ مرمر کی امید نہ تھی، چرس کے چند کشوں نے نادان سے فلاسفر بنا دیا تھا۔ ایسی بات، ایسی سوچ۔ شاید وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔ بے خودی کے عالم میں شاید شعور کی شعبہ بازیوں، شوریدگیوں منہ ڈھانپ کر کہیں سو جاتی ہیں، لاشعور اور تحت الشعور بیدار ہو جاتا ہے اور پھر وہی بولتا ہے۔ خدشوں، خساروں سے بے خطر، اپنی ہی ہانکتا ہے۔ ایسے ایسے انکشاف اعتراف اور اذکار کرتا ہے جن کی توقع عالم ہوش میں نہیں ہوتی۔۔۔ ظہوری شاہ اپنی حیرت پہ قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”خدا نہ کرے، آپ کو کوئی پریشانی ہو۔۔۔ پھر بھی اگر کوئی ایسی بات ہو تو بے تکلف کہیے، میں ہر ممکن مدد کے لئے حاضر ہوں۔۔۔ اور ہاں، میرے اس پیشے میں رازداری بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ آپ بڑی تسلی اور کھل کھلا کر بات کر سکتے ہیں۔“

”شاہ جی! بچپن میں نہاتے ہوئے میرے ایک حساس عضو پہ پیلے بھرنے کاٹ لیا تھا۔ معمولی بات سمجھتے ہوئے کوئی توجہ نہ دی اور دو اپنی سے بھی کوئی افادہ نہ ہوا۔ چھوٹی سی گلٹی سی بن گئی۔ ڈاکٹر نے لاہور دکھانے کا مشورہ دیا۔ یہاں مختلف علاج، کئی ڈاکٹر بدلے مگر بجائے آرام افاقے کے مسئلہ اور بگڑ گیا۔ پیشاب کے اخراج میں دقت تھی، اب کچھ افادہ ہے مگر متاثرہ جگہ کی نشوونما شروع سے ہی ٹرک گئی تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ آپریشن سے میں ازدواجی زندگی بسر کرنے کا اہل نہیں رہوں گا۔ یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ سال، دو سال انتظار کر لیا جائے تو شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔“

ظہوری شاہ نے بات سن کر اسے ایک تازہ بھرا ہوا سگریٹ پیش کیا، کش لیتے ہی کھانسی کا جودورہ پڑا تو آنسو نکل آئے۔ سگریٹ واپس کرتے ہوئے شایان کہنے لگا۔

”شاہ جی! بس۔۔۔ میرا سر گھومنے لگا ہے۔ میں اس کا عادی نہیں، سادہ سگریٹ بھی کبھی فضل کے طور پہ پی لیتا ہوں۔“ لوڈ شیڈنگ سے جیسے ایک دم اندھیرا چھا جاتا ہے، اسی طرح ہنسا مسکراتا یہ ماحول بھی اداسی کے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ”شاہ جی! آپ کو ہمدرد اور بزرگ سمجھ کر دل کی یہ بات بتائی ہے۔ ایک بات اور۔۔۔ بچپن میں میری منگنی، ماموں کی بیٹی سے ملے ہو چکی ہے، ہم ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں۔“ کچھ کہتے کہتے وہ پھر خاموش ہو گیا

جیسے کہوں، نہ کہوں کی کیفیت میں مبتلا ہو۔۔۔ ”شاہ جی! ذرا سگریٹ دیں، صرف ایک کش۔۔۔“

انسان بھی کیا چیز ہے۔ عجیب و غریب جانور! گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ، تلوں کی تلو ہاتھ میں ہو تو ہر چیز، ہر خواہش، ہر خواب کانٹا چلا جاتا ہے۔ مستقل مزاج ہو تو دلدل پہ ہر توازن قائم رکھتا ہے۔ اس کے اندر کاپچہ اور بزرگ اسے تنگی کا ناچ بچاتے رہتے ہیں۔ دور میں پانی ڈالو اور پھر ضد کہ پانی نکالو۔ کھلونے کے لئے رو رو آنکھیں سجالینا پھر انہیں توڑ تالیاں بجانا، ریت کی دیواروں پہ بڑے بڑے قلعے تعمیر کرنے پہ کمر بستہ، مضبوط فیصلوں کے آئینہ خانے بنانے کا خواہاں، روشنی میں آنکھیں بند اور اندھیروں میں روزن تلاش کرے پھنے تو پکارے۔۔۔ پہلے ظہوری شاہ نے سگریٹ دیا تو واپس کر دیا، اب خود مانگ رہا تھا۔؟ کوئی پھنسی ہوئی پھانس کو کھینچ کر نکال دیتا ہے۔۔۔ آخر اسے کہتے ہی بنی۔

”شاہ جی! یوں محسوس ہوتا ہے میں اپنی منگیتر کو کھو دوں گا۔۔۔“ انگ انگ کر بولا؟ الفاظ حلق میں مچھلی کانٹا بن گئے ہوں۔۔۔ میں شاید اسی کا شوہر بننے کے قابل رہوں۔۔۔ شاہ جی! میں تو شاید قسمت کے لکھے پہ صبر کر لوں مگر اس کی زندگی برباد ہو جا گی۔ وہ میرے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔۔۔“

بست دیر بعد ظہوری شاہ کو بولنے کا موقع ملا ورنہ وہ تو ”سم“ اس کا ”کھل جاسم سم“ رہا تھا۔ ”آپ کی منگیتر کو ان باتوں کا علم ہے۔۔۔“ ظہوری شاہ نے گریڈا۔

”ظاہر ہے۔۔۔ وہ میری کزن ہے، اس بات سے باخبر ہے لیکن اس تکلیف نے جو صورت اختیار کر لی ہے اس سے وہ ابھی لاعلم ہے۔۔۔“

ظہوری شاہ جیسے کسی نتیجے پہ پہنچ چکا تھا، پھیکے سے مسکراتے ہوئے اس نے تسلی دینے ”شایان صاحب! میں سب کچھ سمجھ گیا، آپ مطمئن رہیں انشاء اللہ! سب ٹھیک ہو جائے آپ نے جو کچھ مجھے بتایا ہے، کسی اور سے اس کا ذکر نہ کریں۔ میں جو کچھ بھی کر سکتا ہوں کروں گا۔ میں اس ضمن میں اپنے دوست حکیم جمالی صاحب سے بھی مشورہ کروں گا جو امراض اور معاملات میں بڑے سائنے اور تجربہ کار ہیں۔ ان کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے، اللہ بڑی رازداری سے سب کام ہو جائے گا۔۔۔“

”اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ آپ میرا مکمل زانچہ تیار کریں۔۔۔ مجھے یقین ہے میری پریشانی دور کر سکتے ہیں، میں آپ کی ہر طرح کی خدمت کے لئے تیار ہوں۔ یہ نیل کٹھن اب پوری طرح ظہوری شاہ کے جال میں بیٹھ چکا ہے۔“

شایان کے رخصت ہوتے ہی ظہوری شاہ نے ٹیلی فون پر حکیم جمالی سے رابطہ قائم کیا، معلوم ہوا کہ وہ ڈیرے پر کچھ دوائیں تیار کرنے گیا ہوا ہے۔۔۔ کوسٹر کے زائچے اور شایان سے وہ کافی سرکھپائی کر چکا تھا، طبیعت بو جھل بو جھل سی محسوس ہو رہی تھی۔ موڈ کا رنگ بدلنے کی نیت سے وہ سوڈیوال روانہ ہو گیا، ڈیرے پہنچ کر معلوم ہوا کہ حکیم جمالی حاجی رجب بیگم کے ہاں دھرا ہوا ہے، ادھر گیا تو کمرے کی فضاء اشتہا انگیز کھانوں کی مہک سے لبریز تھی۔ فرشی دسترخوان پہ، بریانی، شامی کباب، تلی ہوئی مچھلی، تورمہ اپنی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ یہ منظر دیکھتے ہی اس کی بھوک چمک اٹھی۔ حاجی رجب بیگم نے جی بسم اللہ کہتے ہوئے استقبال کیا، حسب دستور بلائیں لیں اور دعائیں دے کر اپنے پاس بٹھایا۔ حکیم جمالی اس سے نظریں چرا رہا تھا، ظہوری شاہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”حکیم صاحب! آج اکیلے اکیلے ہی کھانا کھانے چلے آئے، یاروں کا کھانا پینا اکٹھے ہی اچھا لگتا ہے۔۔۔“

حکیم جمالی اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”سرکار! میں کسی باقاعدہ پروگرام کے تحت یہاں نہیں آیا تھا۔ رات یہاں کچھ مرکبات پخت ہونے کے لئے رکھوائے تھے، سو آج یہاں پہنچا تو حاجی صاحب نے کھانے میں شامل ہونے کا حکم دیا اور آپ جانتے ہیں، ان کا حکم ٹالا نہیں جاسکتا۔۔۔“ پھر وہ شامی کباب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ذرا چکھیں اور خدا لگتی کہیں، ایسے لذیذ خستہ شامی آپ نے کہیں اور کھائے ہیں۔۔۔؟“

حاجی رجب بیگم نے ہری مرچ، لہسن اور ہرے دھنیے کی چٹنی بڑھاتے ہوئے ترغیب دی۔ ”ذرا اس کے ساتھ تناول فرمائیے۔۔۔ صدقے جاؤں، لذت کام و دہن تنبورے کی طرح تنگ نہ لگے تو رتی کو رتی نہ کہیں گے۔۔۔“

اب ظہوری شاہ کی باری تھی۔ کہنے لگا۔ ”سچی بات تو یہ ہے، حاجی صاحب! جو لطف

ولذت اور نفاست آپ کے دسترخوان پہ ہے، اس کی نظیر کم از کم لاہور میں تو نہیں ملتی۔  
حکیم جمالی نے گرہ لگائی۔ ”اور جو رکھ رکھاؤ اور سجاو، قربانہ اور کھلانے پلانے  
ذوق آپ کے ہاں ہے وہ اس دور بے سواد میں ناپید ہے۔“

حاجی صاحب آداب بجالاتے ہوئے بولے۔ ”اے حضور! قربان، صدقہ واری،  
کس کالج کی؟ یہ تو پڑھکوں کے پیروں کا صدقہ ہے۔۔۔ باوا حضور کے نعمت خانے میں رام  
کے شاہی باورچی استاد کالو رام پوری بگھار لگاتے تھے، وہ یکتا ہنرمند اب کہاں۔۔۔ اب تو  
بھڑ بھونچے، پانی نمائش کے ٹکٹے میں اہلی بوٹیاں ڈال کر قورے کا نام دے دیتے ہیں۔۔۔  
جانیں اور ک کا سواد؟۔۔۔ جانقل جاوتری، لوگ لالچی، کاجو کشمش، زیرہ زعفران، کستر  
کیوڑہ، سوئڈ سوئف، ماجو مکڑہ۔۔۔ کانگڑے کاوہ زرد روغن، ڈیرہ دونی باسستی چاول۔۔۔ ہائے  
کون ہے جو ان نعمتوں کو جانے پہچانے، ان کے خواص استعمال کو سمجھے۔ اب نہ وہ پکارتے  
رہے اور نہ وہ کھانے والے۔۔۔“

”سبحان اللہ کیا سچی تصویر کھینچی ہے آپ نے۔۔۔ سبحان اللہ!“ حکیم جمالی نے برائے  
لقہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

تیسری مرتبہ۔ ”سبحان اللہ“ حاجی صاحب کے منہ سے نکلا کہ دروازے پہ شایان اور  
عامل ظہوری شاہ کا ملازم ہاتھ میں رقعہ لیے کھڑا تھا۔ حاجی رچی بیگم کپکپاتی ٹانگوں سے اس  
کے لئے اٹھے۔

”میں قربان، میری جان! دل مارو شن، چشم ماشا۔۔۔ اونٹنڈو! اٹھو، گل پاشی کرو۔  
چاندنی، اے نازو، گلبدن! آگے بڑھو، چوکھٹ پہ تیل ماندن کرو۔۔۔“

محفل میں جیسے کھلبلی سی مچ گئی۔ ظہوری شاہ نے بڑے تپاک سے گلے لگایا۔ کرب  
موجودہ مورتوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ رعنائی، نزاکت، وقار و تمکنت کا ایسا حسین و  
پیکر کہ کیا کوئی دیکھے، کیا کوئی سنے۔ وہاں موجود بزم خود پری چہرہ، نازک روؤں، عشوہ طراز  
شیشہ بدنوں نے عالم محویت میں ”ہائے اللہ“ کی چھریوں سے اپنے دست حسرت و غم  
ڈالے۔ حاجی صاحب تو جیسے باؤلے ہو گئے تھے، کچھ سمجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کریں؟

نیا دسترخوان بچھانے کا حکم دیا۔ ہڑبونگ سی مچی ہوئی تھی۔ دوسرے کمرؤں سے کواڈر  
اوٹ، چلمنوں کے پیچھے، کئی مورتیں، نمکنی لگائے، حسرت بھری نظریں بجائے اس پری  
دیدار کر رہی تھیں اور شایان بے چارہ عالم بے چارگی میں کوبنا کھڑا تھا، اس کی سمجھ میں  
آ رہا تھا کہ وہ کہاں پھنس گیا ہے۔ وہ کونسلر صاحب کا ایک بہت ضروری پیغام لایا تھا۔

لفٹ دینے کی خاطر یہاں پہنچا تھا، اسے کیا خبر تھی کہ اس کے ساتھ ادھر یہ حشر ہوگا۔۔۔ حاجی  
صاحب نے اسے حکیم جمالی اور ظہوری شاہ کے ساتھ بٹھایا اور بریانی کا پہلا نوالہ بسم اللہ پڑھتے  
ہوئے شایان کے منہ میں رکھا۔ پھر چار و ناچار اسے بہت کچھ کھانا پڑا۔ کھانا پینا تمام ہوا تو موقع  
محل کی مناسبت سے ناچ گانے کا اہتمام ہونے لگا۔ مورتیں تیار ی میں جت گئیں۔ اسی دوران  
ظہوری شاہ نے بڑے اچھے انداز میں حکیم جمالی سے شایان کا تعارف بھی کرا دیا۔ حاجی صاحب  
تو پہلے ہی دو چار بار رسمی طور پر مل چکے تھے، کئی مہر اس ملاقات سے لگ گئی۔۔۔

مغرب کی نماز تک محفل جمی رہی۔ رقص و سرور کی اس محفل سے شایان بڑا لطف اندوز  
ہوا، ناز و نیرانے وہ رنگ جمایا کہ واہ واہ کر اٹھا، کئی بار اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود  
”باندھ تھکھرو میرا ناچی“ نرت کر رہا ہو۔ ردھم، تال، ستم، یہ اس پاؤں خود بخود تھرکنے کے لئے  
بے چین ہو جاتے۔ شاید اس کی یہ کیفیت، ان قیامت کی نظر رکھنے والوں سے پوشیدہ نہ رہی  
تھی۔ واپسی پر حاجی صاحب نے پیشانی چومتے ہوئے گورو گوتمہ کے گڑ کی بھیلی چٹائی اور ایک  
اشرفی قیمتی کشمیری شال کے پلو سے باندھ کر اس کے شانے پہ ڈال کر دعاؤں کے ساتھ رخصت  
کیا۔ مغرب کے بعد اس نے یوشن کے لئے جانا تھا۔

فرصت نصیب ہوئی تو یہ تینوں کشمیری چائے کے گرد بیٹھ گئے۔ کئی دنوں سے ان کے  
مابین بابائیں، بگائیاں کے عرس کی بابت بات چیت چل رہی تھی۔ اتفاق سے آج یہ تینوں اکٹھے  
تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حاجی صاحب نے اس موضوع پہ گفتگو چھیڑ دی۔ مزار پہ  
بجلی، نلکا لگ چکا تھا۔ ارد گرد کی جگہ صاف کر کے پڑ پودے بھی جمادیئے گئے تھے، شہتوت کے  
بڑے بڑے جھنڈا ابھی لہرا رہا تھا۔ ظاہر ہے، یہ سارے مصارف حکیم جمالی کی جیب خاص سے نکلے  
تھے۔ عرس کے انتظامات اور دیگر اٹھنے والے سارے صرفے بھی حکیم صاحب نے اپنے ذمے  
لئے۔ عرس میں پاکستان، ہندوستان کے تمام چیدہ چیدہ ہجرا منڈلیوں برادر یوں کو مدعو کرنے کا  
بروگرام طے ہوا۔ آخری دن اختتام پہ حاجی صاحب کو طولانی کٹ پہنانے کی رسم، کھانا پینا،  
مہمانوں کے قیام و آرام، ہر پہلو پہ بات ہوئی۔ مشاورت ختم ہوئی تو حاجی صاحب نے شایان  
خوش ہنر جمل کا ذکر چھیڑ دیا۔

”میں قربان، جمالی صاحب! ناچنے بڑے بڑے فرخندہ ہنر مند اور ناہید خصال دیکھے ہیں مگر  
اللہ قسم شایان جیسا نادر و نایاب آج تک نظر سے نہیں گزرا۔۔۔ وہ آنکھوں اور ہاتھوں  
سے اس کی تصویر کھینچنے لگا۔

”نیلے سمندر سے گہرے نیل، گلاب کی، ہنکھریوں ایسے یا قوتی لب، ننھے ننھے گڑھوں

والے شبابی عارض، صراحی جیسی گردن، سچے موتیوں کی مانند تابدادانت، سانچے میں ڈھ موی بدن، معصوم ادائیں، ناز و نزاکت، اللہ! کس کس کی تعریف کروں۔ پگ میں باندھ، سچ دھج سامنے آجائے تو قیامت سے پہلے قیامت نہ ٹوٹے تو بندی کا نام بدل دیں۔ حکیم جمالی نے سانس لینے کا موقع دیا، بولا۔ ”واقعی حسین لڑکا ہے، نرم و نازک۔ تعریف کی جائے کم ہے۔“

حاجی صاحب جھٹ لپکے۔ ”ماشاء اللہ! ناچیز کی نگاہ کہتی ہے کہ اسے ناچ گانے سے؛ آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ وہ کیسا محفوظ ہو رہا تھا، کیسے پر جوش انداز میں داد دیتا تھا۔“ تعریف کرتے کرتے وہ کچھ دیر مراقبہ میں چلے گئے، کچھ دیر بعد سر اٹھا کر ٹھہرے لہجے میں عامل ظہوری شاہ سے مخاطب ہوئے۔ ”شاہ صاحب! میں قربان واری۔۔۔ میں تو یہ سمجھوں کہ اس کے ستارے، ہم ”جتنی سنی“ لوگوں سے ملتے ہیں۔ ذرا اس کے ستارے ملاحظہ کیجئے گا۔“

ظہوری شاہ نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ملایا اور رخصت کی اجازت چاہی۔ حکیم جمالی کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے۔ پچھلے دروازے سے بابا بنگاٹانی کے مزار پر آگیا۔ ملنگ بیٹھے بھگت کر رہے تھے۔ کچھ دیر وہ دونوں عرس کے انتظامات اور دیگر مسام گفتگو کرتے رہے، بھنگ سردائی چکھی اور وہاں سے ڈیرے پہ آگئے۔ کچھ ملازم کشتوا دواؤں کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ یہ اپنی باتوں کی پٹاری کھول کر بیٹھ گئے۔

موضوع خن شایان کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

زندگی کرنے کا یارو یہ بھی اک دستور ہے  
وہ میرے امکان میں ہے پھر بھی مجھ سے دور ہے

☆☆☆

”شمس، مس عاشری کے لئے چکنی مچھلی بنی ہوئی تھی۔ جو دسترس میں ہوتے ہو۔ گرفت میں نہیں آتی۔ بڑی اور چھوٹی بہن کا رشتہ دن بہ دن بڑا مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بہت خیال رکھتی تھی۔ کھانا، پلانا، نہلانا، سلاتنا۔۔۔ بہت کم اسے اکیلا چھوڑتی، اس کی کے لئے بہت ساسان تھا۔ کھیلتی، کھاتی، پیتی، میوزک سنتی اور دوا پی کر سو جاتی۔ نہ کبھی اداس ہوئی یا ضد کی۔ فرمانبردار اور معصوم سی۔۔۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے حکیم جمالی نے اسے بالکل بکری بنا دیا ہے، بچہ بنا دیا ہے۔ کبھی عجیب عجیب سی فرمائشیں کرنے لگی تھیں مجھے گڑیا چاہیے، میں اس کا بیاہ کروں گی۔ آپ گڈے والی بن جائیں۔ کبھی کھلونے ما

چکنی چوہا، دی بلونے کی مدہانی، رنگین گوٹے والے کپڑوں کی کترینیں، چھوٹے چھوٹے زیور۔ سبھی سبھی عاشری اس کی فرمائشیں پوری کرنے سے عاجز آ جاتی، روٹھ جاتی تو وہ منانے بیٹھ جاتی۔ کھانا سامنے دھرا رہتا اور وہ ویڈیو، ٹیلی ویژن پہ کارٹون کی ضد کرتی، دن بہ دن اس کا بچپنا اور البہین جیسے جوان ہوتا جا رہا ہو۔ اس کی یہ کیفیت دیکھتے ہوئے مس عاشری نے عامل ظہوری شاہ کو بلایا اور ساری ”رودادِ الم“ اسے کہہ سنائی۔ اس نے بڑے انہماک سے ساری بات سنی، بڑا گہرا غور و خوض کرنے کے بعد بولا۔

”میرا خیال ہے، اس کی یادداشت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ اس کا ذہن ماضی کی جانب سفر کرتے ہوئے، بچپن کی حدود میں ٹھہر گیا ہے۔“

”شاہ جی! بیس ایکس برس کی جوان لڑکی تین چار برس کی بچی کا ذہن۔۔۔ یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔ دیکھیں نا! میں اب اپنے کام دھندے کو چھوڑ کر اس کے ساتھ گڈی گڈے کا بیاہ رچانے سے تو رہی۔۔۔“ وہ بڑی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ”پہلے ہی بہت رقم خرچ کر چکی ہوں، مجھے تو اب یہ دکھائی دے رہا ہے کہ اس ننھی بچی کی تعلیم و تربیت پہ مزید خرچ بھی کرنا پڑے گا اور جب یہ ذہنی طور پر اٹھارہ برس کی ہوگی تو جسم عمر سے بوڑھی ٹھہر ہوگئی ہوگی۔ یہ سراسر سردردی اور گھٹانے کا سودا ہے۔“

مس عاشری کی یہ توجیہ سن کر ظہوری شاہ ہلکے سے مسکرا دیا۔

”میں مصیبت میں پڑی ہوں او آپ ہنس رہے ہیں۔۔۔؟“ وہ خفگی کا اظہار کرتے ہوئے ناراض سی دکھائی دینے لگی۔

”بھئی، ہنس نہیں رہا، صرف مسکرا رہا ہوں۔۔۔ ہنسنے اور مسکرانے کا فرق تو آپ جانتی ہیں۔۔۔؟“

وہ بھی ہنس دی، پھر التجا بھرے انداز میں کہنے لگی۔ ”شاہ جی! آپ ذرا اسے مل لیں۔ اس کی حالت دیکھ لیں، بات چیت کریں، اس کا ہاتھ دھیں اور پلینز پھر کوئی حل نکالیں۔۔۔ اس کی تھوڑی سی بھی حالت درست ہو جائے۔ تو اسے کہیں نہ کہیں نکالنے میں دیر نہیں کروں گی۔ بلکہ ایک دو پیئڈو آسمائیاں موجود ہیں۔ جن سے خاصی رقم نکلائی جاسکتی ہے۔۔۔“

وہ دونوں جب اس کے کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوئے تو وہ پلنگ پہ آلتی پالتی مارے، بڑے چاؤ اور اطمینان سے اپنی گڑیا کا بناؤ سنگھار کر رہی تھی۔ اس کے سر پہ آن کھڑے ہوئے تب بھی اس کی محویت نہ ٹوٹی۔ آگے بڑھ کر مس عاشری اس کی گڑیا کا گھونگھٹ درست کرتے ہوئے بولی۔

”شمس رانی! دیکھو تو کون آئے ہیں۔۔۔ یہ تمہارے پیارے ابو ہیں۔“

وہ گڑیا چھوڑ اپنے ابو کو بٹ بٹ دیکھنے لگی۔ اچانک وہ اسپرنگ کی مانند اچھلی اور ”میرے ابو آئے، میرے ابو آئے“ کہتی ہوئی ظہوری شاہ سے لپٹ گئی۔ ابو کے لفظ اور رشتے نے ظہوری شاہ کے کانوں میں توپ کا دھماکا تو کر دیا لیکن اس کا اس طرح سینے سے چٹنا ایسے لگا جیسے بجلی کی تاروں کی لپیٹ میں آگیا ہو۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ سنہلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ پہلے رات حکیم بھالی کے ڈیرے، اجتماعی زیادتی کے شغل میں یہ بھی تو اس سے لپٹا رہا تھا۔ اس لپٹ اور اس لپٹ میں کچھ نمایاں فرق بھی تھا۔ وہاں وہ اسے محض عورت سمجھ کر لپٹا تھا اور یہ یہاں اسے ابو کہہ کر لپٹی تھی۔ یہ دھماکا اسی لپٹا لپٹی کا رد عمل تھا۔ اسے گمان تک نہ تھا کہ وہ اسے اب تک کہہ دے گی۔۔۔ ہلکی سی ضمیر کی بیداری کو اس نے شیطنت بھری مسکراہٹ کی بو بھل میں دبا دیا۔ بات تو حیا، غیرت اور ضمیر کی ہوتی ہے اور یہ صفتیں رزق حلال اور خوف اللہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ پانی ہی ناپاک اور گندلا ہو تو چائے، چینی کی لذت اور مہک پیدا کرے گی۔ احساں کی باریکیوں، جذبوں کی پاکیزگیوں اور حقیقتوں کی سچائیوں کے منکر یہ بے غم و نظر پتھر دل کے جانیں کہ رگ گل صرف اک نظر سہو سے بھی ریشہ ریشہ ہو سکتی ہے، انسان اور اس کا دل، پھر بھی بڑی چیز ہے۔۔۔ بادل خواستہ اسے علیحدہ کرتے ہوئے پلنگ پہ بٹھایا، پاس پٹی پہ بیٹھے ہوئے بڑے دلار سے پوچھا۔

”کیا حال ہے، میری بے بی کا۔۔۔؟“

”ہم اچھے ہیں، باجی ہمارا بہت خیال رکھتی ہیں۔ کھلونے اور اچھی اچھی چیزیں لا کر دی ہیں۔“ پھر روٹھتے ہوئے منہ پھلا کر شکایت سی کرنے لگی۔ ”ہم باجی سے تھوڑے۔۔۔ ناراض بھی ہیں۔ یہ ہمیں پارک میں سیر کرانے اور برگر کھلانے نہیں لے جاتیں۔۔۔“

”بھئی، باجی تمہاری بہت مصروف رہتی ہیں۔ ہم لے کر جائیں گے اپنی بے بی کو اوٹافیاں، آئس کریم، برگر کھلائیں گے۔۔۔ شاباش! چلو تیار ہو جاؤ۔۔۔“

”اچھا۔۔۔“ وہ تالیاں بجانے لگی۔ ”باجی! مجھے جلدی سے نئے کپڑے پہناؤ، بال بناؤ، ہم ابو کے ساتھ پارک جائیں گے، آئس کریم کھائیں گے۔۔۔“

مس عاشی، باپ بیٹی کا تماشا دیکھ رہی تھی، بولی۔ ”اچھا، تم جلدی سے نہالو۔ میں تمہارے کپڑے تیار کرتی ہوں۔“

وہ بھاگ کر غسل خانے میں تھس گئی، یہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ م

عاشی سگریٹ سلگاتے ہوئے کہنے لگی۔

”دیکھ لیا، شاہ جی۔۔۔؟“

”ہاں، دیکھ لیا۔۔۔ اور سن بھی لیا۔“ وہ قدرے خفا ہوتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”مس عاشی! تم نے میرا اور اس کا جو رشتہ قائم کیا ہے۔ اس کو میں کیا سمجھوں؟ کم از کم تم سے مجھے یہ امید نہ تھی۔ تم سب کچھ جانتی بھی ہو اس کے باوجود۔۔۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟“

وہ معذرت بھرے لہجے میں شرمندہ سی ہو کر کہنے لگی۔ ”شاہ جی! بخدا، یہ سب کچھ بوکھلاہٹ اور غیر ارادی طور پر سرزد ہو گیا۔ اس وقت اچانک میرے منہ سے نکل گیا، بعد میں مجھے شدت سے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔۔۔ میں عرض کر رہی تھی ”شاہ جی! آپ نے اس کی یہ حالت ملاحظہ کر لی۔ مجھے تو لگتا ہے، میری رقم ڈوب گئی۔“

”ابھی میں مایوس نہیں ہوا، میڈم! جو کچھ میں نے دیکھا ہے، یہ کچھ حوصلہ افزا نہیں ہے پھر بھی ہمیں انتظار اور صبر سے کام لینا ہو گا۔ ایک بات میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس کے ستارے تمہارے حق میں فی الحال کچھ اچھی پوزیشن میں نہیں ہیں۔۔۔“

وہ شمس کے لئے الماری سے کپڑے نکالتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”شاہ جی! یہ ستارے اپنے راستے بدل بھی سکتے ہیں یا۔۔۔؟“

”بالکل، یہ اپنے راستے اور برج بدلتے رہتے ہیں۔ اسی لئے تو صبر اور انتظار کے لئے مشورہ دیا ہے۔۔۔“ ظہوری شاہ نے جواب دیا۔

”باجی! میں نہا چکی۔۔۔“

دونوں کی نظریں ہاتھ روم کی جانب انھیں تو سوکھے کاٹھ کی مانند انھیں جیسے آگ سی لگ گئی۔ آنکھیں، پلکیں، ابرو، ان کے جسم جیسے حیرت اور اچنبھے کی تمازت سے جھلس گئے۔ وہ بے دھڑک غمخانی کے دروازے پہ مونا لیزا سی مسکراہٹ لئے کھڑی تھی۔۔۔ حیرت شاید وقت کے قہم جانے کا نام ہے۔ لمحے ہوں یا صدیاں، حیرت کی کیفیت، رواں آب جو پہ جہی ہوئی جلد و ساکت سبز کالی کی طرح ہوتی ہے۔ وہ دونوں منہ کھولے، پھٹی پھٹی آنکھوں سے حیرت کی تصویر بنے اس ”وینس“ کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ”صوم بچوں کا“ مانند اٹھلاتی ہوئی ان کے قریب آگئی۔ عورت کیسی بھی ہو، مستور ہو تو دیو ی لگتی ہے اور لباس سے بے نیاز ہو تو ذوق جمل کو مجروح کرتی ہے۔ اس روپ کو دیکھ کر ان بد روحوں کو بھی تریلی سی آگئی، دماغ مفلوج سے تھے۔ جانے مس عاشی کو کہاں سے عقل آگئی، جلدی جلدی سے اٹلے سیدھے کپڑے پہنائے اور پھر سنگار میز کے آگے بٹھا کر دونوں دوسرے کمرے میں آگئے۔

”شاہ جی! خدا کے لئے فوری طور پہ کچھ کریں، مجھے تو یہ معاملہ مزید بگڑتا ہوا دکھائی دے رہا



”میڈم! آپ کئی بار کہہ چکی ہیں اور میں بھی کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت اس سے ستارے صبح راستے پہ نہیں ہیں۔ میں اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ سکتا ہوں مگر اس کا مکمل زائچہ تیار نہیں کر سکتا۔ جمع، تفریق، تقسیم کے لئے اعداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ نام، والدہ کا نام، تاریخ پیدائش، بنیادی چیزیں ہیں جن میں سے ایک بھی موجود نہیں، محض ہاتھ کے پرنٹ سے مکمل اور صحیح زائچہ نہیں بن سکتا۔ ہاں، سفلی ذرائع سے کچھ ہو سکتا ہے مگر اس کے لئے بھی مجھے اس کے تالو کے بال چاہیں، اس کے ایام کے خون سے نقش لکھنا پڑے گا، نتیجے کی گارنٹی پھر بھی نہیں دے سکتا۔ یہ بھی صرف کوشش ہوگی لیکن ہم یہ ساری سروردی مول کیوں لیں، ہمیں کالے کتے نے کاٹا ہے؟۔۔۔ کسی سے پیسے کھرے کر کے آگے بڑھا دیں یا جیسے حکیم صاحب نے کہا ہے، رقم واپس لے کر مال ان کے سپرد کر دیں۔ قصہ ختم۔۔۔“

شکاری اپنا دام بچھا چکا تھا۔ دانہ پانی تیار تھا، بس شکار پھسنے کی دیر تھی۔

میڈم بولی۔ ”حکیم صاحب! آپ فرمائیں۔۔۔؟“

”میڈم! پہلے بھی عرض کیا ہے۔۔۔ آپس داری کی بات ہے، آپ اپنی رقم واپس لے لیں اور لڑکی واپس کر دیں۔ میں جانوں اور لڑکی۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں اور نہ ہی کوئی رسک لیں۔“

”رقم کا مسئلہ اتنا اہم نہیں، اہم یہ بات ہے کہ اس کا کیا ہوگا۔۔۔ نہ جانے کیوں مجھے اس سے ہمدردی اور انس سا ہو گیا ہے۔ مجھے رقم ملے یا نہ ملے، میں چاہتی ہوں کہ یہ بیماری جو بھوک چکی ہے وہی اس کی بربادی کے لئے کافی ہے۔ مزید یہ کہیں خراب نہ ہو۔۔۔“

حکیم جمالی نے جواب دیا۔ ”پھر آپ ہی اس کا کوئی حل اپنے ذہن رسا سے نکالیں۔“

مس عاشی، حکیم جمالی کو ٹٹولتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”اچھا، یہ بتائیں کہ اگر یہ لڑکی آپ کو واپس کر دی جاتی ہے تو اس کا کیا کریں گے۔۔۔؟“

بغیر سوچے سمجھے اس نے جواب دیا۔ ”کرنا کیا ہے، وہی ہوگا۔ جو اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ اس قسم کی منشیات کی عادی لڑکیاں جو گھر بار سے فارغ ہوں، بھلا اور کس مصرف کی رہ جاتی ہیں۔۔۔ دوست یا ر چار دن عیش کریں گے۔ پھر کہیں آگے شلادیں گے۔۔۔ ہم سب اس ملام میں ننگے ہیں، سب ہی مجرم ہیں، فرق صرف نوعیت کا ہے۔ اب میں اس سے شادی کرنے سے تو رہا، بہن بیٹی کی جگہ تو نہیں دے سکتا۔۔۔“

مس عاشی تلخ تنہا جواب پاکر ٹھنڈی ٹھار ہو چکی تھی۔ عامل ظہوری شاہ مسکرایا، بولا۔

”یار، حکیم! بہن بیٹی اگر نہیں بن سکتی تو بیوی تو بن سکتی ہے۔ لوگ طوائفوں سے بھی تو

خفیہ وسائل سے اس کی مکمل نگرانی کی ہے، اس معروضے کو خارج از بحث سمجھیں۔۔۔“

عامل ظہوری شاہ کے اندازے کے مطابق اب وہ وقت آگیا تھا۔ جس کا اسے انتظار! اس کے علم یا خیال کے مطابق یہ لڑکی اس کے لئے بڑی سعد تھی، اس کے لئے وہ اپنے دل ایک نرم گوشہ محسوس کرتا تھا۔ جسے شاید کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ محبت، ہمدردی، غم، محض؟۔۔۔“ ویسے تو کچھ بڑی مس عاشی نے بھی دھری ہوئی تھی جس کے بارے میں یقین کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کچھ یا نہ کچھ لیکن جمالی کا مچھلی پلاؤ تقریباً ”تیار تھا، بس قاب نکالنے کی دیر تھی۔ نکالنے کے لئے وہ ہاتھ کس اور کے استعمال کرنا چاہتا تھا اور یہ ہاتھ جمالی اور مس عاشی کے ہی ہو سکتے ہیں۔۔۔ خاموشی، گہری دھند کی مانند چھائی ہوئی تھی۔ سگریٹ پھونکنے کے ساتھ ساتھ اس مسئلے کے جوہر میں اترے ہوئے، سوچوں کے سنگھاڑ کی جڑوں سے اچھے ہوئے تھے۔ تینوں ہی کی کوشش تھی کہ کوئی قابل قبول حل کا نول لگ جائے۔“

”کیا سوچ رہے ہیں حکیم صاحب؟“

میڈم کی آواز اس خاموشی میں ابھری تو حسب عادت داڑھی کھجاتے ہوئے حکیم صا بولے۔

”اس کا حل سوچ رہا ہوں۔۔۔ اس کی موجودہ حالت ہمارے لئے پریشانیاں پیدا کر رہی ہے، اسے باہر نکالا نہیں جاسکتا، یقیناً اس کی گمشدگی کی رپوٹ کسی تھانے چوکی میں بھی؟“

لواحقین بھی تلاش میں سرگرداں ہوں گے۔ یہ ایک نفسیاتی اور منشیاتی کیس ہے، کسی ڈا اسپتال دکھانا بھی رسک ہے مگر اندر بھی اسے لمبے عرصے تک باندھ کر نہیں رکھا جاسکتا۔ قابل عمل اب صرف دو حل ہیں ایک یہ کہ اسے کہیں آگے بڑھا دیا جائے اور اپنی رقم و کرنی جائے اور دوسرے اسے کسی دیران جگہ لے جا کر چھوڑ دیا جائے۔ کوئی استاد قربان مل گیا تو پھر ہمارے جیسوں کے کسی اڈے پہ پہنچ جائے گی اور اگر کوئی شریف آدمی مل گیا، دارالامان، اخبار کے دفتری اسپتال، تھانے پہنچ جائے گی۔ اس کے علاوہ اور کوئی حل آپ۔۔۔“

ظہوری شاہ نے اپنی خاموشی توڑی، بولا۔ ”سیدھی سیدھی بات تو یہی ہے جو آپ بتائی ہے، باقی سارے حل رسکی ہیں جو ہم میں سے کوئی بھی نہیں چاہے گا۔“

مس عاشی نے ایک آخری کوشش کے طور پر کہا۔ ”آپ کوئی عمل کریں، یہ معمولی آپ کے لئے کیا مشکل ہے۔۔۔“

شادی کر لیتے ہیں اور یہ تو تم کہہ ہی چکے ہو کہ ہم سب حمام میں ننگے ہیں۔۔۔“

حکیم جمالی بھی تنک بھاگتے گھوڑے پر سوار تھا، اسی لہجے میں بولا۔ ”عامل صاحب! سرے سے رشتوں کا قائل ہی نہیں۔ یہاں ماں تب ماں ہے اگر بیٹا نکلن پسناتا ہے۔ باپ۔ باپ ہے اگر بیٹا نکلاؤ ہے اور بیٹی تب بیٹی ہے اگر حجاب میں ہے اور بیوی! یہ تو پھوکت کار ہے۔ خاوند اگر روٹی ہانڈی، کپڑا، بچہ نہ دے تو بیوی دوسرے روز عدالت چڑھ جاتی ہے۔ آدھ اگر ایسا نہ بھی کرے تو اس کی کوئی مجبوری، معذوری ہوتی ہوگی۔ ماں باپ کی عزت! لہذا دینی تعلیم یا کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے ورنہ باقی سب ایک جیسے ہی ہیں۔ میرے گورو مہار نے مجھے یہی سبق دیا تھا کہ بیٹا! اس سنسار میں سب پیٹ پاپی ہیں، رشتے ناطے سب پیٹ ہیں اور ناری نرکھ کی آگ ہے۔ اسے صرف اتنا چاہو جتنا ظلم میں انگارہ چمکتا ہے، دامن چھپاؤ گے تو بھسم کر دے گی۔ کوئی بندھن ایسا نہیں جو ٹوٹنے کے لئے نہ ہو۔۔۔“ تو سی خاموشی کے بعد وہ شمسہ کے متعلق بات کرتے ہوئے بولا۔ ”ظہوری شاہ تم اسے اپنے کیوں نہیں رکھ لیتے، کوئی بھی رشتہ قائم کر لو۔۔۔“

شکاری، شکار پھانس چکا تھا۔ وہ حالات ہی ایسے پیدا کر چکا تھا کہ حکیم جمالی اور مس نے خود ہی شمسہ اس کے حوالے کر دی، بیس ہزار نقد ادا کر کے اسی شام اس نے جعلی نکاح تیار کر دیا اور شمسہ کو اپنے فلیٹ پہ لے آیا۔

☆☆☆

نہیں تارا کئی دنوں سے شلیان کی راہ دیکھ رہی تھی۔ پانچ روز بعد جمعہ کے دن اس کی اٹھارویں سالگرہ تھی، یہی دن شلیان کی سالگرہ کا بھی تھا۔ دونوں نے ایک ہی دن، دو گھنٹے کے وقفے سے جنم لیا تھا، یعنی وہ صرف ایک سو بیس منٹ میں تارا سے بڑا تھا۔ بارہ تیرہ برس سے دونوں اپنی سالگرہ، یہیں، اسی گھر میں مناتے چلے آ رہے تھے۔ شلیان چھ بہنوں کا اکیلا بھائی اور نہیں چار بھائیوں کی آنکھوں کا اکلوتا تارا! وہ پھوپھی زاد، یہ ماموں زاد۔ بچپن بھی اکٹھا گزرا تھا، مستقبل بھی ساتھ ساتھ گزارنے کا وعدہ تھا۔ کھاتے پیتے، کاروباری گھرانے تھے۔ سالگرہ پہ خوب رونق اور دھماچو کڑی ہوتی۔ شیخوپورے سے یہ سارے لاہور آ جاتے۔ اس طرح مل ملا بھی لیتے اور بچوں کی سالگرہ، خوشیاں بھی دیکھ لیتے۔ اب تک ان کے ہاں یہی سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ شلیان کے مستقل لاہور آ جانے سے نہیں تارا کو یہی امید بندھی کہ اب اس کا باقاعدہ آنا جانا لگا رہے گا۔ پچھلے برس، سالگرہ کے موقع پہ وہ نہیں آیا تھا، شاید وہ اپنے علاج کے سلسلے میں مصروف اور پریشان تھا۔ اس کے بغیر سالگرہ کا کیا مزہ آتا؟ اس دن وہ آنسوؤں کی پھلتی ہوئی گرم گرم موم سے تکیے کو بھگوتی رہی، اس کی سوچوں کی کونج اکلاپے کی تنہائی اور دیرانی میں چیخنی چلاتی رہی۔ لاہور میں آدھے گھنٹے کے فاصلے پہ ہونے کے باوجود وہ اس سے بہت دور تھا۔ ٹھیک ہے، وہ مارکیٹ کے معاملات اور پڑھائی یا اپنی بیماری کی وجہ سے مصروف اور پریشان ہو گا مگر ایسا بھی کیا کہ چند لمحوں کے لئے آ بھی نہ سکے اور اصولاً ”تو اسے اپنے ماموں کے ہاں ہی رہنا چاہیے تھا۔ یہاں کوئی اجنبیت یا غیروں والی بات نہیں تھی۔ یہاں سب ہی اس سے محبت اور پیار کرتے تھے۔۔۔ بچپلی بار جب وہ شناختی کارڈ کے فارم دینے آیا تھا تو نہیں ناراض اسے سالگرہ یہاں منانے کی تاکید کر دی تھی۔ اب سالگرہ میں پانچ دن باقی تھے اور شلیان نے ٹیلیفون کیا، نہ کوئی چکر لگایا۔ یہی سوچتے سوچتے، او اس سی وہ ان تحفوں کو دیکھنے لگی۔ جو وہ اس کے لئے لائی تھی۔ اس کی پسندیدہ پرفیوم، امپورٹڈ جوگر، جوگنگ سوٹ اور

امرین روٹھ کاہو۔

بدھ کی شام سخت جس میں اک جاں افزہ تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند وہ آگیا لیکن اجنبی کی مانند پہلی نظر میں اسے کوئی پہچان ہی نہ پایا۔ سیٹ کئے ہوئے بل، مونچھیں غار شمع رنگ کی سلکی شرٹ، آف وائٹ پینٹ، بدلا بدلا سا چہرہ۔ ہمار کی رت میں خوشبودر بوجھل کسی مست خرام جھونکے کی مانند۔ سب اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ منہ سے کوئی کیا اندر ہی اندر سب ہی اک عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھے۔ مونچھیں منڈھوانے سے منڈھوانے ماش کی دال کی مانند سفید ملائم ملوک سا نکل آیا تھا۔ قدرتی آپس میں ملے ہوئے موچے سے چن کر علیحدہ کر دیئے گئے تھے، چہرے پہ نامعلوم سامیک اپ صاف نظر آ رہا تھا توڑی دیر وہ مہمانی کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا اور مہمانی باتیں تو کیا کر رہی تھی، بیٹ بٹ کے زنانوں جیسے چلے کو دیکھ دیکھ کر اندر اندر ہی کڑھ رہی تھی۔ چائے پانی کے بعد نین اسے لاؤنج میں گھسیٹ لائی اور چھوٹے ہی بولی۔ ”میں تم سے بہت ناراض ہوں۔“

”بالکل ٹھیک۔۔۔ اگر تم ناراض نہ ہو تیں تو میں تمہاری اس حماقت پہ تم سے ناراض جاتا۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

”مطلب یہ کہ تمہیں مجھ سے ناراض ہونا چاہیے تھا۔ دیکھو، بلا چھپلی سائے میں غائب تھا، پھر لاہور رہتے ہوئے بھی بہت کم یہاں آیا۔ اب اس سالگرہ پہ بھی میں پریشان کر رہا ہوں۔ تمہیں ناراض ہونے کا پورا پورا حق ہے۔“ وہ سرخم کرتے ہو۔

لگا۔ ”جو چاہو، سزا دو۔ میں واقعی بہت غیر ذمہ دار ہوں۔“

نین تارائے ہلکے سے اس کے بال پکڑ کر اس کا سر اوپر اٹھایا۔ ”مجھے ”لوں“ لگا

کوشش مت کرو، میں سب سمجھتی ہوں۔ لاہور آکر تم بہت بدل گئے ہو اندر سے بھی

سے بھی۔۔۔ فیشن کرنا آگیا ہے، باتیں بتانی آگئی ہیں، لور، ماشاء اللہ ستانا اور تڑپانا بھی۔

وہ اٹھ کر شیشے کے سامنے اپنے بل درست کرنے لگا۔ بولا۔ ”تم نے میرے بل خر دیئے، گویا تم نے مجھے سزا دے دی۔ اب راضی ہو جاؤ اور بتاؤ کہ سالگرہ پہ تمہیں

دوں۔۔۔؟“

”مجھے کسی تجھے کی ضرورت نہیں۔ بس تم اپنا یہ حلیہ درست کرلو، میرے

تخفہ ہوگا۔“

وہ وہیں شیشے کے سامنے کھڑے کھڑے اپنے سر پہ پہ نظر ڈالتے ہوئے پوچھ

”حلیہ۔ کیا ہوا ہے میرے حلیے کو؟۔۔۔ میرا خیال تھا، تم تعریف کرو گی مگر تم الٹا یہ کہہ رہی ہو کہ میرا حلیہ درست نہیں۔۔۔“ ذرا توقف کے بعد پھر کہنے لگا۔ ”لاہور آکر بھی تم پینڈو کی پینڈو ہو۔“

وہ اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”تم نے مونچھیں کیوں صاف کروا دیں، ان کے ساتھ تم کتنے سمارٹ دکھائی دیتے تھے اور یہ ابو بھی درمیان سے اکھاڑ دیئے۔ آپس میں ملے ہوئے ابو تو بڑے نیچرل اور خوش بختی کی علامت ہوتے ہیں اور مرد کے چہرے پہ مونچھیں تو مردانگی کی نشانی ہوتی ہیں۔۔۔“

سیلاب کے ریلے کی زد میں کچی دیوار کی مانند شایان دھب سے صوفے پہ ڈھے گیا۔ لوگوں پہلے کی بشارت، بشرے پہ بسنت کی زردی کی طرح کھڑکی زبان پہ چپ جی اور ٹھوڑی سینے سے نکل گئی۔ مرد چاہے مردانہ صفات سے محروم ہی کیوں نہ ہو، زبان سے اعتراف کرتے ہوئے کتراتا ہے۔۔۔۔۔ مرد۔۔۔۔۔ مرد۔۔۔۔۔ بے ہنگم اور صوتی لحاظ سے بے سرائیہ لفظ ہتھوڑے کی طرح اس کی کنپٹیوں پہ پڑنے لگا۔ سارے جسم کا ہلو کھنچ کر دماغ میں جمع ہو گیا، آنکھوں کا نیلگوں سمندر سرخ ہو گیا۔

ستاروں کا حساب، ریکھا کتاب، زانچہ نصاب دیکھ کر عامل ظہوری شاہ نے پچاس فیصد سے اوپر، کامیابی کی نوید سنا کر اسے حکیم جمالی کے حوالے کر دیا تھا۔ حالات، تفصیلات اور جسمانی معائنے کے بعد حکیم جمالی نے بھی پچاس فیصد سے زیادہ کامیابی کا مرثدہ سنایا تھا۔ شفا منجانب اللہ تعالیٰ اور بندے کی کوشش کو بنیاد بنا کر بیس ہزار صرف ادویات، مقویات، حلویات اور کشتہ جات کا خالی خرچہ ملے پایا۔ محنت معاوضہ، ”حساب دوستان در دل“ کے مطابق رقم کی ادائیگی مرحلہ وار پانچ پانچ ہزار کی چھ اقساط میں ملے پائی۔ ادھر ”حق دوستی“ کے اظہار کے طور پر ٹاپ فلور پہ اپنے فلیٹ کے ساتھ دو کمروں کا فلیٹ بھی بغیر سیکورٹی اور معمولی کرائے پر عامل ظہوری شاہ کو دے دیا، ظہوری یہاں شمسہ کو رکھنا چاہتا تھا۔ عامل ظہوری شاہ اور حکیم جمالی کے دل دلا سوں جسمانی روحانی علاج کی کامیابی کی پوری پوری امید کے باوجود قریباً ”پچاس فیصد ناکامی کے بول کا کائنات اس کے احساس کو ہلو لہان کر رہا تھا۔ دونوں نے صاف صاف پچاس فیصد کامیابی کی امید دلائی تھی لیکن اس کے اندر، بہت اندر کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ پچاس فیصد اوپر کی جانب نہیں جاسکے گا، مایوسیوں اور رسوائیوں کی گہری دھند ہی اسے کوئی واضح راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”کیا ہوا، یہ سر جھکائے کیا سوچ رہے ہو۔۔۔؟“ نین تارا اسے محویت میں ڈوبا ہوا دیکھ کر

پریشان سی پوچھنے لگی۔ ”میری بات بری لگی ہے کیا۔“  
 بجائے منہ سے جواب دینے کے اس نے ”نہیں“ کے انداز میں سر ہلادیا، پھر وہ  
 چونکتے ہوئے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔  
 ”کچھ منہ سے بھی بولو۔ کیا سوچ رہے ہو؟“

اس بار نین تارا نے مسکراتے ہوئے پوچھا، شایان کے لبوں پہ بھی اب پھلکی  
 مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

”تمہارے سوا بھلا میں کیا سوچ سکتا ہوں، میری تو سوچ ہی تم ہو۔“

”باتیں نہ بناؤ۔۔۔ سرد رہے کیا۔۔۔؟“ وہ پھر الجھی۔

”ہاں۔۔۔ تم نے بال پکڑے تھے، درد نے سر کو پکڑ لیا۔“ شایان بولا۔

”اچھا! بابا! مجھے معاف کر دو۔۔۔ میں نے تو تمہارے بالوں کو چھوا تھا، مجھے علم نہیں  
 تم لاہور آ کر ایسے نازک مزاج ہو گئے ہو۔“ پھر وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہارے  
 درد کی گولیاں لاتی ہوں، پھر کچھ دیر یہاں آرام کرو۔ اتنی دیر میں تمہارے لئے کرلیے تیر  
 کرتی ہوں، باقی باتیں کھانے کے بعد ہوں گی۔“

نین تارا کے جاتے ہی جیسے دنیا بھر کے کربلوں کی کڑواہٹ سے کرا بھر گیا ہو۔۔۔  
 بھرے کرلیے جن پہ لمبا سالے میں لت پت الجھا ہوا دھاگا لپیٹا ہوتا ہے، اسے بہت پسند  
 خالی کرلیے کھانا بڑا جی گردے کا کام ہے لیکن قیے، گھی، مرچ سالے اور پکانے والے کی  
 ہنر سے کڑوے تلخ کرلیے بھی لذیذ ترین پکوان بن جاتے ہیں، تلخی، لذت میں تبدیلی،  
 ہے اور اب وہ بھی اپنے احساس محرومی کے نیم چڑھے کرلیے کی تلخی کو کسی گوارہ سی لذت  
 تبدیل کرنے کا خواہاں تھا۔ حکیم جمالی، ظہوری شاہ، مس عاشی، گرو حاجی رجبی بیگم، انہ  
 جیسے ہنرمندوں، صلاح کاروں، قدر دانوں اور ہمدردوں کی رفاقت میں ذاتی طور پر  
 قدرے آسودگی اور دلچسپی کا احساس تو ہوا تھا لیکن دل اور لاشعور میں نین تارا اور  
 چاہت آسیب بن کر چمٹ گئی تھی۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی، اسے اپنی منزل سمجھتی تھی  
 اسے کیا بتانا کہ جسے وہ اپنی منزل سمجھ رہی ہے وہ سراب کے سوا اور کچھ نہیں۔ نین  
 والد، اسکے ماموں، اس کی بہن کا رشتہ بھی مانگ رہے تھے، رضا مندی کا اظہار بھی ہو  
 شاید یہ ”وٹے سٹے“ کی شادیاں اکٹھی ہی کرنا چاہتے تھے۔ اب صرف نین تارا کے  
 کرنے کی دیر تھی۔ مگر گھر والوں کو کون بتانا کہ وہ جو خواب دیکھ رہے ہیں، وہ کبھی پورے  
 ہوں گے۔ اس قسم کی باتیں سوچتے سوچتے وہ پاگل سا ہو جاتا۔ رسوائیوں، بدنامی

اندیشوں کے سپنوں لینے دن رات اس کے احساس کو ڈنکتے رہتے۔ وہ اب جیسے زہریلا سا ہو گیا  
 تھا۔ حالات، وقت اور قسمت کے تیز دھارے میں غرق ہوتے ہوئے ہاتھ پاؤں چلانا فصول  
 سمجھ کر اس نے اپنے آپ کو ہونی کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ حلیہ، طور طریق، اس کے نفسیاتی طور پر  
 بدلتے ہوئے رجحانات کا پیش خیمہ تھا۔ عمر کے اولین عرصے میں جب مردانگی کا احساس کمزور پڑ  
 جاتا ہے تو ناز و ادا کی روائیں در آتی ہیں۔ یہ سب کچھ خود، خود بخود میکا کی انداز میں ہو تا رہتا ہے، خود  
 کو محسوس نہیں ہوتا جبکہ دوسروں کی نظروں سے چھپا نہیں رہتا۔ بالکل ایسے ہی جیسے شایان  
 یہاں اپنے طور پر بڑا سمارٹ اور باوقار جٹلمین بن کر آیا تھا، خود کچھ بھی محسوس نہیں ہوا لیکن  
 دوسروں کی نظر میں آگیا، وہ باوقار مرد دکھائی دینے کے برعکس زنانہ سا عامی لگا۔

کرلیے قیمہ، دسی گھی سے تیلے پرائے، رائیہ، سلاڈ، حلوہ کدو کا میٹھا۔ کھانا بڑا  
 مزیدار تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا، چھوٹے بچوں کی طرح چھوٹے چھوٹے نوالے توڑتا رہا۔ نین  
 تارا شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ وہ یہاں نہیں ہے، ٹوٹتے ہوئے پوچھنے لگی۔  
 ”شاید تمہیں کھانا اچھا نہیں لگا۔۔۔ جلدی میں تیار کیا ہے نا! اور جلدی کا کام ایسا ہی ہوتا  
 ہے۔“

وہ ایک کرلیے سے الجھا ہوا دھاگا اتارتے ہوئے فوراً بولا۔ ”۔۔۔ اور کبھی کبھی دیر سے  
 کرنے والا کام بگڑ بھی جاتا ہے۔۔۔ دیے کھانا ہمیشہ کی طرح لذیذ ہے۔“ وہ کرلیے سے الجھا  
 ہوا دھاگا اتارنے میں اس کی مدد کرتے ہوئے بتانے لگی۔ ”گت کرلیے، پائے، سیویاں اور آم  
 کھانے کے لئے ذوق، اشتہا اور اچھے معدے کے ساتھ ساتھ ہنرمندی کی بھی ضرورت ہوتی  
 ہے۔“

”یہ انکشاف کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔۔۔؟“ وہ پوچھنے لگا۔

”آپ بھی تو بڑے عالمانہ موشگافیاں فرما رہے ہیں۔ میں نے جانا کہ چلو، میں بھی کچھ  
 انکشافات کر کے پڑھی لکھی لگوں۔۔۔ ویسے تمہاری یہ دیر سے کام بگڑ جانے والی بات سمجھ میں  
 نہیں آئی۔۔۔؟“

سلاڈ سے ایک ثابت ہری مرچ منہ میں رکھتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ ”میں نے سنا ہے کہ  
 تمہارے ہمسائے تم سے دلچسپی رکھتے ہیں اور شاید تمہارا رشتہ بھی مانگا ہے۔“

وہ لاپرواہی سے بولی۔ ”ہاں، میں نے بھی سنا ہے لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا۔۔۔؟“  
 ”ممکنی نے سرسری سا ذکر کیا تھا کہ جلدی جلدی تم پر دھائی مکمل کر لو تا کہ تمہاری شادی  
 کر دیں، آئے دن کوئی نہ کوئی منہ اٹھائے جلا آتا ہے۔ اسی ضمن میں ہمسایوں کا ذکر بھی ہوا کہ

انہیں معلوم بھی ہے کہ نین تارا کی مگنی ہو چکی ہے، اس کے باوجود بھی ان کی دلچسپی کم نہ ہوئی۔۔۔۔۔

”ہاں۔۔۔۔۔ دیے بڑے اچھے لوگ ہیں، ان سے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ اللہ اہم سب کو دے۔۔۔۔۔“

”لڑکا کیا کرتا ہے۔ ذات، برادری۔۔۔۔۔؟“  
اس نے ہری مرچ کی سی سی کو ختم کرنے کے لئے پانی کا گلاس منہ بے لگایا۔ تو نین تارا قینچی چلنے لگی۔

”ذات کے راجپوت ہیں، موثروں کا شوروم ہے۔ نام ذوالفقار ہے، کہلا تازلی۔ ایف اے میں چھوڑ دیا تھا۔ شریف لڑکا ہے۔ سگریٹ نہیں پیتا، خوبصورت اور زندہ دل۔ اس کی بہن کی زبانی معلوم ہوا کہ مجھے پسند کرتا ہے۔۔۔۔۔ پھر وہ مسکرا کر اس کی طرف غور دیکھتے ہوئے بولی۔ ”جسم کسرتی اور منہ پہ مونچھیں ہیں۔۔۔۔۔ اور کچھ؟“

وہ بڑے سکون سے بولا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ رشتہ بہت اچھا ہے۔۔۔۔۔ گاڑی شوروم ہے، ذات برادری ایک ہے، گھر پاس اور سب سے بڑی بات کہ اس کی مونچھیں ہیں۔۔۔۔۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ چونکتے ہوئے کہنے لگی۔

”۔۔۔۔۔ وہی، جو تم نے کہا ہے۔۔۔۔۔“ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”میں تو تمہیں ستانے کے لئے کہہ رہی تھی، محض مذاق۔۔۔۔۔“  
وہ بھی اسی لہجے میں بولا۔ ”مگر میں تم سے مذاق نہیں کر رہا، ایسا رشتہ نصیبوں کا ہے۔۔۔۔۔“  
وہ یکبارگی اٹھی، پانی کا جگ چھٹانے سے زمین پہ گرا۔ نین تارا روتی ہوئی باہر نکل شایان بھی چلا آیا۔

\*\*\*

سالگرہ کے روز، نماز جمعہ کے بعد شایان آگیا۔ شیخوپورہ سے اس کے گھر والے آئے تھے۔ اس کے والد کے ایک دوست الیکشن لڑ رہے تھے، اس سلسلے میں وہ مصروف تھے۔ گزری جمعرات وہ گھر شیخوپورہ گیا، تو اس کی والدہ نے اس کے ہاتھ کچھ اور مٹھائی وغیرہ بھجوائی تھی۔ اس نے خود بھی اسٹیشل کیک تیار کروایا تھا غبارے، موم اور دیگر آرائشی سامان لئے جب وہ یہاں پہنچا تو گھر میں کوئی سالگرہ والی گہما گہمی نظر نہ آ

نہی اسے نین تارا دکھائی دی۔ ممانی سے پوچھا، معلوم ہوا کہ وہ دونوں سے اپنے کمرے میں بیمار پڑی ہے۔ دیے پاؤں وہ کمرے میں داخل ہوا تو نین تارا آنکھیں موندھے بے سدھ سی بخار میں پڑ رہی تھی۔ وہ سرہانے کے پاس کھڑا اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ حسن پیار ہوا سو گوار، اپنی ایک انگ سی شان اور جاذبیت رکھتا ہے۔ بوسکی رنگت چہرے پہ پسینے کے تہدار موتیوں کی افشاں، نازک سی ناک کے ننھے ننھے نتھنوں میں کمزور سی سانس کا ارتعاش، بخار کی تپش سے سرخ سے ہونٹوں پہ خفیف سالرزہ۔۔۔۔۔ وہ مہبوت سا کھڑا دیکھ رہا تھا کہ نین تارا نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ کروٹ بدلی اور شایان نے اپنا ہاتھ اس کے ماتھے پہ رکھ دیا۔

”نین! اٹھو۔۔۔۔۔ آج ہماری سالگرہ ہے اور۔۔۔۔۔ اور تم یہاں بستر پہ پڑی ہو۔۔۔۔۔“  
اس نے ہولے سے آنکھیں کھولیں اور اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔  
”یہ بخار کا کیا ڈرامہ ہے۔۔۔۔۔؟“ پلنگ کی پٹی پہ بیٹھتے ہوئے چھیڑنے لگا۔  
پچھلی سی مسکراہٹ کے ساتھ نین تارا کہنے لگی۔ ”ہاں، یہ سب کچھ ڈرامہ ہی تو ہے۔ ہم تم وعدے وفا نہیں، بخار پیار، یہ سب کچھ۔۔۔۔۔“

وہ اس کے ہونٹوں پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اچھا، اچھا زیادہ مت بولو۔۔۔۔۔ اٹھو اور جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں تمہارے لئے بہت سے اچھے اچھے تحفے لے کر آیا ہوں، دیکھو گی تو تمہارا یہ بخار و خار سب اڑ چھو ہو جائے گا۔۔۔۔۔“

وہ بمشکل اٹھ کر پلنگ پہ نیم دراز ہوتے ہوئے اسے کہنے لگی۔ ”مجھ میں ہمت نہیں ہے شایان!۔۔۔۔۔ پلیز، تم یہ سب کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔۔۔۔۔“

”افوہ۔۔۔۔۔“ وہ الجھتے ہوئے بولا۔ ”چھوڑو یہ سب باتیں۔۔۔۔۔ دیکھو، بہت سے کام کرنے والے پڑے ہیں۔ وقت ضائع مت کرو۔۔۔۔۔“ وہ اسے ہمارا دیتے ہوئے زبردستی اٹھانے لگا۔  
”آج میں نے اپنا حلیہ بھی تم سے چیک کروانا ہے۔۔۔۔۔ دیکھو، میری یہ شلوار قمیض، اسٹیشل سالگرہ کے لئے سلوائے ہیں اور آج میں تمہیں ایک سرپرائز دینے والا ہوں، تم بھی کیا یاد کرو گی کہ کبھی ریکس سے پالا پڑا ہے۔۔۔۔۔“

اسے تیار ہونے کا کہہ کر وہ باہر پڑے کمرے میں آگیا۔ ماموں سے ملاقات ہوئی۔ وہ کئی روز کوئٹہ گزار کر آئے تھے۔ بڑی شفقت سے پیش آئے، حال احوال اور پڑھائی کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔ شایان کے لئے ڈرائی فروٹ، بلوچی ٹوپی، واسکٹ لائے تھے۔ آج چھٹی بھی تھی اور سالگرہ بھی۔ گھر کے سب لوگ انتظامات میں جڑے ہوئے تھے۔ نین تارا کی چند قریبی سپیلیاں بھی مدعو تھیں۔ قریبی ہمسایوں کے ہاں سے بھی بچے بالے، لڑکیاں آجاری

پیر کا فیروز اڑ گیا ہو۔ سب اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ حور کی زیبائی، غلام کی رعنائی، دودھ، شید اور میدے کے لمبے سے اگر کوئی صنم گر، کوئی پیکر تخلیق کرتا تو اس سے ماورا کیا ہوتا۔ دید تماشا تمام ہوا تو اس کے کزن نے اپنے دوستوں سے اس کا تعارف کرایا۔ سلمان، عباسی، وحید، شبیر، ندیم اور افتخار زلفی۔ زلفی نے بڑی گرجوشی کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنے بائیں پہلو، صوفے پہ بٹھالیا، اچانک شایان کے منہ سے نکلا۔

آپ نے بھی مجھے بائیں جانب بٹھالیا ہے۔۔۔“

زلفی کے منہ سے بھی جیسے فی البدیہہ ہی نکل گیا۔ ”شایان بھائی! دل اسی جانب دھڑکتا ہے۔۔۔“

”لیکن جگر تو دائیں جانب ہوتا ہے۔“ شایان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

زندگی کی توانائیوں سے لبریز، جوانی کی مسخور کن خوشبودوں سے سرشار، زمستانی سانہر سا خوبصورت جسم، بازوؤں میں پھرتی ہوئی پچھلیاں، گنجان سیاہ بالوں سے بھرا ہوا سینہ، خوبصورت مونچھیں۔ شاہ بلوط کے تنے ایسے زانو، ہنسوتا، زندہ دل باخلاق۔۔۔ نین کو اور کیا چاہیے۔ اس کے اندر چکی سی چلنے لگی۔ سوچ کے قطب کے گرد حقیقت کا بھاڑی پڑو ڈر گھومنے لگا۔ نیچے پڑ، اوپر پڑ کسی حتمی فیصلے کے دانے ہوں تو یہ ڈوڈو ختم ہو مگر اندر اندیر خالی گھر میں کیا ملتا؟ ضمیر کی کوٹھڑی میں مٹھی بھر دانے شرافت کی پوٹلی میں پڑے تھے وہی ڈال دیئے۔۔۔ وقت کی تسبیح کا دانہ دانہ بھی مغرب کے امام تک آپہنچا تھا۔ نین نے اسے بلا بھیجا تھا، اندر پہنچا تو نین تارے اسے ڈانٹا۔

”تم میرے پاس آئے ہو یا علیحدہ دوستوں کی محفل جمائے۔۔۔؟“

جواب میں وہ صرف خفیف سا مسکرا دیا۔ اس وقت بھی وہ اپنی چند شوخ و شنگ، بنی سنوری سیلیوں کے جھرمٹ میں چند روتی بنی بیٹھی تھی۔ اسے معلوم ہوتا تو وہ ہرگز اندر نہ آتا، وہ اس وقت سوال جواب کے موڈ میں نہیں تھا۔

”نین! انہیں کم از کم بیٹھنے کو تو کہو۔۔۔“ ایک بے تکلف منہ چڑھی سیلی نے پہلا پتھر پھینکا۔

”ماشاء اللہ، چشم بدور۔۔۔ شہزادہ سلیم لگ رہے ہیں، بس شیرازی کبوتروں کی جوڑی کی کی ہے۔۔۔“

یہ اک دوسری پھلجھڑی چھوٹی اور اس سے پیشتر کہ باقاعدہ آتش بازی کا سماں پیدا ہوتا، سر درد کا بلنہ بنا کر وہ نین کے کمرے میں صوفے پہ نیم دراز ہو گیا۔ اندر کی چکی ابھی تک چل رہی

تھیں۔ بڑے کمرے کے درمیان، کشادہ سی میز لگا دی گئی۔ ساتھ لاؤنج میں مردوں کے بیٹھنے کا بندوبست تھا۔ شام پانچ بجے تک تمام انتظامات مکمل تھے، صرف ویڈیو کی فلم تیار کرنا والوں کا انتظار تھا۔ نین تار تیار ہو کر باہر آئی تو جوالا مکھی بنی ہوئی تھی۔ کلدار پنک سا ساڑھی، اسی شید کا ہلکا سا میک اپ، کانوں میں ایک لڑی موتی بندے، جوڑے میں گل شبنم، پھول، کلاہوں میں مویٹے کی کلیوں کے گجرے۔۔۔ شایان کے منہ سے بے اختیار ”ماشاء اللہ“ نکلا۔ ذرا قریب آئی تو اسے چھیڑنے کے لئے ہولے سے کہا۔

”بخارے تو بڑا نکھار پیدا کر دیا ہے۔۔۔ چشم بدور، نظر نہیں ٹھہرتی۔۔۔“

وہ اس کی تعریف کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”باتھ روم جا کر اپنا حلیہ درست کر کے آؤ، تمہارے لئے کپڑے وہاں رکھ آئی ہوں۔۔۔“

ویڈیو بنانے والے آچکے تھے، بڑا کمر کچا کچھ بھرا ہوا تھا۔ خوشبوئیں، روشنیاں، پکڑ سکتے مسکراتے چہرے، بچوں کی بہار۔ درمیان میز پہ ایک پہ استادہ موم بتیاں جلنے، بجھنے، انتظار کر رہی تھیں۔ بوسکی کا مغلٹی تراش کھلا کر تہ، ملائی لٹھے کا چوڑی دار پاجامہ، سلیم شام پنے شایان جب کمرے میں داخل ہوا تو ہراثنے والی نظر، نور و جمال کے اس پیکر کی چھب دیا کر خیرہ ہو گئی۔ کئی حسین آنکھیں پلکیں جھپکنا بھول گئیں، کئی دلوں کی دھڑکنیں اٹھل پتھر ہو گئیں۔ نین تار کے ہر نیو سے نین بھی اس نوچندی کے چاند کو چاہت بھری نظروں سے تنک رہے تھے۔ وہ نین تار کے دائیں پہلو کھڑا ہو گیا، نین تار نے اسے بائیں پہلو کھڑا ہوا۔

”ادھر کیا برائی ہے، جو مجھ ادھر کھڑا کر رہی ہو۔۔۔؟“ شایان بولا۔

نین تار نے اسے دیکھے بغیر جواب دیا۔ ”دل دائیں جانب نہیں ہوتا، بائیں طرف ہے۔۔۔“

ایک ساتھ دونوں نے موم بتیاں بجھائیں، سلامت مبارک اور تالیوں سے کرا گونج اٹھا۔ ایک دوسرے کو ایک کھلائے گئے، تھکے تحائف دیئے گئے، کمرے فلتش ہوئے۔ نین تار ابنا، بڑی خوش تھی لیکن گہری نظر دیکھنے سے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ اندرونی الجھن میں مبتلا ہو، بخار کی وجہ سے کمزوری، نقاہت کا اثر یا دل و دماغ میں کوئی خدشہ، کچھ نہ کچھ ضرور تھا، جو اس کے دل یا دماغ میں مچھلی کانٹے کی طرح پھنسا ہوا تھا۔ شور گہما گہمی سے گھبرا کر شایان، جو لاؤنج میں آ گیا۔ یہاں ماموں زاد بھائی اپنے دوستوں میں محفل جمائے بیٹھے تھے، ویڈیو فلم بن رہی تھی۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی جیسے ایک دم دو لٹاپ ہو گئے ہوں، باتوں کے کیسٹ

تھی گو فیصلے کا گلا ڈال دیا تھا لیکن دانتوں تلے تل دبانے اور خالی پیٹ چکی میں چند دانے ڈالنے سے خاک پیٹ بھرے گا؟۔۔۔ اب تو واقعی سر درد شروع ہو گیا تھا۔ سوچوں کا رخ بدلنے کی غرض سے وہ کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ چھوٹا سا قریب سے سجا ہوا کمرہ، نین کے پسندیدہ کمر، ہلکے گلابی، کرن، بڈ شیٹ، کیکے، کارپٹ۔ کمرے کے ایک کونے میں سالگرہ پہ ملنے والے تحفوں کے پیکٹوں کا انبار، خوبصورت رنگ برنگ نیلے پیلے ربڑوں والے۔۔۔ ایک پیکٹ سب سے نمایاں اور خوبصورت تھا، ہلکے نیلے رنگ پہ سفید موگرے کے پھولوں والا چمکدار پیپر سرخ ربن کی گرہ میں باشت بھر، ہری ٹمبیوں پتوں سمیت تازہ بہ تازہ گلاب کے پھول اور ایک ٹہنی کے ساتھ سنہری ڈوری سے بندھا ہوا انتہا سالفافہ۔۔۔ بس، شاید ایک ہی کسر رہ گئی تھی کہ بیچنے والے نے اپنا دل سینے سے نکال، شاپریگ میں ڈال کر ساتھ نہیں رکھا تھا۔ ورنہ تو اس نے اپنی چاہت اور خلوص کے اظہار میں کوئی کمی باقی نہیں چھوڑی تھی۔ یونہی آگے بڑھ کر پیکٹ اٹھایا، الٹ پلٹ کر دیکھا۔ مگر کوئی نام یہ نظر نہ آیا۔ لفافہ کھولا تو ایک معطر مہینی بھینی خوشبو کاغذ کا ایک ٹکڑا۔۔۔ لکھا تھا۔

”کب سے گوش بر آواز ہوں، پکارو بھی!“

اس کے لبوں پہ معنی خیز مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ اندر چلتی ہوئی چکی کی گڑگڑاہٹ جیسے ہتھم سی گئی۔ سوچوں خیالوں کی چیخنی چلائی، پھر پھڑپھڑاتی پاگل چوگاڑیں کہیں دور نئے دیرانوں کا تلاش میں نکل گئیں۔ فضا جیسے بر سکون اور نکھری گئی۔ سائیڈ ٹیبل پہ رائیٹنگ پیڈ نظر آیا۔ ہا جاذب نظر، نفیس فرنٹ کور پہ ہلکے رنگوں میں بڑا دل فریب منظر، پس منظر میں پہاڑی نیلے جن کی اوٹ میں سرخ سورج غروب ہو رہا تھا۔ لہو رنگ شفق جیسے آسمان خون کے سمندر میں اتر گیا ہو اور دور ایک پرندہ اڑتا ہوا۔ اکیلا، تنہا۔۔۔ کچھ سوچتے ہوئے شایان نے قلم اٹھایا۔

”نین! میں نے کہا تھا، سالگرہ پہ میں تمہیں ایک ایسا تحفہ دوں گا جسے پاکر تم بھی یاد کرو کہ کسی رئیس سے پالا پڑا ہے۔ مجھے اپنا کہا ہوا یاد ہے۔۔۔ سب سے پہلے میں یہ اعتراف لوں کہ میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں یا جو کہنا چاہتا ہوں اس کے لئے میرے پاس نہ تو مناسب الفاظ ہیں اور نہ ہی حوصلہ لیکن میرے لئے اپنے احساسات اور فیصلہ تمہارے علم میں لانا ضروری ہے۔ اس لئے میرے ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ کی وساطت سے میرا مافی الضمیر سمجھنے کو شش کرنا۔ میں کوشش کروں گا کہ اختصار سے کام لوں۔ غور سے پڑھو۔۔۔ میں بقا ہوش و حواس، پورنی ایمانداری سے یہ محسوس کرنے پہ مجبور ہوں کہ میں بحیثیت جو ساتھی، اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو ایک خاوند اور بیوی کے درمیان بنیادی حیثیت را

ہے۔ تم میرے عارضے کے بارے میں سب کچھ جانتی ہو، باوجود ممکنہ علاج و کوشش میں صحت یاب نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص اور رائے کے مطابق میں ازدواجی ذمہ داریوں کو نبھانے کا اہل نہیں ہوں۔ مجھے اپنی موجودہ حالت، آئندہ کی زندگی، ماں باپ، تم اور تمہارے جذبات، غرض ہر بات اور ہر چیز کا احساس، ادراک اور اندازہ ہے۔ ان حالات میں میرے سامنے صرف دو ہی راستے ہیں، تیسرا نہیں۔ ایک راضی برضا، صبر اور شکر ہے اور دوسرا خودکشی۔۔۔ میں نے پہلے راستے کا انتخاب کیا ہے۔ گویہ راستہ بڑا کٹھن اور رسوائیوں، محرومیوں کے کانٹوں سے بھرا ہوا ہے لیکن یہ خودکشی سے بہتر ہے۔ اس ذلت بھرے پرہول راستے پہ چلنے کے لئے مجھے اپنے کندھوں پہ سے سارے بوجھ اتارنے ہوں گے۔ ایک یہ ماں باپ، بہنیں ہیں اور دوسرا بوجھ تم ہو۔۔۔

نین! ہم آپس میں کزن ہیں۔ ہمارا یہ الٹو رشتہ ہے جو سدا قائم رہے گا۔ میں محض اپنی انا، دنیا دکھائی یا خاندان کی خاطر تمہاری خوشیاں اور زندگی داؤ پہ نہیں لگا سکتا۔۔۔ میری آنکھوں کے چین، میری نین! محبت خود غرضی کا نہیں، قربانی اور ایثار کا نام ہے۔ تم پڑھی لکھی، بیدار مغز اور ذہین لڑکی ہو۔ نفسیات کی طالب علم ہو اور سینے میں بڑا درد مند دل رکھتی ہو۔ تم مجھے، میرے دکھ اور میری مجبوری کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس نازک معاملے میں تم میرا ساتھ دو گی اور مجھے حرام موت سے بچا لو گی۔۔۔ ہاں، یاد آیا اور تمہیں بھی یاد ہوا کہ تم نے میری مونچھوں کے بارے میں کچھ کہا تھا اور میں۔۔۔ محض مسکرا کر رہ گیا تھا، مسکرانے کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ میں تمہیں کس طرح بتانا کہ میرے محسوسات اور خیالات میں واضح تبدیلیاں ظہور پذیر ہو رہی ہیں۔ مجھے ان تبدیلیوں پہ کوئی اختیار حاصل نہیں، میں اپنے نصیبوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس لئے میں نے اپنے آپ کو حالات اور قسمت کے سپرد کر دیا ہے۔ میں جینا چاہتا ہوں (اگر تم نے میرا ساتھ دیا) جیسے بھی صورت ہو، جو بھی ہو، جیسے بھی ہو۔ گفتگو طویل ہو گئی ہے، سمیٹنے کی غرض سے آخر میں التجا کرتا ہوں کہ تم بھی حالات سے سمجھو تاکر تے ہوئے۔ مجھے بھول جاؤ۔ اپنی زندگی اور مستقبل کو دھیان میں رکھو۔ تم عورت ہو، تمہیں عزت، تحفظ، خوشیاں، آسائشیں چاہیں۔ آسودہ حال پیار کرنے والا ساتھی چاہیے۔ ماں بننا عورت کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے مگر میں تمہیں یہ سب کچھ نہیں دے سکتا۔۔۔ چونکنا مت۔ مجھے یہ ساری خوبیاں زلفی میں نظر آتی ہیں، وہ تمہیں دیوانگی کی جد تک چاہتا بھی ہے۔ اس کا ثبوت یہ کہ کئی بار انکار کے باوجود بھی وہ ابھی تک مایوس نہیں ہوا۔ جبکہ اسے علم ہے کہ تمہاری منگنی بچپن سے ملے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری بہتری اور میرے

بھلے کے لئے انتظام کر دیا ہوا ہے۔ تم اس کے تحفے اور تحریر سے بھی اس حقیقت کی پہچان محسوس کر سکتی ہو۔ میں نے آج اسے بہت قریب سے دیکھا، باتیں کیں۔ تمہارے ہونے والے شوہر کے حوالے سے ہر طرح سے اسے جانچا اور میں نے پوری ایمانداری سے محسوس کیا کہ وہ ہر لحاظ سے تمہارے لئے ایک آئیڈیل ساتھی ثابت ہو گا۔ میری آخری درخواست غور کرو، اس پہ عمل کر کے میری مدد کرو۔ ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم نے اپنے ہاتھوں سے ہر گلا گھونٹ دیا ہے۔ میری یہ تحریر پڑھنے کے بعد جلا دینا اور کسی سے ان باتوں کا ذکر نہ کرنا۔ میں تمہیں اپنی نسبت سے آزاد کیا، یہی میرا تمہاری سالگرہ پہ تحفہ ہے۔ ہر سانس تمہارے لئے دعائیں اور میری طبعی موت کی دعا کرنا۔

شایان جو تمہارے شایان شان نہیں

☆☆☆

شمس کے ستارے عامل ظہوری شاہ کے حق میں واقعی بڑے سعد ثابت ہو رہے تھے جب سے یہ ستارہ جبین اس حرص و ہوس کے ”نیا برج“ میں داخل ہوئی تھی، ہنس تھا کہ اس کی مانند برس رہا تھا۔ شہرت پر باندھے سرخاب کی اڑان بنی ہوئی تھی۔ جس کسی سیاسی شخص کا زانچہ بنایا، وہ کامیاب ہو گیا۔ پیش گوئیاں حرف بہ حرف سچ نکلیں۔ پرائز بونڈ کے جس کی نشاندہی کی، کوئی نہ کوئی نمبر ضرور لگ گیا۔ ایک ٹائمنڈ صنعت کار کے ستاروں کا رخ تبدیل کیا کہ اس کا قرضہ معاف ہو گیا۔ اس نے حق محنت کے عوض تین سال پر اپنی سوز و گداز کی چابی عطا کر دی۔ ایک فرنیچر والے کے ستارے ایسے پالش کئے کہ اس کی من چابی خود ہی دلہن بن کر اس کے قدموں میں آگئی، صدقے میں اس نے شمس والے فلیٹ کا فز بھیجو اویا۔ یہ فلیٹ، شایان کے فلیٹ کے ساتھ اوپر چھت پہ تھا، اوپر صرف یہی دو فلیٹ۔ شمس والا فلیٹ دراصل شایان کا سروٹ کواٹر تھا جہاں پہلے اس کے ذاتی ملازم رہتے تھے بعد میں اس کے اپنے فلیٹ کے بیرونی کمرے میں آگئے۔ اپنے فلیٹ کے آگے کھلے محو پھول پھلاری کھلا رکھی تھی، کبوتروں کا ڈربہ اور چھتری بھی تھی۔ بیٹروں پہ باڑ لگا، جھوڑ چڑھا دی تھی۔ پلاسٹک کی کرسیاں میز، بڑا اچھا ماحول بنا رکھا تھا۔ دوسری جانب شمس کمروں کا فلیٹ، درمیان میں قد آدم دیوار اور سیڑھیاں بھی الگ۔

شایان کے ذاتی ملازموں میں منشی کرم الہی بڑا ایماندار اور وفادار شخص تھا۔ برس سے اس کے والد کے ہاں منشی گیری کر رہا تھا۔ حساب کتاب کا سچا، کاروباری اور انتظامی ماہر تھا۔ شایان اسے ادب لحاظ سے چاچا کہتا تھا۔ اس کے ذمہ مارکیٹ کا حساب کتاب اور

کی وصولی وغیرہ تھی۔ دوسرا نذیر عرف جبرایلوچی تھا۔ کھانا پکانا، صفائی ستھرائی، کپڑا اتار اس کے ذمہ تھا۔ تیسرا رحمت علی عرف رمتا ٹھوٹیا تھا جو یہاں لاہور میں بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ پارٹ ٹائم شایان کے پاس آجاتا، اکثر یہاں سو بھی جاتا۔ ہنسی مذاق، جگتیں یا پھر پاؤں دابتا رہتا۔ منشی کرم الہی مالکوں کی مرضی میں دخل تو نہیں دیتا تھا لیکن جب کبھی کاروباری اصولوں کے خلاف کوئی بات دیکھتا تو خاموش بھی نہ رہتا، مناسب طریقے سے اشارہ کر دیتا۔ ظہوری شاہ کا بغیر سیکورٹی فلیٹ دینا بھی اسے اچھا نہ لگا تھا۔ وہ اس کے شب و روز کے مشاغل اور پڑھائی میں عدم دلچسپی کو بڑی تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا مگر اپنے کام سے کام رکھنے کے اصول کے پیش نظر خاموش تھا۔ وہ اسے اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ اندر ہی اندر کڑھنے کے سواہ شریف بوڑھا آدمی کر بھی کیا سکتا تھا۔ خاص طور پر نیچے استاد شنو کی میوزک اکیڈمی میں شایان کی آمد و رفت اسے بہت کھلتی تھی۔ وہ تو پہلے دھمکتے کی جگتوں اور سوتیلے حرکتوں سے بیزار تھا۔ اکیڈمی میں تو درجنوں میراثی، ناچے، خوشامدی، جی حضوری اور مطلب بر آوری جن کی کٹھنی میں پڑی ہوتی ہے۔ آسامیاں پھانسنے کے ماہر جن کی صحبت اختیار کرنے سے اچھی خاصی حیثیت کا انسان دو کوڑی کا ہو کر رہ جاتا ہے لیکن شایان شاید دل بہلانے کی خاطر وہاں چلا جاتا تھا۔ طبلے کی تھاپ، ہارمونیم کے سُراور تانپورے سارنگی کی جھال اسے بڑی بھلی لگتی، آواز بری نہیں تھی لیکن گانے سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں تھی۔ یوں ہی کبھی کبھی وہ ہارمونیم پہ انگلیاں سیدھی کرنے بیٹھ جاتا، اردو ہی امروہی بھی نکال لیتا۔

اس روز بھی اکیڈمی کی ایک سینئر سنگر، ڈانسر، آرٹسٹ مس نیلمکا کی سالگرہ تھی۔ پچھلے دنوں ایک صنعت کار کے ہاں شادی کے فنکشن میں اس کی اعلیٰ اور مالی لحاظ سے شاندار کارکردگی کے اعتراف میں جشن تاج پوشی کا اہتمام تھا، دونوں فنکشن اکٹھے منائے جا رہے تھے۔ استاد شنو نے حسب روایت اپنے تمام کرم فرماؤں، سرپرستوں کو بھی بطور خاص مدعو کیا ہوا تھا۔ حکیم جمالی اور ظہوری شاہ نے اصرار کر کے شایان کو مہمان خصوصی بنادیا۔ رات گیارہ بجے تک رنگ و رامش کا پروگرام ہوتا رہا۔ اسی محفل میں حاجی رجنی بیگم نے بصد اصرار شایان کو بابا بگٹانی کے عرس پہ بطور مہمان خصوصی تشریف لانے کی دعوت دی۔ پروگرام کے بعد خاص نشست کا انتظام اوپر کھلی چھت پہ کیا گیا، جہاں کھانے پینے کا وافر انتظام تھا۔ کھانے پینے کے بعد ”عالی“ تو عازم راہ ہو گئے مگر ”خاصی“ بیس ظہوری شاہ کے فلیٹ میں رُک گئے جہاں شراب کباب کے ساتھ شباب بھی تھا۔ ایک نمبر وائٹ ہارس اسکاج کے دو ہلکے پیگ، سڑکے کے ساتھ، ہنگو کی خالص نفیس ترین چرس کے چند کش۔۔۔ شایان کے چودہ طبق

روشن ہو گئے۔ دھیمے دھیمے سرور اور غمار سے اس کی خوبصورت آنکھوں کے ڈورے کھڑے گئے۔ شراب، پھر سکاچ۔ پہلی پہلی آشنا تھی۔ انسان جب کسی وجہ سے بھی اپنے اندر لیونز اپنی ذات سے ناراض ہو جاتا ہے تو پھر باہر کی ہر چیز سے آشنائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنی ذات کو مات دینے کے بہانے تلاش کرتا رہتا ہے۔ ہر اس سوراخ میں انگلی کھیسرتا ہے جہاں کوئی کالا سانپ گھسا ہوتا ہے۔ اسے اپنے آپ کو رسوائیوں، بربادیوں کے زہریلے پچھوؤں سے کٹوانے کی عادت ہی پڑ جاتی ہے۔ یہ نشے کی پینک میں گندی موریوں میں بڑے ہوئے لوگ جوتے، گالیاں اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے نوجوان۔ اپنی رگوں میں سرنجیس گھونپتے اور زبانوں پہ سانپ ڈسواتے ہوئے انسان شاید اپنے آپ سے ناراض اور اپنے اندر سے باہر ہوتے ہیں ورنہ اپنی شتی کون ڈھونڈتا ہے۔

شراب، چرس، یہ پرانندہ لوگ، یہ کم سوادوں کی محفلیں شایان کی شایان شان نہیں تھیں۔ کینوں کی چاریاری کی یہی تو ایک خرابی ہے کہ یہ خانہ خراب کر دیتی ہے۔ شراب، چکھی نہ تھی، آج اس کے خون میں ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔ اب وہ سرور کے گھوڑے پہ سر خراں خراں واوی بے خودی کی سیر کر رہا تھا۔ بوتلوں کے کاگ اڑے تو رہی سیسی انسان بھی کالور کی مانند اڑ گئی۔ اکیس انچ سوئی ٹی وی پہ سولہ سولہ برس کی برہنہ لڑکیاں، ایسے حیا منظر کہ چشم کور کو بھی پینہ آجائے۔ استاد شفو کے سامنے کھلے ہوئے سگریٹوں کا ڈھیر جنہیں وہ بڑی پھرتی اور مشاقی سے ”مشرف باچرس“ کر رہا تھا۔ انگلیاں اڑھڑ آ نکھیں اڑھڑا کر رہی تھیں اور غمور شاہ بڑی محویت اور دلچسپی سے مناظر کی فنی باریکیوں پہ تبصرے ساتھ ساتھ چسکیاں اور کش بھی لے رہے تھے، استاد قریان تو ایک ایک سین سین پہ قربان تھا۔ رفتی ڈوگر موڈب اور دو زانو بیٹھا تھا۔ سین پہ سین آتے گئے، کردار اور انداز بد گئے۔ ایک، دو سرا، تیسرا۔۔۔ عامل ظہوری شاہ اٹھا، پچھلے کمرے میں گیا۔

دیوار کے اس پار بوڑھا درمند منشی کرم الہی بھی کبھی اندر جاتا، کبھی باہر آتا۔ دیوار اس پار دیکھتا، نظریں دیواروں سے ٹکرا کر بولہبہاں ہو جاتیں۔ وہ دیکھ تو نہیں سکتا تھا مگر اندازہ تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ وہ کبھی آسمان کی جانب دیکھتا، کبھی اپنی اوقات کی طرف اور اپنی روزی کی طرف۔۔۔

عامل ظہوری اپنے کمرے سے اکیلا نہیں نکلا۔ وہ شمسہ کی کلائی تھامے، اسے ساتھ آیا۔ شب خوابی کے نیم عریاں لباس میں وہ کوئی اور ہی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ اندر ہوتے ہی وہ کسی معصوم بچے کی مانند اٹھلانے لگی، انگڑائی توڑ کر وہ ٹیلی ویژن کے آگے

ٹیلی ویژن پہ بڑے گرم گرم سین چل رہے تھے، وہ بڑی محویت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”ابو۔۔۔“ ایک دم ظہوری شاہ نے اسے اشارہ کیا، وہ جیسے سہم گئی۔۔۔ ”ابو۔۔۔“ نہیں، شاہ جی۔۔۔ ہاں، شاہ جی! یہ لڑکی کیا کر رہی ہے۔“ وہ دیکھتے ہوئے تالیاں بجانے لگی۔ حکیم جمالی نے نشے میں دمت شایان کا کندھا ہلایا۔ بڑی سی ”ہوں“ کرتے ہوئے اس نے ہلکے سے پوٹے کھولے اور چائی سے ملائی ملا دودھ ڈکوتے ہوئے باگڑیلے کی طرح وہ آنکھیں سیڑھے پھر منڈی ڈال گیا۔ حکیم جمالی نے جیب سے ایک چھوٹی شیشی نکالی، چنگی سے ایک دوا اس کی ناک میں سو نکھائی۔ تابڑ توڑ دو چھینکوں سے اسے قدرے ہوش آگیا، آنکھیں پٹ پٹا کر دیکھنے لگا۔

”شایان صاحب! بس، دو پیگ ہی سے لے پڑ گئے۔۔۔؟“ پھر وہ شمسہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے، آنکھ دبا کر کہنے لگا۔ ”ابھی تو یہ سولہ سالہ پرانی شیوا زو سکی بھی آپ نے چکھی ہے۔۔۔“

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ شمسہ کی جانب دیکھنے لگا جو بڑی گرم جوشی سے تالی بجا کر ٹیلی ویژن پہ گرم گرم سین دیکھتے ہوئے خوش ہو رہی تھی۔ حکیم جمالی نے شمسہ کا رخ شایان کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

”بے بی! انہیں دیکھو، یہ شایان ہیں۔۔۔“ وہ ایک دم شایان سے چٹ گئی۔ ”اٹا، میرا گدا! میں اپنی گڑیا کی شادی اس سے کروں گی۔۔۔ ابو۔۔۔ نہیں نہیں، شاہ جی! اسے آپ مجھے دے دیں۔۔۔“

وہ خند کرنے لگی۔۔۔ شایان کچھ نہ سمجھتے ہوئے پریشان سا ہو گیا۔ ایک اور چھینک نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ظہوری شاہ نے ایک بھرا ہوا سگریٹ اس کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”دم مارو، شزا دے! یہ سب کچھ تمہارے علاج کا حصہ ہے۔ بس عیش کرو، شزا دے، عیش۔۔۔“

دو چار بھر پور کشوں نے اسے پھر سرور کے گھوڑے پہ بٹھا دیا مگر اب کے گھوڑا دلکی چال پہ تھا۔ ٹیلی ویژن پہ سین ہی کچھ ایسے تھے، منہ سے باتیں ضرور ہو رہی تھیں لیکن نگاہیں وہیں جمی تھیں۔ شایان اور شمسہ بھی کسی نہ کسی طور ان میں شامل تھے، سب اپنے اپنے طرف مزاج اور خیالات کے مطابق لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ظہوری شاہ نے شمسہ کو ایک ڈبل ٹوئک سکاچ کا پلایا اور اپنے قریب کرتے ہوئے اس کی گردن کے پیچھے ہاتھوں سے مساج

شمسہ پچھلے کمرے میں بستر پہ پڑی اپنی گڑیا کے بال برش کر رہی تھی۔ رات کے راہی، بج کے اگلے سے پہلے ہی غائب ہو چکے تھے۔ ظہوری شاہ ویڈیو، ٹیلی ویژن کیمرے اور ایکسپوز لہا ہوئی فلمیں لے کر اپنے دفتر چلا گیا۔ شمسہ اپنے ارد گرد کے ماحول، رات کی وُرجت سے بے باز چڑھی ہوئی آنکھوں سے اپنی گڑیا کو سنوار رہی تھی۔ بے حسی کے گہرے پانیوں ڈوبی ہوئی دراشت، سانس درست کرنے کے لئے ابھرتی بھی، تو اگلے لمحے ہی وقت اور مقصوم کا مگر کچھ پھر کی ٹانگیں کھینچ کر گہرے پانیوں میں لے جاتا اور پھر وہ کانٹے میں پھنسی مچھلی کی مانند ڈوری کے رحم و کرم پہ کھینچتی ہوئی چلی جاتی اور یہ ڈوری ظہوری شاہ کے ہاتھ میں تھی۔ جب سے وہ اس کے ہاتھ آئی تھی، کوئی شب بھی تو ایسی نہ گزری جب وہ اس کے یا اس کے کسی دوست کی بسکٹ کا سامان نہ بنی ہو۔ حکیم جمالی بھی اپنے مریضوں پہ اپنے کشتوں اور مقویات کے اثرات لینے کے لئے عملی مظاہرات اسی پہ کراتے اور ظاہر ہے، اس کام کی وہ بھاری فیس علیحدہ مول کرتے جو دونوں بانٹ لیتے۔ یہ سب کچھ ایسی رازداری اور احتیاط سے ہوتا کہ ارد گرد لے لوگوں کو کانوں کان خبر تک نہ ہوتی کہ اس کاروبار مرکز میں فقیہ گیری کا مکروہ کام بھی ہوتا ہے۔ شمسہ اس گدگدی کی ایسی علوی ہو چکی تھی کہ کبھی وہ خود بھی کہہ دیتی۔ بات تو ساری ماس اور اندر کی ہوتی ہے، جب یہ دونوں چیزیں سرد ہو جائیں تو انسان ایک پتھر کی مانند ہو تا ہے۔ اس پتھر سے چکی بنا لویا بھگوان تراش لو، شولنگ کا سروپ بنا دویا اشو کاکی لاث گھڑ لویا ناالورا کے شاہکار تخلیق کر لو۔ پتھر تو پتھر ہوتا ہے، اصل چیز تو اس کی تراش خراش اور اس کا نعل ہے۔

اس جوان جسم و جان کے پتھر کو ظہوری شاہ نے حرص و ہوس کی ایک ایسی جیتی جاگتی رتنی میں ڈھال دیا تھا جو نشاط پسندوں کے تلذذ کی جملہ ضرورتوں کو انتہائی خاموشی سے پورا کرتی تھی۔ ظہوری شاہ نے شمسہ کی جملہ ضرورتوں اور دیکھ رکھ کے لئے ایک بوڑھا کھوسٹ مقرر کر رکھا تھا۔ نواب بی بی نام کا یہ خزانہ کھسرا حاجی رحیم کے کیپ سے حاصل کیا

کرنے لگا، ہاتھ اور آنکھ کے اشارے سے اسے رفیق ڈوگر کو ایک خاص فلم لگانے کا حکم دیا کمرے کی ساری لائٹیں بجھا کر سرخ لائٹ جلادی گئی۔ پھر لباس، شرم، شرافت، حیا، سب کا اتار کر کوئے میں رکھ دیئے گئے۔ رقص ابلیس شروع ہو گیا۔ ہر سین سے جیسے مقابلہ شروع ہو گیا۔ دونوں جانب حیا سوز مناظر تھے، شیطانی قہقہے اور تبصرے بھی جاری تھے۔ گدلایڈیو، دھواں، ہلکی ہلکی سکاریاں، دیواروں پہ ٹیلی ویژن کی منعکس شعاعوں کے تھرکتے سائے۔ شایان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کبھی ادھر، کبھی اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ہوش مدہوشی، تجسس تردد کی درم کیفیتوں میں غلطان، حیراں اور پریشاں ایک مظلوم بے بس سی عورت اور کئی وحشی مرد۔ غم میں چنگاریاں اٹھاتی ہوئی شراب، دماغ میں فُور چماتی ہوئی چرس، نگاہوں میں ناچتی ہوئی حرم رات بھی شاید ان شرمناک مناظر کو دیکھنے کی تاب نہ لا کر اپنی آنکھیں چھپانے لگی تھی۔ شمسہ ایک گھاسل نیل گائے کی مانند پڑی تھی۔ آنکھیں کھلی تھیں۔ بے جان نظر سے دیوار پہ منعکس بھوتوں جیسے سائے تھرکتے دیکھ رہی تھی اور شایان اس کو دیکھ رہا تھا۔ بیک وقت کئی کتے بھیڑیے، گیدڑ، مہنبھوڑ رہے تھے۔ جسمانی طور پر نہ سبھی، تصور کی حد اور ذہنی طور پہ جیسے وہ بھی اسے مہنبھوڑ رہا ہو، نوج اور رگید رہا ہو۔ پیادے، گھوڑے، رخ، سب باری باری اوندھے پڑتے جا رہے تھے اور کوئین، بے چاری کی جان پہ بنی تھی، پچھی بساط پہ اکیلی پڑی تھی۔ عامل ظہوری نے شایان کو ایک نیٹ ڈبل پیگ طلق انڈ چلتے ہوئے، زبردستی شمسہ کے قریب کر کے میوزک آن کر دیا گیا، روشنیاں جلادی گئے تیز آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی روشنیاں اور تیز نیٹ و سکی نے اندر آگ لگادی، دماغ ما کر دیا۔ ہمارے بوجھ سے بند ہوتی آنکھیں، روشنیوں کی چھن۔ شمسہ نے اسے گوا لیا۔

”میرا گڈا!۔۔۔ میں اپنی گڑیا کی اس سے شادی کروں گی۔۔۔“

وہ چکارنے لگی۔ بے آواز، کیمرے مختلف زاویوں سے تصویریں بنا رہے تھے اور وہ دو مہرے تھے، جنہیں کھیل کر ظہوری شاہ ایک بڑی بازی جیتنا چاہتا تھا۔ پھر بساط سے مہرہ اٹھا لیا گیا۔ رفیق ڈوگر میدان میں آ گیا۔ شایان اور وہ۔۔۔ فلیش چمکتے رہے، زاویہ انگ انداز بدلتے رہے۔ رات روتی پتی، چینی چلاتی کہیں دور نکل گئی۔ صبح سے پہلے شاہلیہ درست کر کے اس کے فلیٹ پہ پہنچا دیا گیا۔

منشی کرم الہی جاگ رہا تھا اسے پلنگ پر لٹا کر نماز کی تیاری میں لگ گیا۔

اندھروں میں امید و فلاح کے ننھے ننھے جگنوؤں کی جلتی بجتی روشنی میں خیر و سلامتی کی کوئی راہ تلاش کر رہا تھا اور ایسی کوئی راہ فی الحال اسے سمجھائی نہیں دے رہی تھی۔ شایان کو اچھائی برائی سمجھنا بے کار تھا۔ وہ اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی بھی مداخلت پسند نہیں کرتا تھا۔ والدین بھی اس کے آگے سرگرم تھے اور شاید اس کی وجہ اس کا اکیلا بچہ ہونا یا بیمار اور حساس ہونا ہو۔ وہ اس کے باپ سے بھی اس کی راہ روش کی شکایت کرنا مناسب خیال نہیں کرتا تھا۔ شاید وہ ان کی آذر دہی اور پریشانی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک ہی راستہ تھا کہ وہ صدق دل سے اللہ سے اس کی سلامتی اور نیک چلنی کی دعا کرے۔ دوپہر تک شایان بے خبر سو رہا۔ دو بج کے قریب نذیر بلورچی نے اسے جگا کر کھانے کے متعلق پوچھا۔ نہادھو کپڑے بدل کر کھانے کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ حکیم جلی کا فون آگیا، وہ اسے حالی رچی کے ڈیرے پہ لے جانے کے لئے آ رہا تھا، عرس کے متعلق کوئی میٹنگ تھی اور حالی رچی بیگم نے خاص طور پر شایان کو ساتھ لانے پہ اصرار کیا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ آیا تو شایان کھاپی کر فارغ ہو چکا تھا مگر دسترخوان ابھی لگا ہوا تھا۔

”شیر لے! اکیلے اکیلے بھنڈی گوشت اڑا رہے ہو۔“

یہ کہہ کر حکیم جلی خود ہی شروع ہو گیا، کھاتے ہوئے اس کی نظریں شایان پر تھیں۔ اس کی طبیعت ابھی تک بوجھل تھی۔ کسلندی، ذہنی اضطراب کے اثرات ابھی تک اس کے چہرے سے ہو رہے تھے۔ حکیم جلی کی آمد بھی خللی اڑا دلتی تھی، رات والی واردات پہ وہ اس کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس کے رویے یا برتاؤ میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہ آئی اور نہ ہی اس نے گزری رات، کسی بات یا اپنے ساتھ ہونے والے کسی برتاؤ کا اظہار کیا۔ حسب معمول بڑی سعلت مندی اور احترام کا اظہار کر رہا تھا، یہ صورت حال حکیم جلی کے لئے بڑی تقویت اور اطمینان کا باعث تھی۔ سیریاں اترتے ہوئے، حکیم جلی اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”شایان صاحب! رات مزہ آگیا۔ ایسی محفلیں اور جشن تو ہوتے ہی رہتے ہیں مگر آپ کی شمولیت سے جو لطف اور رونق پیدا ہوئی ہے اس کا نشہ ہی الگ ہے۔ اسی لئے حالی صاحب نے آپ کو عرس کے موقع پہ خاص التماس مہمان بنایا ہے اور آج بے حد اصرار کر کے بلایا بھی ہے۔“ سونو کی اشارت کرتے ہوئے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ”حالی رچی بیگم بڑی پختی ہوئی ہستی ہیں۔ وہ آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ بڑے قسمت والے ہو گئے۔“

تھا۔ دانت آنت سے خالی، جاڑو پھیرا چہرہ، تالو، تلوے کی طرف صاف، بلغم پھینکتا اور دن کھوں کھوں کرتا رہتا، انیم کا عادی تھا، مردہ خراب کرنے کی اس عمر میں اچھا کھانا پینا اور پڑ رہا تھا تو اور کیا چاہیے؟ کچھ خیریت تندرستی روٹی کے کناروں جیسے لٹکے ہوئے ہونٹوں پہ اسٹک تھوپ، سرکندے کے کھیت جیسے تھوڑے پر سرخی پوڈر پوٹ، سفید موتیا بندے جیسی آنکھوں میں کجلا بروٹ کر جب وہ چھت پہ لہرا لہرا کر اٹھیلیاں لیتا تو اس بے کار بو اونٹ کی طرح دکھائی دیتا۔ جو شریان کے ہاں نہ بار برداری کے قابل ہوتا ہے اور نہ ذرا لائق۔ گڑیا اس کے ہاتھ سے علیحدہ کرتے ہوئے وہ اسے نیلا نیلا کی تیا ریاں کرے اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے وہ محسوس کر رہا تھا کہ رات اس کے ساتھ برا حشر ہوا جسم پہ جا بجا نیل اور سو جن تھی، اسے شدید گھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اسے پکا لگا۔

”اٹھ، میری لاڈو، میری جان! میں صدقے، قربان۔ اٹھ، نہادھو۔۔۔ پھر دنوں سے نہاری کچے سے ناشتہ کریں گے۔ اس کے بعد سارا دن آرام کرنا۔۔۔“

”آئی! میں اپنی گڑیا کو بھی نہلاؤں گی، اس کی بڑے خوبصورت گڈے سے شادی گی۔۔۔ آئی! میں نے گڈا دیکھا ہے، بڑا ہی خوبصورت ہے۔۔۔“

وہ اس کے بازوؤں میں جھولتی ہوئی غسل خانے چلی گئی۔

ادھر شایان قدرے ہوش میں اپنے شاندار پلنگ پہ ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ رات جگمگے اور ہوئے خمار سے سرخ آنکھیں، گردن پٹھے اکڑے ہوئے، سر بھاری، ہلکا ہلکا درد اور کمزوری رطوبت سے بھرا ہوا۔۔۔ اس نے جیرے سے چائے کا گرم گرم کپ طلب کیا۔ سرکتے ہوئے، آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے گزری شب کے چہرے سے پردے سرکے رنگ و رامش کی محفل، فلمیں، شراب، بھرے ہوئے سگریٹ، تیز میوزک، آنکھ چندھیادینے والی روشنیاں، ایک لڑکی۔ لڑکی نے اسے اپنے ساتھ چنایا، کوئی گڈی گا بات کی پھر۔۔۔ پھر رفیق ڈوگر۔۔۔ اس کی آنکھیں مارے خوف کے ابل پڑیں۔ اسے ساتھ ہونے والی زیادتی کا احساس بھی ہو چکا تھا۔ وہ جھل سا چائے کے کپ میں جیسے ڈوب کا سوچ رہا تھا، اسے ظہوری شاہ کے الفاظ بھی یاد آئے کہ یہ تمہارے علاج کا حصہ ہے۔ کے ذہن کی عجیب سی کیفیت تھی، کچھ بھی تو واضح نہ تھا۔ اس کے اندر جیسے پھرکیاں سی تھیں، ذہن مختلف قیاس آرائیوں اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

منشی کرم الہی بھی اپنی چارپائی پہ تسبیح پکڑے چپ چاپ بیٹھا تھا، انجانے اندیشے

”ان کی بڑی مہربانی ہے، میں کس قاتل ہوں۔“ شامیان نے انکساری سے جواب دے دیرے پہنچے تو حسب معمول بڑی رونق تھی۔ بڑی گرم جوشی، شفقت سے پذیرائی حاجی صاحب نے حال احوال پوچھا، منہ چوم کر اپنے پہلو میں منہ پہ جگہ دی۔ چائے پانی فراغت ہوئی ہی تھی کہ ظہوری شاہ اور وہ کونسلر جن کا زانچہ اور ستارے سیدھے کامیاب کروایا تھا، تشریف لے آئے۔ عرس کے انتظامی معاملات پہ بات چیت شروع ہو عرس کے تینوں دن، خصوصی ناچ گانے کے مقابلوں کے لئے ملک بھر سے ہجڑوں کو مدعو تھا۔ دہلی، آگرہ، بے پور، حیدر آباد بھی دعوت نامے اور خطوط ارسال کر دیئے گئے تھے۔ کھلے میدان میں تمبو، قاتیں، شامیان اور مہمانوں کے خیمے نصب کر دیئے گئے تھے۔ دنوں نچرتے دیکھی گئی کے تنجن، حاجی صاحب کا طلائی کٹ، مزار شریف کی سجاوٹ، ساؤنڈ سسٹم، عارضی غسل خانے، رضا کار، سب انتظامات مکمل تھے۔ مقامی کونسلر اور حیثیت، صاحب ذوق حضرات نے بھی انتظامات اور اخراجات میں خاطر خواہ تعاون کیا تھا اور قدر دانوں نے اپنی کاریاں، دیگین اور ٹانگے ریڑھے بھی پیش کر دیئے تھے۔ مقامی کونسلر مہربانی سے مقامی پولیس تھانے نے عرس کے تینوں دنوں امن وامان کے لئے خاصی نفری متعین کرنے کی ذمہ داری لی۔ پھر آنے والے دو تین روز بڑے مصروف گزرے۔ نئی قلعی سفید نئے جھنڈے، آرائشی روشنیاں۔ میدان کا کاٹھ کباڑ، کوڑا کرکٹ سمیت کرمحفا اور چونا بکھیر دیا گیا، نمدار اور تعفن والی جگہوں پہ فینا سکل کا چھڑکاؤ کیا گیا۔ آرائشی والوں، دیگین پکانے کے لئے ایندھن اور جگہ کا انتظام اپنے احاطے میں کر دیا اور یہاں کے سکو واپڈا کے لائن مینوں نے ڈائریکٹ تاریں جوڑ کر بجلی فراہم کر دی۔ ارد گرد کوئٹوں والے چھڑوں، لچوں اور محنت کشوں نے وی آئی پی قسم کے مہمانوں کی مہمانداری، شب بیری لئے در دیدہ ددل واکر دیئے تھے۔ ریڑھی، نہیلیے، عارضی دوکانوں، مٹھائی قلمے والوں، چائے، پان سگریٹ والوں نے اپنی اپنی جگہیں سنبھال لیں۔ منگل کے روز شام تک انتظام مکمل ہو گئے تھے۔

ابتداء سندھ کے قافلے سے ہوئی۔ کراچی، حیدر آباد، سکھر، ساگھر، نواب شاہ، لاہور سے کل اسٹھ ہجڑے آئے۔ جن کے گرد و ناخاج پتلی جان کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے دار بھی شامل تھے۔ میرپور، مظفر آباد، کوٹلی، ممبھر سے آتالیس مع گرو غازی نواب آئے۔ گرو صاحب کی سیاسی حیثیت بھی تھی۔ کشمیر کی جنگ آزادی میں ایک رات انڈین گورکھوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے، بچ بچا کر زخمی حالت میں دوسرے روز واپس

اور تب سے غازی کہلانے لگے تھے۔ گجرات، جہلم، پٹنڈی، پشاور، مردان، کوسٹہ کے ہجڑے آئے ہو چکے تھے۔ بدھ کی شام انڈیا سے قافلے کی آمد آمد تھی۔ حاجی راجی بیگم سینکڑوں زرق برق بننے سنورے ہجڑوں سمیت جلوس کی شکل میں اسٹیشن استقبال کے لئے پہنچے تو ذوق و دلاں لاہور کے لئے ایک نئی تفریح کا سامان پیدا ہو گیا۔ دیگینوں، بسوں، رکشے والوں، قلیوں، مسافروں اسٹیشن کے عملے نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ٹریفک رک گئی اور اندیشہ نقص امن کے تحت پولیس بھی آگئی۔ چھیڑ چھاڑ، ہنسی ٹھٹھول، نقرے بازی، فحش حرکتوں اور دو ہتھکڑیوں، ٹھٹھولوں نے وہ سماں باندھا کہ تماشا بینوں کو لطف آگیا۔

جگت گرو مہاراج لکشمی رانی کی قیادت میں اٹھائیس ہجڑے پدھارے تھے۔ چھوٹے گرووں میں کلکتہ سے شو بھادیوی بھانجھری، دہلی سے حاجی مہربان بانو، سورت گجرات سے حاجی زلیخا بانو، چندی گڑھ سے ریشم کور، حیدر آباد دکن سے نازلی خانم، آگرہ سے زرجس جہاں، بھوپال سے زیب خاتون بھوپالی، بمبئی سے منھی جان جام شور والی مع اپنے شاگرد چیلوں کے جب باہر نکلے تو لاہور کے بڑے بایوس ہوئے۔ دھان پان چرخ، دھواں دھند چرے، منہ میں گھوڑیاں، زردیلی آنکھوں میں کچلے کی دم دھاریاں۔ بے رس ہونٹ، شور تھور بنجر جسم۔ کوئے بوئی، وال مفت، دھیلے روٹی۔ اکثریت معمولی سوتی ساڑھیوں میں ملبوس، تنگی دامن کی شکایت کرتی ہوئی چولیاں۔ بے آب رنگے ہوئے بالوں کے جوڑوں میں پیلے گیندے کے مڑھائے ہوئے پھول، نیلی نیلی ابھری رگوں والی پھانٹ پھٹی ہاہوں پہ بے رنگ چوڑیاں، ہاتھوں میں قلعی کئے ہوئے تانبے کے بڑے بڑے پاندان، پھکی ٹوکریاں، میلے کچیلے پیوند لگے بستر بند اور پانوں کے ٹوکے۔ لہرائی، بل کھاتی، آنکھیں نچاتی یہ تیسری مخلوق جب اسٹیشن سے باہر نکلی تو اتنی ہا، ہو چکی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔

لاہوریوں نے ایسے مرل ہجڑے کبھی نہ دیکھے تھے۔ میں واری، میں قربان صدقے، میری بنو، میری چھنو، تماش گیریوں کا جھوم، دھکم پیل، چٹکیاں، آوازے، ہائے اللہ، ہائے رام، لوئی، لوئی، ہائے میا، ہائے دیا۔ ترے ہاتھ ٹوٹیں مردار، تیرا بیڑہ غرق ناہنجار!۔ لاہوریوں نے وہ لوٹ چائی کہ توبہ بھلی۔ لوٹ پوٹ، چسکے لیتی پولیس کو ہلکا سا لاشی چارچ کرنا پڑا۔ بڑی مشکل سے انہیں دیگینوں، بسوں میں ٹھونس ٹھانس کر منزل کی جانب روانہ کیا۔ ابھی گاڑیاں باہر چکر کے گردی تھیں کہ اک نیا غلط پھا ہو گیا، معلوم ہوا کہ چار ہجڑے جن میں تین مہمان اور ایک مقامی تھا، اسٹیشن کے بیت الخلاء سے روتے چلاتے، ہائے وائے کرتے برآمد ہوئے۔ تین مہمان زلتہ بیت الخلاء میں گھسے تھے اور اپنے والا مردانہ میں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ وہاں

واقعی رفع حاجت کے لئے گئے یا یہ وہاں رفع شر کے لئے گئے تھے۔

پولیس کو اب اک نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے والا تو اپنا میٹر ہوا میک لہ درست کر رہا تھا اور مہمان کھسرے اپنی عزت اور عصمت پر حرف آنے پر احتجاج کرتے ہوئے وہاں دے رہے۔ جہوم تھا کہ پھر جنا شروع ہو گیا۔ مزید کسی بد مزگی سے بچنے کی خاطر مظلوموں کو انصاف تحفظ دینے کے لئے پولیس انہیں اپنے ساتھ لے گئی۔ اب اسٹیشن رونق کا کچھ حصہ تھانے پہنچ چکا تھا، وہاں بھی انہوں نے اپنی حرکتوں اور واویلا سے سارا نا اہل پتھل کر دیا۔ عملے اور حوالاتیوں کی موج لگ گئی۔ تھانے وار صاحب موجود نہیں، عملہ ان سے محفوظ ہو رہا تھا۔ پھر مجبوراً "یا معظوظا" پولیس نے سارے کلغذ پہ ان سے بیان شروع کر دیئے۔ بھجڑے کی زبان خاموش ہو تو جسم بولتا ہے، دونوں خاموش تو ناز و ادائیں ہا ہیں۔ یہاں چار تھے، خاموش کیسے رہتے۔ آخر تک آکر چھوٹے تھانیدار نے ایک ایک علیحدہ، کمروں میں بھجوا دیا اور عملے کے چار آدمیوں کو کہا کہ ان سے علیحدہ علیحدہ بیان لیں۔ باقی دیگنیں جب منزل پہ پہنچیں تو وہاں بھی اک افزا تقری تھی۔ دوسرے شہروں سے گرم رہے تھے، تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ کسی کو اپنی خبر نہیں تھی تو کہ کیا خبر لیتے؟

کسی نے حاجی راجی بیگم تک یہ خبر پہنچائی کہ چار بھجڑوں کو پولیس تھانے لے گئی ہے۔ چار معززین کو لے کر وہاں پہنچا تو پولیس بیان لے چکی تھی۔ بیان دینے والوں کی حالت دگرگوں تھی، حاجی صاحب کو دیکھتے ہی دہائیاں دینے لگے کہ بہت ہی سخت بیان لئے گئے خدا کے لئے ہمیں یہاں سے لے چلو۔ عملے نے کہا کہ ابھی یہ کچے بیان ہیں، کچے بیان تھانیدار صاحب بنفس نفیس خود لیں گے۔ یہ سن کر ان کچے بیان دینے والوں نے دوپٹے سے خود کو پٹینا شروع کر دیا کہ ہائے ہائے، اب ہم اور کیا بیان دیں گے؟۔ وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگے۔ پولیس والے انہیں جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ بڑی مشکل منت حاجت سے کہیں ان کی جان چھوٹی۔ حاجی راجی بیگم نے ان چاروں کا ہاتھ چومنا بدھا کہ شمنگ شگون بڑا سعد ہے۔ بابا ہنگا ثانی سرکار نے تمہاری قربانی قبول کر لی ہے۔ حلیہ اور دوسرے معززین اس کلمہ دیکھنے لگے۔

جمعرات کی صبح نماز کے بعد تقریبات کا آغاز ہو گیا۔ تقریباً ایک ہزار چیدہ چیدہ بھجڑا دلہنوں کی مانند سج دھج، سولہ سنگار کئے سروں پہ دودھ بھری رنگین منگیاں رکھے جن کی گرد کے گرد زرد رنگ کی چمکیلی مقیش بھرے دوپٹے لپٹے ہوئے تھے، بابا میاں ہنگا ثانی کی

بھری۔ دودھ سیلیوں کے ذریعے زائرین میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد بزرگ گرد بھجڑوں نے جنہوں نے پیرانہ سالی کے باوجود ڈھیروں میک اپ، زیور، بھڑکیلا لباس پہن رکھا تھا، مزار کے احاطے میں رقص کیا۔ بوڑھے منہ مہاسے، دانٹوں سے خالی تھوہڑے، آنتوں سے خالی پیٹ، بالوں سے بے نیاز سر۔ عجیب مضحکہ خیز منظر تھا۔ اس پہ مستزاد، ان کے ناز خڑے، غمزے عشوے، جیسے سولہ سولہ برس کی چھو کریاں ہوں۔ ہندوستان کے بھجڑوں نے چولی بنگے اور ساڑھیاں، دھوتیوں کی طرح اڑی ہوئی تھیں۔ یکے بعد دیگرے فیصل آباد، ساہیوال اور سرگودھا کے بھجڑوں نے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ایک سے ایک حسین پھلجڑی سمیں بدن۔ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی تنگ و دو میں پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ داد، آفرین، سینٹیاں، نوٹوں کی ویلیں، تماشین ان فنکاروں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔

آج کی تقریب کے میر مجلس، انڈیا کے جگت گرد، مہاراج رانی لکشمی بائی جبکہ مہمان خصوصی حکیم جمالی تھے اور نظامت کے فرائض میڈم عاشی کے آفس مینجر آفتاب تھے۔ آفتاب صاحب باقاعدہ بھجڑے تو نہ تھے لیکن بھجڑوں کے تمام خصائص خبیثہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ بیسیوں تنجن کی دیکیں پک رہی تھیں۔ مدعو کئے جانے والے اپنے ساتھ حسب توفیق، گھی، چاول، چینی بطور نذرانہ لے کر آئے تھے۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ لذیذ ترین تنجن کی خوشبو، دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ مقامی، قریبی، بیسیوں اور باہر سے خوش فکر، خوش نظرے، تماشبین، جیب کترے، پیدا گیر، تیل مائیٹے جوق در جوق آرہے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ لوگوں کے جہوم میں اضافہ ہو رہا تھا۔ انتظام اور دیکھ بھال کے لئے پولیس کی نفری موجود تھی۔ دوسرے ذرا پہلے لنگر کھلا تو خدا کی خدائی اڑ آئی۔ لقمہ اٹھاؤ تو گھی خڑے، ہاتھ، منہ، کپڑے لسی گھی سے لتھڑے۔ ایسا خوش ذائقہ تنجن کہاں کسی نے کھایا چکھا ہو گا۔ ہیڈ باورچی، حاجی بڑا بیکر، داود حسین کے ڈوگرے سمیٹ رہے تھے۔

تقریب کے دوسرے حصے میں پشاور، مردان، ہری پور اور پنڈی کے طائفوں نے اپنا اپنا کمال فن دکھایا۔ صوبہ سرحد کے ایک نو عمر بھجڑے مسرت شاہین نے ایسا زلزلہ خیز رقص پیش کیا کہ بڑے بڑے بھجڑے باز تماشبینوں کے دلوں کے ساتھ ساتھ ان کی منتیں بھی ڈول گئیں۔ کئی لالچیاں مٹھیوں میں دبائے، حسرت بھری نظروں سے اشارے کر رہے تھے۔ اس کم بخت میں ایک عجیب علت یا ضرورت یہ تھی کہ وہ ہر منت بعد پشاور، چلم، کاٹویل، ساکس، کھنچا، پھر ٹھکے لگاتے ہوئے آہستہ آہستہ ناک منہ سے دھواں خارج کرنے میں بھی وہ کمال

مظاہرہ کرتا۔ شایان بھی حکیم جمالی کے پاس بیٹھا محفوظ ہو رہا تھا۔ اس خورشمال نوخیز ہجر رقص بڑی دلچسپی اور محویت سے ملاحظہ کر رہا تھا۔

بڑے کہتے ہیں کہ خوبصورت عورت پہ ایک شیطان اور خوب رو نوخیز لڑکے پہ بڑا شیطان مسلط ہوتے ہیں۔ اس تیسری جنس پہ شاید شیاطین کے پورے جیش کے جیش تباہ ہوں گے۔ عورتوں میں بڑی بڑی خوبصورت، کافراؤ اور عشوہ پیشہ ہوئی ہوں گی، جن کی آفرینوں اور غزہ طرازیوں کے آگے، بڑے بڑوں عشق پیشہ، جفاوریوں کے پتے پانی ہو ہوں گے مگر تاریخ اور کتابیں بتاتی ہیں کہ اس جنس میں بھی ایسے ایسے نادر روزگار، یکہ زمانہ، لوگوں مرجان ہو گزرے ہیں، جن کے روبرو نہایت کی نزاکتیں، حسن و جمال کی طراوت اور طرب و انبساط کی ساری حلاوتیں پانی بھرتی دکھائی دیتی ہیں۔

شایان محسوس کرنے لگا جیسے وہ اس پری پیکر میں خود موجود ہو۔ بعد میں سیالکوٹ نارووال، شکر گڑھ اور ڈسکہ، گوجرانوالہ کی ٹولیوں نے رنگ، جمانا چاہا مگر وہ مولوی مدن سیال کماں؟۔۔۔ شایان سر درد کا کہہ کر اٹھ آیا۔ حکیم جمالی کے ڈیرے پہ کلکتے والے گروہ شوبھا دیوی اپنے دو تین چیلوں سے جسم دیوار ہے تھے۔ بے حد لاغر کمزور، ہنسی کی صعوبت نہ ڈھال کیا ہوا تھا۔ حاجی رچی بیگم نے بتایا تھا کہ انہوں نے دوسرا جنم لیا ہوا ہے۔ پہلے جنم میں کاشی کے گند ہر مندر میں ایک نرنگی کے روپ میں تھے۔ مندر کے مہمان پر وہت رستوارا نے اپنی واسنا کامنا پوری نہ ہونے کا رن اسے ٹرپ دیتے ہوئے، دیوی کے چروں میں بلبل چڑھا دیا تھا۔ دوسو برس بعد اس کا دوسرا جنم کلکتہ میں کالی مائی کے ایک بھگت جو تھی رام کے ہاں ہوا، چونکہ یہ پیدائشی ہجڑا تھا۔ بھگت نے اسے کالی مائا کا بھگت بنا کر مندر سیوا پہ لگا ذرا سیانا ہوا تو جنت منتر، جنم کنڈی، ریکھا جوت، جوتش سیکھنے لگا۔ قد کاٹھ، انگ رنگ لگا ہجڑوں والی جہلت بھی جاگ پڑی۔ سیانوں نے کہا ہے کہ ہجڑا ہجڑوں میں اور ہاتھی ہاتھیوں ہی خوش رہ سکتے ہیں۔ یہ مندر اور گروے ناتواؤں کو اپنے ہم جنسوں سے آملہ، نوعمری کا نوچندی کی چاندنی مانند کھلا رہا۔ کھوں کھوں کا وقت آیا تو اپنے گیلان، عمر اور جوتش دیا گرو بن گیا۔۔۔ اندر پہنچ کر شایان نے بڑی سعادت مندی سے سلام کیا۔

”جگ جگ جیو، پچو!“ گرو نے اک نظر دیکھتے ہوئے دعا دی۔

شایان بڑے ادب سے سر جھکائے ایک طرف بیٹھ گیا۔

”ہمارے پاس آؤ، چند!۔۔۔“

شایان اپنی جگہ سے اٹھا اور گرو کے چروں میں جا بیٹھا اور لا شعوری طور پر اس کے

پولے پولے پنڈلیا دابنے لگا۔

”ناہیں، پچہ۔!“ وہ اس کے ہاتھ روکتے ہوئے پیار سے بولے۔ ”سیوا کے لئے بالک موجود ہیں، تم دھرج سے شانت ہو کو ہمارے پاس بیٹھو۔“

تعارف تو پہلے ہی حاجی رچی بیگم نے کروایا ہوا تھا، سر جھکا کر خاموش بیٹھ گیا۔ چند لمحے وہ اس پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہے، پھر بڑی رسانی سے پوچھنے لگے۔

”بوا! دکھائی پڑت ہے، من میں کوئی کامنا کاٹنا ہی ہوئی ہے۔۔۔ بولو، چھپاؤ ناہیں۔“

شایان، من ہی من میں وہ چونکا ضرور مگر کسی حیرت کا اظہار کئے بغیر عرض کرنے لگا۔

”مہاراج! سنا ہے، آپ جو تیش بھی ہیں۔۔۔ کچھ میرے بارے میں بتائیں؟“

وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے کہنے لگا۔ ”بالک! پرنتوٹ کی مائی، جو تیش و تیا“

مہادیان گیلان اور تپیا کا استھان ہے۔ کالی مائا کی جے کے کار کے کارن، جیوتش درپن سے ایک آدھ چھایا اکھر دیکھے تو کہت دیتے ہیں۔ ماتھے، منہ پہ گہری نظریں گاڑتے ہوئے پھر بولے۔ ”تمہے جیون درپن سے ناری روپ چھایا دکھائی پڑت ہے۔ جیون شوبھاؤش، مایا مرادہ کالمن۔۔۔ تمہا نروان ناچ نرت میں ہے جگ میں جگ مگ ہوگی۔ چنتا چھوڑو، من شانت رکھو اور روپ دھار کر روپا بنو۔۔۔ جیوتش کی کرم بتاتا ہے۔“

زبان لہجہ سمجھ میں آنے والا نہیں تھا، اس کے باوجود ایک ایک شدید مکمل معنی و مطالب کے ساتھ سمجھ میں آ گیا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی من کامنا پوری ہو چکی ہو۔ اس کا اندر بول اٹھا کہ یہی اس کا نانت ہے، یہی اس کا مقدر ہے۔ وہ جیسے واقعی شانت ہو گیا، دریافت کرنے لگا ”مہاراج! مجھے اب کیا کرنا ہو گا۔۔۔؟“

”گرو دکھشانی ہوگی، سہاگن بننا ہو گا۔۔۔ کیا چھایا پلٹ ہوگی۔“ گرو نے آگیا دی۔

☆☆☆

عرس کے آخری روز حاجی رچی بیگم کی تاج پوشی کے بعد انتہائی رازداری سے شایان کی کھائی پہ گرو رکھشا کی ڈوری باندھی گئی۔ کلکتے والے گرو مہانتو شوبھا دیوی نے اپنے دست مبارک سے گرو رتاک کی رتن جوت باندیا اس کے ماتھے پہ سجائی، اپنے ہاتھوں موتی چور منہ میں رکھا۔ تمام سرکودہ گروؤں نے منہ ماتھا چوم کر بدھائی دی، مبارک سلامت ہوئی، باقاعدہ شاگردی اور باندی بندھن کی رسم، عرس کے ایک ہفتہ بعد ٹھہرائی گئی تھی۔ اس کے لئے انتہائی رازداری اور خصوصی انتظامات کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مدعوئین میں حکیم جمالی، عامل تھپوری شاہ، چیدہ چیدہ چند معزز بوڑھے ہجڑے اور ریش ڈوگر شامل تھے۔ اس روز حاجی رچی

نیگم کے ڈیرے پہ بڑے کمرے کو بڑی شان و شوکت سے سجایا گیا تھا۔ تازہ گئے کے پھولوں، بسنت بہار اتری ہوئی تھی۔ اگر سچی کی سحر انگیز خوشبو نے ماحول کو خوابناک بنا دیا ہو تو کھانے پینے کا خصوصی انتظام تھا۔ شلیان مٹھائی کی بڑی ٹوکری، کھواب کاجوڑا، کشمیری شلہ، سچے پتلے کی سلیم شہی پیر زار، پانچ تلوہ ورنی طلائی کلائی بند نذر گزارنے کے لئے لایا تھا

☆☆☆

نوجے شب حاجی صاحب نے شلیان کو اپنے روبرو دو زانو ٹھلایا۔ کئی دیر مرا تے، ڈوبے، زیر لب کچھ بڑبڑاتے رہے۔ وقفہ وقفہ اس پہ جھاڑ پھونک بھی کرتے رہے۔ واسک سے ست رنگی سوت کی مٹی ہوئی ڈوری نکل کر اس کی دائیں کلائی پہ باندھی۔ مائے سندر کا ٹیکا لگا کر بالوں میں الٹی کنگھی پھیری مانگ میں افشال بھری، آنکھوں میں ڈبل، لگایا۔ عرق گلاب میں ہلدی، منگ کافور پھل پھلکری اور دودھ ملا کر چہرے پہ مساج کی، پیرا بڑھے بیچڑے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اس کے گلے کے گرد نیا تولیہ ڈال کر اے پرانے رنگ آلودہ کھلے اترے سے اس کی برائے نام داڑھی مونچھ کے بل مونڈھے۔ چہ اٹھن ملا، لب اسٹک اور غاڑہ لگایا۔ اس دوران چار بوڑھے بیچڑے زرد رنگ کے دوپٹے چاروں کو نے تھامے اس کے اوپر سایہ فگن رہے۔

حاجی صاحب پھر مرا تے میں ڈوب گئے۔ ایک نو عمر خوبصورت بیچڑا، رزق برقی پنے، ایک طشتری میں گھٹی ہوئی تٹا اور چمکتے ہوئے گھنگرو لئے غمو دار ہوا۔ ہاتھ پیروں بند کی بعد پگ میں گھنگرو ڈال دیئے گئے۔ سر پہ کھڑے بیچڑے اوڑھنی اس کے سر، کر غسل خانے کی جانب لے گئے۔ اس عرصے میں حاجی رجنی نیگم نے لگن منڈپ تیار کر درمیان لوہے کے تسلیے میں چندن کا براہہ کچا عود، دسی گھی ڈالا۔ چار رنگین مٹی کی دودھ پانی، شند اور گھی ڈال رکھی گئیں۔ چار چراغ روغن زرد سے بھرے گئے۔ سازندہ ساز سر کرنے بیٹھ گئے۔

پچھلے کمرے سے کچھ بنے سنورے مسکراتے بیچڑے برآمد ہوئے۔ چٹلی نے انگلیاں لہرائیں، شہنائی نے تن اڑائی اور پھر دیکھنے والی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اک ماہتا جس کی صوفشانی سے کمرہ رنگ و نور سے منور ہو گیا۔ کون کافر تھا جو کہتا کہ اس مہ لقا، ادا، ملاح و جمل کے حسین پیکر میں شلیان ناہی لڑکا ہے۔ اب رواں کی پشواڑ، سہارا، سلک کی چولی انگی، شکاری موی سائن کا چور اسی موہ چوڑی تنگ پاسبانہ، قوس و جھلوٹوں کا لہریا دوپٹہ، پگ میں بے پوری منقش چپل۔ سولہ سنگھار، وگ کی لمبی چٹیا

جان لو، عالم بلا سے اس دھرتی پہ آگئی ہو۔

شلیان حاجی صاحب کے چروں میں ریٹیم کی لمبی کی مانند سمٹ گیا۔ بوڑھے کپکپاتے ہاتھوں نے آئینہ بادی، ٹوٹوں کی موتی گڈی پھلور کی پاؤں میں پازیب باندھی گئی۔ شلیان کی خوبصورت آنکھوں سے دو آبدار موتی گرے، نئے جنم پہ یا اپنے مقدر پہ۔ اشارہ ہوا، طلبے پر چوٹ لگی تو سارنگی کے تار بھی لرز کر جھنجھٹا اٹھے۔ رفیع عرف ریشمیں نے پانچا شروع کر دیا۔ تلچ گانے کے بعد حاجی صاحب کے حکم پہ دو مضبوط بیچڑوں نے شلیان کو چت لٹا دیا۔ اس کی پشواڑ سرکائی، حاجی صاحب نے ایک کھلے منہ ہاتھی دانت کی ڈبیا سے کسی مخلول سے بھیگی ہوئی کالے بالوں کی ایک ڈوری نکال۔ دو تین منٹ کے اس عمل کے بعد اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔ مہل بدھلیاں، مبارکیں شروع ہو گئیں۔ بیچڑوں نے شگن کے گیت شروع کر دیئے۔ دسی گھی کا چمڑکلا ہوتے ہی ارد گرد متحس چروں کے آئینوں پہ شعلوں کے عکس کا رقص شروع ہو گیا۔ پیر، بھری کی کڑاسی، شلیان کو کھلائی گئی۔ پاس ہی رفتی ڈگر ماتھے پہ گئے کے پھول باندھے، آنکھوں میں حرص و ہوا کی خباثتیں لئے ہوئے شلیان کو لپٹائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ٹیوری شلہ کے ڈیرے، اس رات کا تصور کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک عود آئی۔ حاجی صاحب نے، شلیان کی ٹھوڑی کے درمیان ننھے سے ڈھیل کے نیچے شہوت کی انگلی رکھی، اس پورن ماشی کے چاند ایسے چہرے کو اوپر اٹھایا۔

”میں صدقے، میں قربان۔ میری بچی! سر اٹھا، من، غور سے سن! یہ سراسے خدا کے علاوہ کبھی کسی کے آگے مت جھکا۔ آج سے تیرا نیا جنم ہو رہا ہے۔ جو جیون تو بتا چکی، اسے بھول جلد تو پوتر اور نرودش ہے۔ کرموں کا لکھا ہو کر رہتا ہے اور جو کچھ ہو جاتا ہے، وہی مالک کی مرضی ہوتی ہے۔ انسان کو ہر حال میں اپنے جیون کے دن پورے کرنے پڑتے ہیں۔ مالک نے جہل نر اور ناری اتارے ہیں۔ وہیں ایک اور روپ بھی پیدا کیا ہے۔ جو نہ ہے نہ ناری۔ جنم لینے والا اپنی اچھیا اور سمٹھالے کر نہیں آتا، وہ تو صرف جیون کا بوجھ اور لوٹھ لے کر آتا ہے۔ تو بھی جیون کا بوجھ اٹھا، لوٹھ چھوڑ۔ جیسا جیون ملا، قبول کر۔“ تھوڑی دیر کے پھر کہنے لگے، ”بہاراج کی رائے اور میری بدھی کے مطابق تو پرش منش کا جنم ہے، ناری نامیں پر ناریوں سے بڑھ کر سندر، سکھی سندھارتھ۔ تو کسی کو جنم دے سکتی ہے، نہ دلا سکتی ہے۔ تیرے جیون کی ابھارنا، تیرے انت پہ ختم ہو جائے گی۔ آج سے تو میری بیٹی اور ہم سب تیرا پرور ہیں، ہم سب تیری سہایت کریں گے۔“

کچھ بیچڑے ڈھولک لے کر بیٹھ گئے جیسے رخصتی کے الوداعی گیت گانے والے ہوں، حاجی

صاحب نے انہیں رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے پھر کہنے لگے۔ ”ہماری رسم رست اور پر کم کے طریقے کے مطابق تمہیں رفیق ڈوگر صاحب سے دوا کرنا ہوگا“ اس رسم کے بعد تم کو طور پر ہماری برادری والی ہو جاؤ گی۔ تمہیں ہر قسم کا تحفظ دیں گے، تمہاری ضروریات خیال رکھیں گے۔“

چند لمحے کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر حاجی صاحب نے حکیم جمالی اور ظہوری سے حلف لینے کے لئے کہا۔ پھر شایان کی خواہش پہ ہی اس کا نیا نام شانی تجویز ہوا۔ یہ نام کو پسند آیا۔ کچھ رسومات کے بعد اس کا آنچل، رفیق ڈوگر کی فیض کے پلو سے باندھا گیا، دو بے کو انگوٹھیاں پہنائی گئیں۔ شانی کو بہت سی دعاؤں کے ساتھ جملہ عروسی میں داخل کر جہاں شیطان صفت رفیق ڈوگر بڑی بے تابی سے اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

نین تارا تو پہلے ہی بیمار تھی۔ سالگرہ کے رونق میلے میں قدرے سنبھلی لیکن اب پہلے سے زیادہ آزرده ہو گئی۔ شایان کے مایوس کن برتاؤ، رویے، خط اور اس کے فیصلے نے اسے پھر پنگ پہ ڈال دیا تھا۔ کھانا پینا چھوٹا تو بے سکتی اور نقاہت سے ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گئی۔ ہونٹوں پہ جیسے چپ کی مہری لگی تھی۔ دن رات کے کسی حصے میں جب بھی ذرا سنبھلتی تو بھیگی آنکھوں سے خط پڑھنے بیٹھ جاتی۔ دل بری طرح ٹوٹ چکا تھا، مستقبل کے سمانے سننے دھواں دھواں ہو چکے تھے، کچھ بھی سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مایوسی اور پریشانی کی یلغار نے خیالات کو بھی بری طرح پر آگندہ کر دیا تھا۔ وہ خود کشی کا سوچتی تو کبھی یوں ہی پڑے پڑے گھٹ مرنے کا ارادہ کرتی۔ کبھی شایان کی مجبوریوں، رویوں مستقبل کی سوچوں سے سر پھوڑتی۔ خط کے ایک ایک لفظ، ایک ایک فقرے کو بار بار پڑھ کر بین السطور مطالب کو سمجھنے کی کوشش کرتی اور ایسے میں کہیں وہ اسے بڑا عظیم نظر آتا تو کہیں بزدل، بے وفا، ہرجائی اور ذہنی مریض۔۔۔ گھر والے اس کی خاموشی اور رویے سے بوکھلا اٹھے تھے۔ اکلوتی لاڈلی بیٹی، ناز و نعم سے پلی ہوئی جوان، خوبصورت اور تعلیم یافتہ۔۔۔ دوا دارو، علاج معالجے سب بیکار ثابت ہو رہے تھے۔ وہ کسی سے بھی تعاون نہیں کر رہی تھی۔ دوائیں بڑی رہتیں۔ خوراک، پھل کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ مردم بیزار، ہمسائے میں زلفی کے گھر والے بھی بہت پریشان تھے، پل پل کی خبر رکھتے، دلداری اور دلجوئی کرتے مگر کسی کو بھی وہ خاطر میں نہیں لارہی تھی۔ شیخوپورہ میں پھوپھی، پھوپھا، بہنوں کو خبر ہوئی تو وہ بھی دوڑے آئے مگر اصل وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں نہ آئی، نہ ہی اس نے شایان کے خط کی کسی کو ہوا لگنے دی تھی۔ شایان خود کئی روز سے غائب تھا، فنی کرم الہی بھی اپنے حال میں مست تھا۔ نین تارا کی پریشانی کی وجہ سے شایان کے والدین بھی ابھی تک شایان کو نہ مل سکے تھے۔

شام کے وقت نین تارا کا بڑا بھائی قاسم علی کسی کام سے اس کے کمرے میں گیا تو وہ چٹ

لیٹی، سینے پہ ہاتھ رکھے بے سدھ سوئی ہوئی تھی، ہاتھ کے نیچے نیلے رنگ کا کفن تھا اور چہرے عجیب سی مروئی چھائی ہوئی تھی۔ پیلی پتھک رنگت۔ اسے اس حال میں دیکھا تو بھائی کا دل دھڑکنے لگا، اچانک اس خوف اس کے رگ و پے میں بجلی کی طرح جھٹکنے مارنے لگا اور بڑے بُرے و سوسے سراٹھانے لگا۔ چیخ نکلتے نکلتے حلق میں پھنس گئی، سُرعت سے آگے بڑھ کر کفن کا کمر جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ الٹی سیدھی چند سطریں پڑھنے کے بعد وہ نین تار کی جانب متوجہ ہوا مگر وہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی، سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ جسم ٹھنڈا تھا، ماتے پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس کی جانب سے قدرے مطمئن ہو کر، پیچھے صوفیہ پہ کر خط پڑھنے لگا۔ اسی دوران اس کی امی بھی کسی کام سے بے آہٹ سی اندر داخل ہوئیں۔

وہ ماں کے سوال کا جواب دیئے بغیر، خط پڑھنے میں منہمک رہا۔ کوئی جواب نہ دیا کر پریشان سی انہی اور نین تارا کے پاس بیٹھ کر تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ دو کے پلو سے اسکے ماتھے پہ آیا پسینہ صاف کیا اور وہ دوبارہ قاسم کے پاس آ بیٹھی۔

”خیر تو ہے بیٹا!۔۔۔ یہ کیا پڑھ رہے ہو، کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔۔۔؟“

قاسم، بوڑھی پریشان ماں کو کیا جواب دیتا، وہ تو شاید سن ہی نہیں رہا تھا کہ ماں کیا کہہ رہی ہے۔ کلن بہرے، زبان لنگ اور صرف آنکھیں زندہ تھیں جو کاتب تقدیر کا نوشتہ پڑھ تھیں یا پھر دل زندہ تھا جو بے طرح دھڑک دھڑک کر پھنسنے کو آ رہا تھا۔۔۔ ماں نے پھر سوال کا جواب نہ پا کر غصے سے اس کے ہاتھ سے خط چھیننا چاہا تو شکستہ چرم خط کا آدھا حصہ کے ہاتھ میں آگیا، وہی حصہ جو وہ پڑھ چکا تھا۔ اس کی محبت اب بھی نہ ٹوٹی۔۔۔ 'آدھ' حصہ وہ پڑھ رہا تھا۔ ان پڑھ بوڑھی ماں، آگ لگی بے قرار آنکھوں سے باری باری خط دونوں ٹکڑوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ آخر ان پہ کون سا خدائی پیغام لکھا ہوا۔ 'بیٹا، ماں کی بات پہ بھی توجہ نہیں دے رہا؟۔۔۔ قاسم خط پڑھ کر خالی خالی نظروں سے مین کو دیکھنے لگا، ماں کی موجودگی کا احساس ہوا تو کھڑے ہو کر کہنے لگا۔

”آپ نے کچھ کہا تھا۔۔۔؟“

وہ پھٹا ہوا کانڈ کا ٹکڑا دکھاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔ ”یہ سب کیا ہے، کس کا خط ہے

اس میں کیا لکھا ہے؟“

وہ ماں کے ہاتھ میں پھٹے ہوئے ٹکڑے کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”یہ دو ٹکڑے ہیں ایک خط کے دو ٹکڑے، دو زندگیوں کے ٹکڑے، عزت و آبرو کے ٹکڑے۔“

وہاں کا ہاتھ تھامے انہیں دوسرے کمرے میں لے آیا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں خط پڑھ کر سنایا۔

اس رات گھر میں چولہا نہیں جلا۔ قاسم نے ماں باپ سے مشورے کے بعد اپنے چھوپا ہو بھی کو بھی خط دکھایا۔ سب سر پکڑ کر بیٹھ گئے، رونا دھونا شروع ہو گیا۔ نین تارا بھی اس صورت حال سے باخبر ہو چکی تھی مگر اس کے باوجود وہ خاموش تھی یا پھر اس کے پاس کہنے سننے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں، جب کشتی ہی ساتھ نہ دے تو ناخدا اسے کیا شکوہ؟— فوراً منشی کرم الہی کو طلب کیا گیا۔ اس نے بساط الٹی ہوئی دیکھی تو سارے حالات و واقعات من و عن بیان کر دیئے۔ شایان کی ماں بے ہوش ہو گئی اور باپ سر ڈال کر بیٹھ گیا۔ جن کا بھٹ بیٹھ بٹے، درجہ اول کا مال بے کار کھنگر روٹے میں تبدیل ہو جائے تو وہ ایسے ہی سر جھکائے، نوٹیاں سینے سے لگائے بیٹھ جاتے ہیں اور سر اللہ کے خوف سے جھکے یا ندامت سے، وہ ہر دو حالت میں اس ریگ گھڑی کی مانند ہوتا ہے جو ریزہ ریزہ نیچے سے بھر کر اوپر سے خالی ہو جاتی ہے۔ ولیس بیکار، دکھ بھاری، درماں ناپید اور درگھٹنا نہیں در آتی ہیں۔ ایسی ہی کسی کیفیت سے نلیان کا باپ دو چار تھا۔ وہ کسی دوسرے کو کیا دوش دے، کیا کسی سے جا کر کہے یا پوچھے اور نب اپنی مرغی ہی دوسرے کے گھر جا کر انڈے دے تو کسی کا کیا قصور؟— واویلا یا کسی کو شتم دینے سے اپنی ہی عزت مزید خراب ہوتی۔ یہ لوگ کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہ رہے تھے، نہ ہی وہ اپنے لاڈلے کو بے دخل کر سکتا تھا، نہ ہی اور کوئی معقول باعزت حل اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بڑا کمزور، بے بس محسوس کرنے لگا۔ شرمندگی کے بوجھ نے اسے زمین میں گاڑ دیا تھا لیکن حالات کیسے ہی دیگر گوں کیوں نہ ہوں، قدرت کسی نہ کسی طرح در کہیں نہ کہیں سے کوئی مداوا بھی پیدا کر ہی دیتی ہے، پتھریلی دیواروں میں سے بھی کوئی روزن نکل آتا ہے۔ حوصلہ، کوشش، صبر اور استقامت سے بڑے بڑے لایخل مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے قاسم کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور حوصلہ دینے لگا۔

”جو ہوا“ سو ہوا۔ حوصلے اور صبر سے کام لو۔۔۔ مایوس ہونے سے کچھ نہ ہو گا۔“

قاسم بڑے قتل سے کہنے لگا۔ ”پھوپھائی! میں شایان بھائی کو صرف اس حد تک قصور وار سمجھتا ہوں کہ اس نے اچھے لوگوں کی صحبت اختیار نہیں کی اور جہاں تک اس کی بیماری اور ٹھنڈی سے انکار کا تعلق ہے، اس معاملے میں وہ بے قصور اور بے بس ہے۔۔۔ ذرا سوچیں! ان حالات میں وہ اور کر، اور کہہ بھی کیا سکتا ہے؟۔۔۔ ٹھیک ہے، وقتی طور پر ہم سب کو دکھ منور پہنچا ہے لیکن ہم سب کے وسیع تر مفاد کی خاطر اس کا یہ فیصلہ درست سمجھا جاسکتا

ہے۔۔۔

اس کے پھوپھانے اثبات میں سرہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“  
 ”اب ہمیں اپنی اور اپنے خاندان کی عزت بچانی چاہئے۔۔۔“ قاسم نے فوراً جواب دیا۔

”۔۔۔ شایان جن راستوں پہ چل نکلا ہے اس سے تو بچنا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔“ ٹوٹا ہوئے بوڑھے باپ نے جواب دیا۔

اب قاسم کے صابر اور شاکر باپ نے پہلی مرتبہ زبان ہلائی۔ ”بھائی جی! کوشش کر لیں کیا حرج ہے۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ کوئی بہتری کی صورت پیدا فرمادے۔۔۔ مایوسی سے کام نہیں چلے گا۔“ وہ اس کے کانڈھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے دلاسہ دینے لگا۔ ”شایان تمہارا ہی نہیں ہمارا بیٹا بھی ہے۔۔۔“

ایک بار پھر منشی کرم الہی سے تفتیش کا سلسلہ چل نکلا۔ وہ ایک ایک بات تفصیل سے رہا تھا اور یہ شریف لوگ سر جھکائے زمین میں گڑے ہوئے دل پہ پتھر رکھے سب کچھ نہ رہے تھے۔ سردست کوئی مناسب لائحہ عمل ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بالاخر منشی کو بابا کی گئی کہ شایان کو تلاش کر کے لے آئے۔

\*\*\*

شرمندگی کے احساس کے بوجھ تلے دبا بوڑھا شایان کا باپ قاسم اور اس کے والدین جن نین تارا کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ دروازے کی جانب پشت کئے اپنے بیڈ پہ لیٹی ہو تھی، اسکی ماں سرہانے بیٹھی نرم نرم ہاتھوں سے اس کا سر داب رہی تھی۔ بوڑھے پھوپھا۔ حسب عادت ہلکے سے کھنکارتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو اس کی ماں نے سر پہ درست کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس کے لہجے کی سرد مہری سے صاف واضح تھا حالات کے کروٹ لیتے ہی ان کی گرم جوشی میں وہ اب پہلے والی بات نہیں رہی۔ صونے بیٹھتے ہی اس نے نین تارا کی طبیعت کے متعلق پوچھا۔

”دیکھ لیں بھائی جی! آپ کے سامنے ہی ہے۔۔۔“ بہن نے سرد مہری سے جواب دیا۔  
 شایان کا باپ اٹھ کر اس کے پاس پلنگ پہ آ بیٹھا۔

”ہوش کرو، بیٹی! تمہارے پھوپھا آئے ہیں۔۔۔“ ماں نے اسے ہلاتے ہوئے کہا۔  
 تارا کے نین کٹورے چمکے ہوئے تھے، آہستہ سے کروٹ لیتے ہوئے اس نے پھوپھا کی با دیکھا اور پھینکی سی مسکراہٹ چہرے پہ لئے سلام کیا۔ ماں نے کمر کے نیچے تکیہ درست کر

ہوئے اسے سہارا دے کر بیٹھا دیا۔

”بیٹا! اللہ تمہیں صحت دے۔۔۔ یہ موقع لمبی بات کرنے کا نہیں۔ تم بیمار ہو اور میرا سینہ بھی غم سے پٹھنا ہوا ہے۔ یہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں کہ تم ہمیں کتنی عزیز ہو مگر بد قسمتی سے جو حالات سامنے آئے ہیں ان کی وجہ سے بد مزگی کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔ لیکن ہماری رشتہ داری کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ ہم اپنے درمیان کوئی بد مزگی یا غلط فہمی زیادہ دیر نہیں رکھ سکتے اس لئے ہمیں بدلی ہوئی صورت حال کے تناظر میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پیشتر نہایت سمجھ داری، دور اندیشی اور تحمل سے کام لینا پڑے گا۔۔۔“

نین تارا کے والد نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے گویا اس کی تائید کی۔ وہ پھر کہنے لگا۔ ”بیٹا! جو کچھ بھی ہوا، اس میں قسمت کا زیادہ دخل دکھائی دیتا ہے۔ ہم تمہارے دکھ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور مجھے یقین ہے، ہماری طرح تم بھی بد نصیب شایان کی مجبوری اور مرض کو اچھی طرح جانتی اور سمجھتی ہو۔ ہم تمہاری زندگی برباد کرنا نہیں چاہتے بلکہ تمہیں ہنسنا بستا، فوٹال اور خوش و خرم دیکھنا چاہتے ہیں۔ شایان بھی تمہارے بارے میں ایسے ہی جذبات رکھتا ہے جس کا ثبوت اس کا یہ فیصلہ ہے۔۔۔“ پھر نین تارا کا کمزور ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پیار اور عاجزی سے کہنے لگا۔ ”بیٹا! تم ہماری مجبوری کے اس فیصلے کو قبول کر کے اپنے بد نصیب پھوپھا پہ احسان کرو گی۔“

پھر وہ چمکتی ہوئی آنکھوں کو چھپائے ہوئے باہر نکل آیا۔

\*\*\*

شایان عرف شانی کو حاجی رجب بیگم کے ڈیرے پر والد صاحب کے آنے اور نین تارا کی ملاقات کی اطلاع مل چکی تھی اور یہ تاکید بھی کہ فوراً ”آگر ملے مگر یہاں تو کیفیت ہی دگر تھی۔۔۔“

ابھی ان کے پاؤں میں مہندی لگی ہے کس۔۔۔ آنے جانے کے قابل نہیں ہیں نئی نویلی دلہن کی طرح نخرے دکھانے اور ناز اٹھوانے کے دن تھے۔ سارا ڈیرہ خدمت اطاعت پہ مامور اور ”بسم اللہ“ جی صدقے، قربان کے آوازے۔ نت نئے لباس، طرح طرح کے کپڑاں۔ مشاطے بال بال موتی پروئے، انگ انگ اٹن ملنے میں مصروف۔ حاجی رجب بیگم ت بات پہ ”جی جان، دلہن، بڑا، بنو، چندا“ سے رطب اللسان۔۔۔ چند روز میں ہی کایا پلٹ وکی تھی، ایسا رنگ روپ آیا کہ دیکھا کرے کوئی۔ چہرے سے رہے سے روئیں بھی موم



سگریٹ سلگانے لگا تو ماں نے ایک زور سے دھاڑ لگائی اور سر منہ سینہ پیٹنے لگی۔ بھاگے بھاگے نین کی امی اور باپ کے ساتھ قاسم اور کاظم بھی اندر آ گئے۔ وہ اندر کی صورت حال سے بے خبر تھے۔ شانی سگریٹ کے مرغولے اڑا رہی تھی، سب ہی اسے دیکھ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے شانی کی ماں کو چپ کرایا گیا۔ شانی نے ماموں، مہمانی، قاسم اور کاظم سے اپنا تعارف خود ہی کرا دیا کوئی جھجک، شرم نہ لحاظ پاسداری، عجیب طوطا چٹشی انداز۔ آنکھوں پہ کوئی ایسا پردہ پڑا ہوا تھا کہ چھوٹا بڑا، ادب لحاظ، کسی بات کی پرواہی نہ تھی۔ جیسے اس روپ سروپ نے اس سے ہاضی کا لٹا چھین لیا ہو۔

”شایان! مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔ یہ بیہودہ لباس، یہ مکروہ حلیہ۔۔۔ کیا تم ایسے بے حیا، بے حس اور گفتگو میں اتنے بے لگام ہو گئے کہ تمہاری نظر میں کسی چھوٹے بڑے کا کوئی احساس نہیں۔۔۔؟“ باپ جیسے پھٹ پڑا۔

شانیا ہلکی سی مسکراہٹ بکھیرے اک شان دلربائی سے سگریٹ کے دھوئیں کے چھلے بنا بنا کر چھوڑ رہا تھا۔ ماں نیم بے ہوش سی پڑی اشک بار آنکھوں سے اسے حسرت بھری نگاہوں سے تنک رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اسے جنم نہ دیتی تو آج یہ ذلت دیکھنی نہ پڑتی یا شاید اپنے کلیجے کے ٹکڑے کی بے بسی اور مجبوری پہ اندر ہی اندر مرمری جاری تھی۔۔۔ جس طرح ہر ترش میں ایک آخری تیر ہوتا ہے اسی طرح ہر الجھے ہوئے مسئلے کے آگے کیس ایک پتھر بھی ہوتا ہے جو سر پھوڑنے کے کام آتا ہے۔ جب ہر کوئی اپنی اپنی بساط کے مطابق سر پھوڑ چکا تو یہ پتھر غنچے کی سی چٹک سے کہنے لگا۔

”آپ کو کچھ اور کہنا ہے۔۔۔؟“ شانی نے بڑی بے نیازی سے پوچھا۔

سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ آخر باپ اپنا حق استعمال کرتے ہوئے بولا۔

”تم ایسے بے حس، بے شرم سے کچھ کہنا شاید فضول ہی ہے۔۔۔ کب سے سر کھپا رہے ہیں مگر تمہارے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکلا بلکہ الٹا بے شرمی سے مسکرا مسکرا کر سگریٹ پیٹے ہوئے ہمارے زخموں پر نمک پاشی کر رہے ہو۔ میں اب اپنے رب سے یہی کہوں گا کہ یا تو میں مر جاؤں یا۔۔۔؟ اس بے عزتی کی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔“

وہ کمال بے نیازی سے انگڑائی توڑتا ہوا اٹھا اور بولا۔ ”اچھا“ میں بھی سوچتی ہوں اور آپ بھی غور کر لیں۔۔۔ اس وقت میرے سر میں شدید درد شروع ہو گیا ہے۔ میں ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں، شام کو بات ہوگی۔۔۔“ وہ سب کو حیران و ششدر چھوڑ کر مسکراتا ہوا، کمرے سے نکل گیا اور اپنے پیچھے سکوت، مرگ چھوڑ گیا۔

”اف! میرے اللہ۔۔۔!“ وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھ خاموشی کی برف سی جم گئی۔ چند لمحوں بعد یہ برف نین کے اندر کی جدت سے پکھلی۔

”شایان! تم۔۔۔ تم جانتے ہو کہ تمہارے اس احمقانہ فیصلے اور شرمناک رویے سے قیامت لٹنی ہے، کیا کچھ ہو گیا ہے اور کیا کچھ ہونے والا ہے۔۔۔“ وہ کسی دکیل کی طرح ہوا

”سوال صرف میری یا تمہاری زندگی کا نہیں ہے، خاندان کی عزت اور وقار کا بھی ہے۔“ اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”ذرا اپنے اس گٹ اپ اور میک اپ کو دیکھو۔ تم کو کیا پہچانتیں، میں خود اب تمہیں نہیں پہچان سکتی۔ تم نے اپنا تو سب بدل لیا حتیٰ کہ باپ کا دیا ہوا نام تک ان کے منہ پہ دے مارا، لیکن کیا تم اپنی خاندانی شناخت، باپ دادا کا جو تبدیل کر سکتے ہو؟۔۔۔ اگر نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے پورے خاندان کو بچھڑا دیا۔۔۔“

وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا، اس لمحے شاید وہ بھول گیا کہ کمرے کے باہر کوئی ہے۔ دوسرے نین کے پھوپھا اور پھوپھو اندر داخل ہوئے۔ دونوں لڑکیوں کو بیٹھے دیکھ کر وہ کچھ تذبذب پڑ گئے اور پھر نین سے پوچھنے لگے۔

”بیٹی! تمہارے کمرے سے مردانہ قہقہوں کی۔۔۔“

”یہ قہقہے میرے تھے۔۔۔“ شانی اٹھتے ہوئے بولی۔

”یہ تم قہقہے لگا رہی تھی بیٹی۔۔۔؟“

نین تار آنے بات اچک لی۔ ”پھوپھا جی! یہ بیٹی نہیں، آپ کے صاحبزادے شایان صاحب ہیں۔۔۔“

پھوپھا اور پھوپھی دونوں حیرت سے ان دونوں کو تنک رہے تھے۔ ان کی بوڑھی آنکھیں اور مختل دماغ ابھی تک اس اسرار کو سمجھ نہیں پائے تھے۔ نین نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور بولا۔

”آپ حیران نہ ہوں، پھوپھا جی! یہ شایان صاحب ہی ہیں۔ آپ کی طرح میں بھی اپنا پہچان نہیں پاتی تھی۔۔۔ آپ سکون اور آرام سے ان کی بات سنیں اور ان کو سمجھا، میری تو کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں اترتی۔“

دونوں کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ باپ کی نظریں زمین میں گڑی ہوئی تھیں اور ماں اپنے جگر کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی، بے چاری کی آنکھوں میں آنسو بھی تو نہیں تھے

”بہتر ہے کہ آپ ماموں، مہمانی اور قاسم بھائی کو بلا لیں تاکہ بات صاف ہو جائے۔ شانی نے اسی موڈ میں مشورہ دیا اور ساتھ ہی پرس کھولا، سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگا

طوفان آنے سے پیشتر اور گزر جانے کے بعد اک پر اسرار قسم کاسکوت طاری ہو جاتا ہے، کچھ ایسا ہی سکوت اس وقت بھی تھا۔ وہاں موجود ہر فرد اندر سے دہلا ہوا کسی انجانے خوف سے لرزاں تھا صحرا گشت اونٹوں کی طرح، جو کوسوں دور بادِ موسم کی آمد کو محسوس کر لیتے ہیں۔ اک دُوبے سے شرمندہ، مٹریہ لب، اندیشوں کی کچھڑی پکاتے ہوئے ایک دوسرے کو تکتے رہ گئے۔ قاسم کے کمرے میں پہنچ کر شایان نے اپنے آپ کو پٹنگ پہ گرا دیا۔ پھر کچھ دیر اپنے آپ سے الجھنے کے بعد جیسے وہ ایک فیصلہ کر کے اٹھا، رائیٹنگ پیڈ لیا اور لکھنا شروع کر دیا۔ پھر جب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی، پوری حلق میں انڈیلی اور پانی کا گلاس غناغٹ خالی کر دیا۔

مغرب کی نماز کے بعد اس کے ماموں اور والد نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو کھانا دسترخوان پہ لگ چکا تھا۔ قاسم، شانی کو بلانے آیا تو وہ گہری نیند سویا ہوا تھا، چہرے پہ کھچاؤ اور ایک ہاتھ سے تکیہ بھینچا ہوا تھا۔ پاس بتائی پہ گلاس کے نیچے کانڈ نظر آیا۔ ”اللہ خیر“ کہتے ہوئے کانڈ نکالا، پہلی سطر پڑھتے ہی بدحواس سا چلاتا ہوا باہر بھاگا۔ لکھا تھا۔

”اباجی! اللہ آپ کو لمبی زندگی دے۔۔۔ میں موت کو اپنی مرضی سے گلے لگا رہی ہوں۔ پوسٹ مارٹم کے بعد میری لاش حاجی راجی بیگم کے سپرد کر دی جائے، تجنیزو تکلفین ان کی صوابدید پہ چھوڑ دی جائے۔ اس سلسلے میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔۔۔ نین تارا اگر مجھے معاف کر سکے تو یہ اس کا آخری احسان ہو گا۔ شادی کے بارے میں، میں نے جو مشورہ دیا تھا اگر وہ اس پر عمل کر سکے تو میری بے چین روح کو سکون ملے گا۔ امی کو میرا چہرہ نہ دکھایا جائے اور میری بہنوں کو رخصتی کے وقت تلقین کیجئے گا کہ وہ اپنے بچوں کو ننگا نہ نسلایا کریں، چلی بھڑیر کٹ لیتی ہیں۔۔۔ بد نصیب، آپ کی گنگار۔ شانی!“

☆☆☆

معدہ صاف کرنے کے پیچیدہ عمل نے دیکھنے والوں کی روح کھینچ لی تھی۔ ڈاکٹروں کے لئے صورت حال بڑی خطرناک تھی، چند منٹ کی دیر اسے موت سے ہمکنار کر سکتی تھی۔ باہر مشاورت کے بعد فوری طور پہ معدہ صاف کر دیا گیا مگر حالت ابھی تک خطرے سے باہر نہیں تھی۔ ڈاکٹر اسے بچانے کی سرٹوڑ کو شش کر رہے تھے لیکن حتمی طور پہ کچھ بتانے سے گریز کر رہے تھے۔ علاقہ پولیس تھانے کے دو ذمہ دار اہلکار بھی موجود تھے۔ آپریشن تھیٹر کے باز اس کے والد، ماں، ماموں، قاسم، نین تارا اور زلفی پریشان، بد حال سے بیٹھے ہوئے تھے۔ باہر کو چپ لگی ہوئی تھی۔ ماں فرش پہ مصلیٰ بچھائے، ہاتھ پھیلائے اس کی زندگی کی بھگ مانگ رہی تھی۔ نین تارا آنکھوں میں سر دیئے چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ باہر لان میں اور بھی عز

رشتہ دار، محلے والے موجود تھے، منشی کرم الہی کسی رشتہ دار کو شیخوپورہ ٹیلی فون کر رہا تھا۔ حاجی راجی بیگم، حکیم جملی، ظہوری شاہ، رفیق ڈوگر، استاد شنو، استاد قریان، پندرہ بیس ہجڑے زنانے روایتی ذوقِ برق لباس اور مخصوص حرکتوں کے باعث لوگوں کی دلچسپی اور شانی کے گھروالوں کے لئے پریشانی اور شرمندگی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ جانے انہیں کیسے خبر ہو گئی تھی جبکہ شانی کے گھروالوں نے اس معاملے میں بڑی رازداری برتی تھی۔ واقعہ کی سنگینی کے پیش نظر اسے فوری طور پر ہسپتال منتقل کیا گیا تھا۔ اس کے لباس اور حلے کو کسی نے اہمیت نہ دی تھی اور ڈاکٹروں کے نزدیک مریض صرف انسان ہی ہوتا ہے۔ مرد، عورت یا ہجڑا نہیں لیکن اس کے باوجود حقیقت اپنی جگہ پہ حقیقت ہوتی ہے، کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی سطح پر اپنا تعارف کرا دیتی ہے۔ آپریشن ٹیبل پہ آپریشن سے پہلے ہی نچلے اسٹاف کی آنکھوں میں استہزائیہ چمک پیدا ہو گئی تھی، آنکھوں آنکھوں سے بات کانوں کان پہنچی تو بڑی مضحکہ خیز صورت پیدا ہو گئی۔ پیشاب کی ٹالی میں، بوتل پینے والے پلاسٹک کے پائپ جیسی تنگی لگی ہوئی تھی جو شاید پیشاب کے اخراج کے لئے تھی۔ بندھی ڈوری والا آدھے سے زیادہ حصہ بے جس مڑھکا کر سیاہ رنگت اختیار کر چکا تھا جیسے جھرنے کے قریب ہو۔ میڈیکل سائنس کی رو سے یہ انتہائی غلط اور خطرناک کام تھا، قانون اور اخلاق کی نظر میں سنگین جرم تھا۔ عطائی، جراح، ہجڑوں کے اکثر بڑے استاد، مجرمانہ ذہنیت کے گرو انتہائی خفیہ طور پہ ایسے آپریشن کرتے ہیں۔ اچھے بھلے مردانہ صفات کے مالک نوجوان، ناچ گانے کے شوقین خوبو لڑکے، زنانہ ذہنیت والے برکانے، ترغیب دلانے، زیر دستی یا کئی خود اپنے ذوق و شوق سے ان قصائیوں کی مشق ستم کا نشانہ بنتے ہیں۔ کئی بد نصیب اس دوران جان سے بھی گزر جاتے ہیں جن کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ لاہور کا ایک ”ڈاکٹر“ تو اس قسم کی وارداتوں کے لئے بین الاقوامی شہرت رکھتا تھا۔ کبھی کبھی اخبارات میں ان لوگوں کی کارروائیاں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ آپریشن کروانے والوں سے رازداری کا حلف لیا جاتا ہے، شرمناک تصویریں کھینچ کر ان کا منہ بند کیا جاتا ہے۔ فیس کے طور پہ کثیر رقم بھی بٹوری جاتی ہے۔۔۔ اور تو اور، صوفیوں میں بھی ایک طبقہ ایسا ہے جو نفس کشی کے بعض مجاہدوں میں روحانیت کی ارفع منازل طے کرنے سے پیشتر ان مجنموں سے فارغ ہونا ضروری خیال کرتا ہے۔ بُدھ، ہندو، مسیحی، مجوسیوں میں بھی اس تصور کو تقویت ملتی ہے۔ مہنت پانڈے، پروہت اور۔۔۔ کشکھوں، راہبوں، سنسٹوں، جوگیوں، نیاسیوں میں اکثر برہمچاری اور چھٹکے ہوتے ہیں۔ ملنگ، مجاور، سائیں ساہو، عامل، تغیرات کرنے والے جتنی سنی لوگ بھی دھیان، گین میں خلل کے اندیشے کے پیش نظر اوائل

میں ہی اپنی مردانہ صفات کا جھٹکا کھادیتے ہیں یا کر دیتے ہیں۔ نفس مارنے کا مطلب وہ شاید اسی عمل کو گردانتے ہیں جبکہ دین فطرت اس مذموم فعل کی سختی سے ممانعت کرتا ہے۔

☆☆☆

ہمالیہ کی ترائیوں اور تبت، نیپال، کھٹنڈو، کاشی، متھرا، بنارس کے تیرتھوں، معبودوں، گھپاؤں میں بڑے بڑے مہان رشی مونی، لائے، گیانی فقیر بابے اسی طرح کی مجروانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان میں اکثریت قدرتی تختوں کی بھی ہوتی ہے۔ بعض مذہبی جنونی اپنے آپ ہی اس عذاب سے چھوٹ جاتے ہیں۔ دن رات کی کثرت ریاضت، خشک بے رنگ ماحول کا اثر انہیں ہمیشہ کے لئے بے ”رغبت“ کر دیتا ہے۔ خلیج کی ریاستیں، سعودیہ اور دیگر مسلم ممالک کے لئے بطور خاص ہجڑے تیار کئے جاتے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان، انڈونیشیا اور فلپائن میں یہ کاروبار باقاعدہ ایک صنعت اختیار کر چکا ہے۔ ہجڑا مافیا کے گماشتے کارندے بے روزگار نو عمر خبرو لڑکوں کو بیرون ملک روزگار کا لالچ دے کر اپنے دام میں پھنساتے ہیں۔ یہاں انہیں ایڈوانس رقم بھی دے دیتے ہیں، پاسپورٹ ویزہ اور ہوائی ٹکٹ کا انتظام خود کرتے ہیں۔ جب مرغا کوڑی نکل لیتا ہے تو اسے بڑے انتظام کے ساتھ اپنے کسی جھٹکا مرکز میں داخل کرادیتے ہیں۔ اس ہجڑے کو علم تک نہیں ہوتا کہ وہ ہجڑا بن چکا ہے، علم ہو بھی جائے تو وہ بد نصیب بدنامی، رسوائی اور بلیک میلنگ کے خوف سے زبان بندی پہ مجبور ہوتا ہے یا وہ ان کے قرضے کے بوجھ تلے اتادب جاتا ہے کہ اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ آئے دن اخبارات میں نو عمر لڑکوں کی گم شدگی، تصویریں، اعلانات، انعامات کے پیچھے اکثر اسی مافیا کے کارندوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عہد جمالت کے غلاموں کی مانند یہ زر خرید غلام عرب شیوخ کے حرموں میں زندگی کی آخری سانس تک قید ہو جاتے ہیں۔ تاریخ عالم پہ نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مخنث ہر دور میں امراء کی ضرورت رہے ہیں، وہ اپنے حرموں میں اپنے سوا کسی اور مرد کا وجود برداشت ہی نہیں کر سکتے یا کسی مرد پہ اعتبار ہی نہیں کرتے۔

☆☆☆

ڈاکٹروں کے بروقت فیصلے اور پانچ گھنٹے کی سروتوڑ کوشش سے شانی کی جان تو بچ گئی مگر پولیس والوں سے جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ شانی کی تحریر سے خود کشی کا کیس صاف اور ثابت تھا، صرف ملزم مریض کے بیان لینا باقی تھے مگر مریض ابھی اس قابل نہ تھا۔ اب ستم، بالائے ستم یہ کہ پولیس نے شانی کے ہجڑا بننے والی حالت کو بھی قابل دست اندازی پولیس بنا کر مزید مڑے پہ سودے والا معاملہ بنا دیا۔ پولیس تو بال کی کھال اتارتی ہے، مریض کے والی وارث

بھی کھاتے پیتے دکھائی دے رہے تھے۔ باہر ہجڑے اُدھم مچا رہے تھے۔ ہسپتال کے سنجیدہ اہل میں بڑی گڑبڑ ہو رہی تھی۔ پولیس تو خطرناک سے خطرناک پارٹی پہ ہاتھ ڈال دیتی ہے، کسی طرح حاجی راجی بیگم کو محسوس ہو گیا کہ پولیس اس کیس میں اسے بھی گھسیٹ رہی ہے، وہ اپنے ہم جہام سمیت وہاں سے کھسک لیا۔ شانی کے وارثوں پہ بڑی مشکل آ پڑی تھی۔ عام حالات میں انسان بڑی سے بڑی مصیبت سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیتا ہے۔ یہ شریف کاروباری لوگ تھے، ہجڑوں اور پولیس سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ ہجڑوں کا کیا، ان کے اپنے پلے تو ہوتی نہیں پھر دو سروس کا کیسا لحاظ؟ پھل پھلنے پہ آئیں تو دو کوڑی کا کر دیں، ان کے منہ کون لگے اور بدعنائیں لے۔ مقطع میں بات گسترانہ آن پڑی تھی، اپنا بچہ بیچ میں تھا۔ ہر ممکنہ طور پر اپنی عزت بچانے کی فکر میں تھے، اخبار والے مختلف سوالات سے الگ پریشان کر رہے تھے۔ ایسے میں عامل ظہوری شاہ اور حکیم جمالی بھی قریب آ گئے اور تسلی دینے لگے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا آپ گھبراہٹیں نہیں۔ وہ ان کی کسی معاملے میں مدد لینا نہیں چاہتے تھے لیکن یہ موقع ہی ایسا تھا کہ وہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے، آپریشن سے پہلے مطلوبہ خون ان لوگوں نے ہی فراہم کیا تھا۔ عجب اتفاق تھا کہ اسے خون بھی انہی لوگوں کا اس آیا اور خون کی فراہمی کا سارا انتظام اور بھاگ دوڑ انہی لوگوں نے کی تھی۔۔۔ حکیم جمالی اور ظہوری شاہ نے انہیں تسلی دی کہ آپ بالکل مطمئن رہیں، پولیس سے ہم نمٹیں گے اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ ان لوگوں نے خدا جانے کون سا جادو کاؤنڈا گھمایا کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ شانی کے گھروالے، ان کی اس معاونت اور ہمدردی سے متاثر ہوئے اور احسان مند بھی ہو گئے۔

شانی، قریب قریب دو ہفتے ہسپتال میں رہا۔ اس دوران گھروالوں کے علاوہ حکم جمالی، ظہوری شاہ، حاجی راجی اینڈ کمپنی، رفیق ڈوگر، سب نے جی جان سے حق تیمارداری نبھایا اور ہر طرح سے خیال رکھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہی اس کے سب کچھ ہیں۔ گھروالے بھی ججل ججل جو بن پڑتا کر رہے تھے مگر صاف ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے یہ سب اندر سے بجھے بجھے سے ہیں۔ شانیان بھی گھروالوں سے زیادہ ان ہی لوگوں کو اہمیت دیتا محسوس ہوتا تھا۔۔۔ ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد جب گھر لے جانا چاہا تو شانیان نے حاجی راجی بیگم کی جانب اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا۔

”ہاں ہاں بیٹی!۔۔۔ ضرور جاؤ اور خوش رہو۔۔۔ یاد رکھو، زندگی اللہ کی امانت ہے۔ اس میں خیانت نہیں کرنی چاہئے۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کی قدر کرنی چاہئے۔ آئندہ کبھی ایسی حماقت نہ کرنا، مالک ناراض ہوتا ہے۔۔۔ اور ہاں، گھبراننا نہیں۔ ہم اپنی بیٹی سے ملنے

آیا کریں، دل بسلا یا کریں گے۔۔۔“ حاجی رنجی بیگم نے بڑی خوش دلی سے دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا۔

وہ گھر پہنچا تو سب کی جان میں جان آگئی۔ نین تارا اپنی بیماری و ماری سب کچھ بھول گئی، ہر وقت اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی رہتی مگر بیچڑا پارٹی نے ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا، چوبیس گھنٹے ایک دو سوڑتیں یہاں سبھی رہتیں۔ ”ہائے اللہ، اوئی اللہ“ کی آوازوں سے گھر ماحول بڑا عجیب سا ہو گیا تھا۔ رشتہ داروں کا بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ یہ لوگ بڑی سبکی محسوس کر رہے تھے۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے آہستہ آہستہ اس گھر پہ ان ہی لوگوں کا قبضہ ہو جائے گا اور اگر یہ نہ ہوا تو گھر کے لڑکوں بالوں میں ایک آدھ ضرور ان کی جانب راغب ہو جائے گا۔ حاجی رنجی بیگم ہر دوسرے تیسرے روز پھل فروٹ، پھول پھلاری سے لدے ہوئے چلے آتے۔ ان کے شاگرد مصاحب بھی ساتھ ہوتے۔ گلی مکھلے میں تماشا لگ جاتا۔ بچے اودھم مچاتے آوازیں اور پھبتیاں کتے۔ یہ صورت حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے تھے۔ نین تارا کے والد اور بھائی منہ چھپاتے پھر رہے تھے۔ نہ ننگتے بنتی تھی، نہ اگلے چھین تھا۔ کریں تو کیا کریں؟ شایان کے والدین بھی دین دنیا سے فارغ یہاں پڑے خون کے گھونٹ پل رہے تھے۔ شایان کو اس حال تک پہنچانے میں بھی کچھ ان بیچڑوں کا ہاتھ تھا اور اب شایان کی زندگی بچانے میں بھی انہی لوگوں کا بہت دخل تھا۔ انہیں اخلاقاً اور شایان کی وجہ سے یہاں آنے سے روکا بھی نہیں جاسکتا تھا، عجیب سی صورت حال، جس میں یہ لوگ چھپنے ہوئے تھے۔ پھر ستم یہ کہ شایان بھی گھر والوں سے زیادہ ان بیچڑوں میں خوش رہتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے زخم بھر رہے تھے مگر گھر والوں کے زخم گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شام وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شایان بھی راہ راست پر آجائے گا، وہ اس کا دل جیتنے کے جتن میں لگے ہوئے تھے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، کے مصداق ”ہنوز دلی دور است والی بات“ تھی۔ آخر والدین کئی ہفتوں سے یہاں پڑے پڑے پیزار ہو گئے اور ایک دن شایان کے والد نے کوئی حتمی فیصلہ کرنے کی ٹھان کر اسے کر لیا۔

”بیٹا! جو ہوا، سو ہوا۔ ہمیں تمہاری پریشانی اور حالت کا پورا پورا احساس ہے۔ تم ہمارے جگر کا ٹکڑا ہو، اکلوتے بیٹے ہو۔ میری حالت اور بڑھاپے پہ ترس کھاؤ۔ اپنی ماں، ممانی، ہر بھائیوں، سب کو دیکھو۔ تمہاری وجہ سے یہ سب زندہ در گور دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے خاندان، حیثیت، شرافت، عزت کی طرف دیکھو۔ تمہارے ان ”مہرمانوں“ لوگوں کی وجہ سے گلی گھر گھر ہماری ہنسی اڑا لی جا رہی ہے۔ لوگ ہمیں بھی دُوم مراثی سمجھنے لگے ہیں، سبھی جانے

والوں نے ہم سے ملنا تک چھوڑ دیا ہے اور یہ سب کچھ ہم صرف تمہاری وجہ سے برداشت کر رہے ہیں مگر یہ سب کچھ شاید ہم زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکیں گے۔ بیٹا! چلو خیر، مٹکی ٹوٹی سو ٹوٹی، گھر کی بات تھی مگر تمہاری یہ روش اور رویہ منگی ٹوٹنے سے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور پریشان کن ہے۔“ وہ اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے التجا بھرے لہجے میں کہنے لگے۔ ”شایان! مجھے اُمید ہے کہ اب تم اپنے بوڑھے باپ اور غم زدہ ماں کو اس بڑھاپے میں مزید رسوائی اور شرمندگی سے بچالو گے۔“

باپ پھس پھس رو رہا تھا کہ ماں اٹھی اور اپنا دوپٹہ اس کے پاؤں میں رکھتی ہوئی فریاد کرنے لگی۔

”پڑا میں نے تجھے بڑی منتوں اور دعاؤں سے حاصل کیا تھا۔ تجھے اپنا دودھ نہیں، خون جگر پلا کر بالا پوسا۔ اس بڑھاپے میں میرے سفید جھانٹے پہ کالک مت لگا۔ ان خدائی مارے کھڑوں کا ساتھ چھوڑ، اتار یہ زنانہ کپڑے اور زیور۔“

وہ اس کے کپڑے نوپنے لگی۔۔۔ پھر اپنا چہرہ نوچ کر لبو لبان کر لیا اور سینہ کو پی کرتے ہوئے بے ہوش ہو گئی۔ ارد گرد بیٹھے ہوئے ماموں، ممانی اور نین بھی رونے لگے، بڑی مشکل سے اس کی نیم بے ہوش والدہ کو سنبھالا، پانی پلایا۔ ماحول بڑا غمناک اور سنجیدہ سا ہو گیا تھا۔ ماں کی فریاد اور آنسو تو پتھر کو بھی موم کر دیتے ہیں مگر اس ”سنگ خارا“ کو نم تک نہ لگی، وہ ویسے ہی بے حس پتھر سا رہا۔

”ماں۔۔۔!“ بخ بستہ لہجے میں، مایوسی کے برف خانہ سے آواز سی نکلی۔ ”تو میری جنت ہے۔ میں نے تجھے بڑا دکھ دیا ہے۔ مجھے معذور اور مجبور سمجھتے ہوئے معاف کر دے۔۔۔“ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے انک انک کر کہنے لگا۔ ”آپ مجھے شاید ایک پتھر سمجھتے ہیں۔۔۔ نہیں، میں پتھر نہیں ہوں۔ آپ ہی کی طرح گوشت پوست کا انسان ہوں۔ سینے میں دھڑکتا ہوا دل بھی ہے۔ اس میں درد اور احساس بھی مگر فرق صرف اتنا ہے کہ میں اپنے آپ کو، آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ آپ اپنے پیار دلار میں میری حالت اور حقیقت کو تسلیم کرنے میں چشم پوشی اور نرمی سے کام لیتے رہے ہیں جبکہ میں نے اسے روز روشن کی طرح تسلیم کر لیا ہوا ہے۔۔۔ علاج کیا یہ حقیقت نہیں کہ میں شادی کا اہل نہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو ممکن ہی برقرار رکھنے اور کسی معصوم بے قصور کی زندگی برباد کرنے کا کیا جواز ہے؟ نین، بچپن سے مجھ سے منسوب کر دی گئی۔ اس میں نین اور میری مرضی یا خواہش کا دخل نہیں تھا۔ میں بعد میں بیمار اور ناکارہ ہو گیا تو اب مجھ، میری مرضی کا دخل نہیں تھا۔۔۔ علاج معالجے میں آپ نے کوئی کسر نہ

نہیں نکلے۔ لوگ منہ پہ ہمدردی اور پیچھے باتیں بناتے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں۔۔۔“

”اباجی! جب قدرت نے مجھے مذاق بنا دیا تو لوگوں کے مذاق سے کیا گھبرانا؟۔۔۔ اسی لئے میں آپ لوگوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو کسی قسم کی دشمنی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ویسے کوئی بھی اپنا مذاق اڑانا نہیں چاہتا اور نہ کوئی اپنی پسند کی باتیں کر پید ہونے پہ قادر ہے، یہ سب اس بے نیازی کی بے نیازیاں ہیں۔ وہ خود کہتا ہے کہ عزت، ذلت، رزق دینے والا میں ہوں۔ اگر ذلت میرا نصیب ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟۔۔۔ آپ لوگ میرے لئے سے پریشان نہ ہوں اور نہ میری وجہ سے لوگوں کی تنقید کا نشانہ بنیں مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔۔۔ برسبیل تذکرہ، ایک اور حقیقت کی نشاندہی کرتا چلوں۔ آپ سے بھی شاید کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں اور اس میں ماں جی اور میری پیاری بہن کا بھی قصور ہے۔ انکو توجہ ہونے کے ناطے آپ نے جس طریقے سے میری پرورش کی، اس کا اثر بھی میری شخصیت پہ پڑا۔ کچھ میری جسمانی ساخت اور کچھ بے جالاؤ پیار، تن آسانی اور ناز و نعم نے بھی مجھے نرم و نازک بنا دیا۔ ہر وقت بہنوں اور لڑکیوں کی صحبت، ویسے ہی کھیل کود، مشاغل۔۔۔ پھر گلی گھلوں کے لڑکوں سے دور رکھا۔ باہر کسی سے کھیلنے دیا۔ کرکٹ، نہ ان بل، نہ بھاگ دوڑ۔ ہر وقت یہی کہ اندر بیٹھو، پڑھو۔ ہر جائز ناجائز خواہش پوری کی۔ کوئی بن مجھے سرمہ لگا رہی ہے، کوئی بال سنگار کر رہی ہے۔ کہیں شادی بیاہ ہوا تو مجھے لڑکیوں جیسے سے پنادیئے۔ ایسی تربیت اور ماحول میں جو بچہ پروان چڑھے گا، آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ ہلوان بنے گا؟۔۔۔ نہیں، وہ زنانہ ہی بنے گا۔ مانا کہ انکو تا اور لاڈلا ہونے کی وجہ سے احتیاط اور غیر ضروری نگہداشت کرتے تھے لیکن کبھی کبھی حد سے زیادہ احتیاط اور اعتماد لاٹاؤ دکھاتے ہیں۔۔۔“

”بس کدو، شایان! تم بہت کچھ کہہ چکے۔۔۔ واقعی، جو والدین اپنی اولاد کو بے جالاؤ پیار کا بنادیتے ہیں اور ان کی تربیت پرورش میں کوتاہیاں برتتے ہیں، انہیں پھر بدترین نتائج کا رونا چاہئے۔ زنانے، چور، نشے باز اور ہڈ حرام بننے میں اتنا ہاتھ اولاد کا نہیں ہوتا جتنا ماں گھر کے ماحول اور حد سے زیادہ لاڈ پیار اور اندھا دھند اعتماد کا ہوتا ہے۔۔۔ میرے بچے! میں یہ سب کچھ مانتا ہوں۔ اب اگر کچھ مدد کرنا چاہوں بھی تو کچھ حاصل نہیں پائی تمہارے اور میرے سرے سے اونچا ہو چکا ہے۔ امید کی صرف ایک کھڑکی ذرا سی کھلی باقی ہے جس سے رہی سہی کچھ عزت بچ سکتی ہے۔ بوڑھا باپ، اپنے انکو تے بیٹے کی مستحجانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ کیا تم ہماری خاطر اتنا کر سکتے ہو کہ یہ زنانہ لباس

چھوڑی۔ میں نے بھی اپنے تئیں کئی ڈاکٹر حکیم آزمائے مگر کامیاب نہ ہوا۔ یہاں بھی آپ اور میرا کوئی قصور یا کوتاہی نہیں۔ پھر یہ تسلیم کرنے میں کیا حرج ہے کہ میرے نصیبوں میں میری یہی لکھا ہے کہ میں ایک نامراد کی حیثیت سے زندہ رہوں یا پھر موت۔۔۔ سنا ہے، خود کشی حرام موت ہے۔ اس طرح کی موت اختیار کرنے والا ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی بار خیال آیا تھا کہ ایسے جینے سے موت بہتر ہے لیکن پھر یہ سوچ کر ارادہ بدل دیتا کہ زندہ رہنے سے اور کچھ نہیں تو آپ کو ہی دیکھ لیا کروں گا۔ حج کراؤں گا، خدمت کروں گا۔ جیسا ہم ہوں گا، کم از کم آپ کے سامنے تو ہوں گا۔ اسی جذبے کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے جیہ تیہ جینے کا فیصلہ کر لیا مگر فیصلہ پتھر کی طرح ہو تو فیصلہ ہوتا ہے، بھر بھری مٹی کی طرح ہوا رسوائی اور حماقت یا جو بھی اور نام دے لیں۔۔۔ جینے کے لئے کسی شخص، حیثیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس موجود حالت اور صورت میں، مجھے میری اس حیثیت اور شخصیت بہتر اور کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ میں نے منافقت سے صرف نظر کر کے اسے تسلیم کر لیا ہے اور آپ حقیقت سے نظریں چرا کر اسے ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔ پھر آپ نے نہ خود اپنی زبانی میری یا اپنی موت مانگی تو میں نے اپنا فیصلہ آپ کی زندگی کے حق میں کر دیا۔ میرا ماں اور بہنوں اور باقی خاندان کو مجھ سے کہیں زیادہ آپ کی ضرورت ہے۔۔۔ میں نے مور کے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی مگر آپ نے مجھے مرنے بھی نہیں دیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ کیا کروں، نہ آپ مجھے مرنے دیتے ہیں اور نہ جینے۔۔۔“

”تم جگ جگ جو پڑا خدا تمہیں ہماری زندگی بھی دے۔۔۔“ ماں اپنے لہجے میں متا حلاوتیں گھولتے ہوئے دعائیں دینے لگی۔ ”میں تو تیری باتیں سن سن کر حیران ہو رہا ہوں۔۔۔ جیون جو گیا! ماں صدقے، ہم تو تیری خیریں مانگتے رہتے ہیں۔ میرے منہ خاک مرنے کی باتیں کرتا ہے۔ اسی دن کے لئے تجھے بڑا کیا تھا۔۔۔“ اسے پھر رونے کا دورہ پڑ گیا۔ ”رو مت، نیک بخت! صبر کر، نصیبوں کی کھیتی کاٹنی پڑتی ہے چاہئے گہیوں ہولہ بھڑک۔۔۔ دعا کر کہ اللہ اس کے لئے بہتر کرے اور ہمیں صبر اور برداشت دے۔“ باپ اس کی جانب متوجہ ہوا۔ ”پتر شایان! تم جیتے، ہم ہارے۔۔۔ اولاد کیسی بھی ہو، ماں باپ لئے اولاد ہی ہوتی ہے، ماں باپ کے پیش نظر ہمیشہ اولاد کی بھلائی ہی رہتی ہے۔ میں ایک بار کہوں گا کہ ہماری خاطر تم اپنے لباس اور چیلے پہ نظر ثانی کرو اور ان زنانوں سے میل جول کر دو۔۔۔ کاش! تمہیں اندازہ ہو تاکہ ان لوگوں کی آمدورفت سے ہمیں کن کن لوگوں کیسی کیسی باتیں سننی پڑتی ہیں۔۔۔ شرم اور صدمے سے تمہارے ماموں کئی روز سے

اور حلیہ تبدیل کر لو اور اپنے گھر میں رہو۔ ہم تمہاری ہر ضرورت پوری کریں گے، تمہیں قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

وہ ہنسی سی ہنسی ہنسا اور بولا۔ ”یہ ممکن نہیں۔ چوہا چاہے لاکھ بل میں گھسا بیٹھے، دسترس سے محفوظ نہیں ہوتا۔ وہ کبھی نہ کبھی باہر نکلے گا۔ مجبور ہوتا ہے اور پھر وہ ملی کے گھر میں پڑا ہوتا ہے۔“

”شایان! مجھے یہ مثالیں نہ دو، تم چاہو تو ایسا کر سکتے ہو۔“ باپ نے اسے مزید مزرا خاطر کہا اور پوچھنے لگا۔ ”کہیں تم ان لوگوں کے دباؤ میں تو نہیں ہو؟“ شایان! خدا کے اگر کوئی ایسی بات ہے تو اپنے باپ سے بلا خوف کہہ دو۔ ہم تمہاری پوری پوری مدد کریں گے۔ تم نہیں جانتے کہ یہ خبیث، بھولے بھالے بچوں کا برین واش کر دیتے ہیں، لالچ اور حربوں سے اپنے چنگل میں پھنسا لیتے ہیں، کسی کمزوری اور مجبوری کو پکڑ کر بلیک کرتے ہیں۔“

”نہیں! اباجی! ایسی کوئی بات نہیں۔ بات اگر کوئی ہے تو یہ ہے کہ لولا لنگڑا، مریض، چور، ڈاکو یا دہشت گرد تو گھر میں رہ سکتا ہے، زنانہ یا بیچرا نہیں رہ سکتا۔ یہ کم پردے میں چھپا نہیں جاسکتا، زنانہ لباس کے سوا کوئی اور لباس اس کے جسم پر فٹ نہیں زبان چپ رہے تو اس کا جسم بولتا ہے، جسم چپ ہو تو اسکی بوبولنے لگتی ہے۔ یہ منافق ہوتا، اندر باہر سے ایک جیسا ہوتا ہے اور اسی لئے یہ اپنی حقیقت تسلیم کرتے ہوئے اپنے میں رہتا ہے۔ باقی رہی گھر میں رہنے کی بات تو زنانہ اپنے ماں باپ کے گھر میں جنم لے سکتا ہے وہاں رہ اور مرنے کا کام اس کی برادری میں ہوتا ہے۔ یہاں رہ کر آپ سب کے لئے پریشانیاں پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے، جہاں میں ہوں! ان لوگوں کی آمد و رفت بھی رہے گی جسے آپ پسند نہیں کرتے۔ میں آپ سے ملنے آیا گا۔ بس، میرے لئے دعا کریں۔“

بوڑھا بے بس باپ زچ ہو کر پوچھنے لگا۔ ”کیا تم اپنی مارکیٹ میں بھی نہیں گئے؟“

”اس کا فیصلہ میں ابھی نہیں کر سکتا لیکن زیادہ ممکن ہے کہ میں وہیں رہوں اور بھی جاری رکھوں۔“

اب کوئی بات پردے میں نہیں رہی تھی۔ اپنے بیگانے، سب ہی واقف ہو گئے تھے والے بھی سر پہ پڑی بھانے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو چکے تھے۔ جب انسان کے سامنے

راستہ نہ رہے تو وہ حالات سے سمجھوتا کرنے پہ مجبور ہو جاتا ہے اور حالات چاہے کیسے سہل کیوں نہ ہوں، وہ حالات کے مطابق ان کا مقابلہ کرنے کی اپنے اندر ہمت پیدا کر لیتا۔ بوقت کا سجاد دھیرے دھیرے اس میں جینے کا حوصلہ لگن اور اعتماد بحال کر دیتا ہے۔ اس کرنے وقت میں اگر کسی نے کچی ہمدردی اور ہمسائیگی کا حق بھجایا تھا تو وہ زلفی کا گھرانہ قدم قدم، سانس سانس انہوں نے اپنائیت کا اظہار کیا تھا۔ ادھر چوہا ٹھنڈا رہا تو پکا پکایا کھانا ہے آیا، ہسپتال آنا جانا رہا تو گاڑیاں ان کی تیار ملیں۔ ہسپتال میں انشغلات، پولیس، پریس، زلفی اور قاسم پیش پیش رہے۔ اب بھی وہ دن رات شایان کے پاس آتا جاتا، اس کا دل لہ لہنے چلنے، اچھی اچھی دلچسپ باتیں، آج تک اس نے شایان سے نہ تو اس کے ذاتی ات کے متعلق کبھی کوئی بات کی اور نہ ہی بے جا چند نصیحت سے اس کا موڈ خراب کیا اور ات تو یہ تھی کہ شایان بھی دل کی گہرائیوں سے اس کی عزت اور قدر کرتا تھا، اسے میٹھی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔ مزید دو ہفتے اسی طرح آرام سکون اور قاسم، زلفی کی صحبت میں گزر گئے۔ نین نے بھی جیسے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ شایان کے امی، ابا والہیں براہ چلے گئے تھے۔

اگلی شام شایان اکیلا لیٹا ہوا یہاں سے رخصت ہونے کی سوچ رہا تھا کہ زلفی آم اٹھائے، اندر داخل ہوا۔ اچانک اس کے آجانے سے شایان کو بے حد خوشی ہوئی، وہ جیسے کھل

”اچھا ہوا زلفی صاحب، آپ آ گئے۔ آج آپ سے بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہ رہا۔“

”مفرد۔۔۔ دل کھول کر باتیں کریں۔ میں یہاں حاضر ہی اس لئے ہوتا ہوں کہ آپ کریں، دل دماغ کا بوجھ ہلکا ہو اور میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔“

”بس! بہت بہت شکریہ۔۔۔ اس مشکل وقت میں آپ نے اپنوں سے بڑھ کر ساتھ دیا سوچتا ہوں، آپ کے احسانوں کا بدلہ کس طرح چکا سکوں گا۔“ وہ اداس سے لہجے لئے لگا۔ ”آپ جانتے ہیں، میرا کوئی بھائی نہیں۔۔۔ کاش! میرا کوئی آپ جیسا بھائی۔۔۔ یہ کہتے کہتے وہ روہا سو ہو گیا۔“

”شایان بھائی!“ وہ اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”یقین کریں، میں نے بہت میں ہی آپ کو اپنا بھائی بنا لیا تھا۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ کاش! میں آپ کا بھائی کا بھائی! میں آپ کا بھائی ہی ہوں۔ سچ بتائیے، آپ نے میرے خلوص یا پیار میں کہیں

کوئی کمی دیکھی؟۔۔۔ سچی بات یہ ہے کہ آپ جیسا پیارا اور حوصلہ مند بھائی پاکر میں اپنے کو دنیا کا خوش نصیب انسان محسوس کرتا ہوں۔“

شلیان کی آنکھوں میں جیسے ساون بھادوں اتر آیا، وہ بچوں کی مانند بلک بلک کر رونا زلفی نے بڑھ کر اسے سینے سے چمٹا لیا اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے دلاسا دینے لگا۔  
”شلیان! کبھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہ کرنا، میں ہر دکھ سکھ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارے اس الیے کو جس شدت سے میں نے محسوس کیا ہے، اس کا اندازہ شاید تم کو۔۔۔ میرے بھائی! شروع سے اب تک میں تمام حالات سے واقف ہوں۔ گو اس پر میں نے تم سے کھل کر کبھی بات نہیں کی مگر اس کے باوجود میں تمہارے احباب مجبور یوں اور مشکلات سے بے خبر نہیں ہوں۔ ہونی ہو کر رہتی ہے مگر ایماندار کی ہے کہ ان حالات میں تم نے جس جرات کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے میں بڑا متاثر ہوا ہوں کچھ بھی کہے، تم اپنے موقف کے حوالے سے صحیح ہو۔۔۔“

شلیان آج پہلی بار اس کی اس قسم کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ پہلے تو محض ایک خوش باش انسان سمجھتا تھا مگر آج جب اس نے اپنا اندر کھولا تو احساس ہوا کہ ایک کھلنڈرا انسان ہی نہیں بلکہ ایک دردمند، حسان اور محبت سے بھر ا دل رکھنے والا بھی ہے۔۔۔ اس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔

”زلفی! تم نے مجھے جینے کا حوصلہ دیا ہے، میں اس کے لئے تمہارا بے ہوں۔۔۔“ پھر ذرا ٹھہر کر کہنے لگا۔ ”زلفی بھائی! اگر تم اجازت دو تو کچھ ذاتی نوعیت کے سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔۔۔“

”اجازت کی ضرورت نہیں۔۔۔ بھائی ہو تو بھائی کے ناطے سے جو چاہے، پوچھو۔“

”تم۔۔۔ تم نین تارا سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“  
زلفی ہلکا تامل بولا۔ ”اس سے پیشتر کہ میں تمہارے سوال کا جواب دوں، ایک کر دوں۔ میری تم سے دوستی، ہمدردی یا اس گھر سے لگاؤ نین تارا کے حوالے سے آپ سب لوگوں کی شرافت کی وجہ سے ہے۔ یہ سچ ہے کہ نین تارا جیسی باحیا اور لڑکی مجھے اچھی لگی تھی، میرے ہی ایمان پہ پیغام بھی بھیجا گیا تھا لیکن یہ قصہ اس وقت ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس کی منگنی بچپن سے تم سے ملے ہو چکی ہے۔۔۔“ وہ کہنے پھر نظریں جھکا کر بولا۔ مجھے اس حماقت کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔ ”اس گھر سے ہمارے کافی پرانے اور گہرے ہیں، یہاں تک کہ لوگ ہمیں آپس میں رشتہ دار سمجھتے ہیں۔“

ہلے آسمان پہ ملے ہوتے ہیں، محض چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا اور جہاں لڑکیاں ہوتی ہیں وہاں پیغام بھی آتے ہی رہتے ہیں مگر ہوتا ہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ اب تو میں نے کبھی اس بارے میں سوچا تک نہیں بلکہ میری خواہش ہے کہ نین کی شادی تم جیسے اچھے انسان سے ہو جو بہت سی خوبیوں کا مالک ہے۔۔۔“

”تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو، اس کے باوجود ایسی بات کہہ رہے ہو۔۔۔؟“  
”میری جان! مایوس ہونا گناہ ہے۔ میڈیکل سائنس نے بڑی ترقی کر لی ہے اور ممکن ہے کہ مستقبل میں تمہارے اندر کوئی خوشگوار تبدیلی آجائے۔۔۔“  
”مجھے طفل تیلیوں سے مت ہلاؤ، میں اپنی حالت خوب اچھی جانتا ہوں۔۔۔ ہاں، تم ابھی کہہ رہے تھے کہ نین بڑی اچھی لڑکی ہے اور میری اپنی ذاتی رائے میں تم بھی بہت اچھے لڑکے ہو۔ تمہارے اندر وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو اس کے جیون ساتھی میں ہونے چاہئیں۔ میری خواہش ہے، زلفی! کہ نین جیسی ہمہ اوصاف لڑکی تمہاری شریک حیات بنے۔۔۔“

زلفی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔ ”تم نے بہت بڑی بات کہہ دی ہے، دوست! مگر ایسا ممکن نہیں، میں سارے کئے کرائے پہ پانی پھیرنا نہیں چاہتا۔ لوگ اور نین بھی سمجھیں گے کہ میں یہ سب کچھ صرف اسی خاطر کرتا رہا ہوں اور پھر حقیقت یہ ہے کہ میرا اس کا کوئی بوجھ نہیں۔ وہ مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی اور بے شمار خوبیوں کی مالک ہے، میں کسی طور اس کے پیار پہ پورا نہیں اترتا۔۔۔“

”یہ تو خیر، تم کس رفتی سے کام لے رہے ہو۔۔۔ کوئی اور معقول وجہ ہو تو بتاؤ؟“  
”سچ پوچھو تو شادی کرنے کو میرا دل نہیں چاہتا جب تک۔۔۔“ زلفی سوچ میں پڑ گیا۔  
”جب تک کیا۔۔۔ کھل کر بات کرو، مجھ سے کیا پردہ ہے؟“  
”کچھ نہیں، یار! بس یونہی۔۔۔“ زلفی نے ٹالتے ہوئے جواب دیا۔  
”اس کا مطلب ہے کہ تم نے ابھی ابھی جو بھائی بندی کا دعویٰ کیا ہے، وہ بس یونہی ہے۔۔۔“

”نہیں نہیں، تم تو کم از کم ایسی نہ بات سوچو۔۔۔ تم خود پہلے ہی پریشان ہو۔ میں تمہیں زبردستی نہیں کرنا چاہتا۔۔۔“  
”بھائی ہو تو صاف صاف ساری بات کرو، مجھ سے نہیں کہو گے تو دیواروں سے کوئی میری فکر نہ کرو، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کسی اپنے کے سامنے دل کا غبار نکالنے سے

آدمی پریشانی دور ہو جاتی ہے اور پھر جب دو دماغ مل جائیں تو کوئی بہتری کا راستہ بھی نکل آتا ہے۔۔۔ بے دھڑک بات کرو، میرے سینے میں تمہارا راز محفوظ رکھنے کے لئے بڑی کشادگی ہے۔۔۔“

”شایان! میرے والد صاحب کی پہلی شادی اپنے خاندان میں ہوئی تھی۔ میری پہلی والد سیدھی سادی گھریلو سی خاتون تھیں۔ والد صاحب پڑھے لکھے، کاروباری اور وسیع حلقہ احباب رکھنے والے انسان تھے۔ آپس کے طبعی تضاد کے باعث گھر میں اکثر دھڑکن اور ناچاقی کی فضا قائم رہتی تھی۔ جیسے تیسے تین چار برس گزر گئے۔ اس دوران تین بیٹیاں اور تے پیدا ہوئیں۔ اولاد زینہ کا بہانہ بنا کر والد صاحب نے دو بہری شادی، یعنی میری ماں سے شادی کی جس پر خاندان میں کافی لے دے ہوئی لیکن جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ والد صاحب روزمرہ کی بچ سے بچنے کی خاطر لاہور آ گئے، پہلی بیوی مصوم بچیوں کو لے کر دل برداشتہ سی نیکی بیٹھیں۔ والد صاحب نے بچیوں کی کفالت کے لئے پیش کش کی مگر انہوں نے کوئی مالی اعانت قبول کرنے کی بجائے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ والد صاحب نے مجبوراً ”مکان اور کچھ رقم بچیوں کفالت اور شادی کے لئے ان کے نام کرتے ہوئے طلاق دے دی۔“

وقت گزرا، بچیاں بڑی ہو گئیں۔ جوانی کی حد سے گزر کر والد صاحب بھی بڑھاپے کی دہائی پہنچے۔ وقت بدلا، خیالات بدلے تو اولاد کی محبت جاگی۔ کئی بار ان سے رابطہ کرنے کوشش کی مگر اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت پانی گزر چکا تھا۔ انہوں نے ہمارے والد صاحب کے لئے سارے در، دروازے بند کر دیئے ہوئے تھے۔۔۔ ادھر ہم بھی جوان ہو گئے والد صاحب سے چوری چھپے اپنی پہلی ماں اور بہنوں کی خبر گیری کرتے رہے، کبھی کبھی ان مل ملا بھی لیتے تھے۔ ایک وقت آیا کہ ہماری سوتیلی امی کے والد فوت ہو گئے، بھائیوں آنکھیں پھیر لیں۔ بڑی بچی جوان ہو چکی تھی، سکول سے نکل کر کالج میں پڑھنا چاہتی والدہ اپنے ایک نایاب بھائی کو جنہیں بچیاں ماموں نہیں بلکہ اپنا والد سمجھتی تھیں، ساتھ لاہور آئیں۔ کچھ عرصہ تو بڑے سکون سے گزرا، جو پاس پلے تھانے شرکی نئی ضرورت کالج فیس، داخلے پر خرچ ہو گیا۔ منگائی نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ مجھ سے جو ہو کا کالج فیس، داخلے پر خرچ ہو گیا۔ منگائی نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ مجھ سے جو ہو کا والد اور والدہ سے چوری چوری کرتا رہا۔ ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح وہ والد صاحب مالی مدد قبول کر کے اپنے حالات درست کر لیں مگر ان کے دل میں جو گرہ پڑ چکی تھی وہ تھی، نہ کھلی بلکہ وہ میری بھی کسی ہمدردی سے نہ خوش ہوتیں، نہ ہی میری کوئی مالی امداد دلی سے قبول کرتیں۔ ان کے حالات دن بہ دن دگرگوں ہوتے گئے۔ والدہ نے چولہا گرم

کی غرض سے گھر پر رضائیں سنی شروع کر دیں لیکن اخراجات کا بھوت ننگا نچ رہا تھا، کسی طور پوری نہیں پڑتی تھی۔ بڑی لڑکی نے جب ماں کو اتنی محنت کرتے دیکھا تو بغیر بتائے پڑھائی کے ساتھ ساتھ ایک بچوں کے گارمنٹ بنانے والی فیکٹری میں پارٹ ٹائم ملازمت کر لی۔ پھر چل سو چل، زیادہ پیسے کے لئے کبھی یہاں اور کبھی وہاں سر پھوڑنے لگی۔ مرے کو مارے شاہ مدار، بیٹا ماموں اپنی بہن، بھائیوں کے غم کو دل پہ لگا بیٹھا۔ ماں زانو ٹاپتا، ایک بازو سے بھی کمزور۔ کچھ کرنے کرانے کا اہل نہ تھا۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے خون تھوکا، ہسپتال پہنچا تو کینسر کا مریض نکلا۔ اس پہ بھی کلنی خراج اٹھا۔ چند دنوں بعد جب اس کا جنازہ اٹھا تو ان کے گھر تیسرا فاقہ چل رہا تھا۔ ”پھر۔۔۔“ چند لمحے جیسے پھر کے پر پھر پھڑاتے رہے۔

”آپ، پھر سے آگے بڑھیں۔“ شایان نے بچھے ہوئے لمبے میں کہا۔

”ہاں، پھر۔۔۔“ جیسے وہ چونک پڑا ہو۔ ”پھر میری بہن بھوک کو برداشت نہ کر سکی، وہ بھگ گئی۔ جانے کن حالات اور کن مجبوریوں میں اس نے منشیات میں اپنے دکھوں کا مداوا تلاش کر لیا۔ بھوک اور مجبوریوں کے بھوت نے اسے نگل لیا، پڑھائی ختم ہو گئی۔ وہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتی، بے خوابی کی مریض ہو گئی۔ ساری ساری رات سگریٹ چھوکتی رہتی۔ بہوئن میں اسے سکون ملنے لگا۔ عزت ناموس، شرم حیا، بے معنی چیزیں ہو کر رہ گئیں۔ وہ پڑی سے اتر گئی، ضرورتوں کے لئے اپنا آپ بھی داؤ پہ لگا دیا۔“

وہ سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔ شایان نے اس کا سر اٹھایا تو چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

”اب وہ کس حال میں ہے۔۔۔؟“

”خدا جانے کس حال میں ہے، زندہ بھی ہے یا۔۔۔ ایک دن وہ ماں کی ناگفتہ بہ حالت اور بہنوں کے سکول کی فیس کی وجہ سے سخت پریشان تھی، اسی پریشانی کے عالم میں گھر سے نکلی اور اس کے بعد کسی نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔۔۔ نہ جانے اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ اس کی تلاش کی ہر کوشش رائیگاں گئی۔ ہسپتال، تھانے، دارالاندن، غرض کوئی ممکنہ جگہ نہیں مل سکی۔ اسے تلاش نہ کیا ہو۔۔۔ غم زدہ ماں نے شک کی بنیاد پر والد صاحب کے خلاف پرچہ درج کروا دیا، سخت پریشانی اٹھانے پڑی۔ والد صاحب اپنی بدنامی اور بیٹی کے غم میں غرق ہو گئے۔ اپنی پہلی بیوی بچیوں سے جو تھوڑی بہت ہمدردی تھی بھی، وہ بھی جاتی رہی کہ اس بڑھاپے میں یہ بدنامی ملی۔ ان کے خیال میں یہ بھی انہیں بدنام کرنے کی سازش کی گئی تھی اور اس کے لئے وہ اپنی پہلی بیوی کو قصور وار ٹھہراتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ان سے نہ ملنے کا سختی سے حکم دے دیا لیکن اس کے باوجود میں نے فیصلہ کیا کہ میں کسی صورت انہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا کیونکہ

جو کچھ میں ان کے حالات کے بارے میں جانتا ہوں، وہ والد صاحب نہیں جانتے۔ وہ تو میری والدہ سے شادی کر کے ان سے منہ موڑ بیٹھے مگر میں اپنی بہنوں سے کیسے منہ موڑ سکتا ہوں۔ وہ میرا خون ہیں، میرے باپ کی اولاد ہیں اور بڑی امی ایک رشتے سے میری پھوپھو بھی لگتی ہیں، پھر میں کیسے لا تعلق رہ سکتا ہوں۔؟“

”تم ٹھیک کہتے ہو، زلفی! تمہارے والد کو بیوی اور اولاد بھی مل گئی مگر تمہاری سوتیلی امی سے تو سب کچھ چھن گیا بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی بربادی اور ان کو اس حال تک پہنچانے کے ذمہ دار صرف اور صرف تمہارے والد ہیں۔ بہر حال، بڑی امی اور بہنوں کے متعلق تمہارا جذبہ قابلِ قدر ہے۔ خدا کرے کہ تمہاری بہن جہاں بھی ہو، سلامت ہو۔۔۔ ویسے تمہارا خیال ہے کہ وہ کہاں ہو سکتی ہے؟“

”بھائی! اخباروں میں اشتہار دینے کے علاوہ ہر ممکنہ کوشش کر کے دیکھ لی، اشتہار دینے سے اس لئے بھی اجتناب کیا کہ اس طرح والد صاحب کا نام لامحالہ آئے گا، رسوائی ہوگی، ناراضگی کا بھی ڈر ہے۔ وہ پہلے ہی مجھے ان کا طرف دار سمجھتے ہیں۔۔۔“ پھر وہ اداس سا ہو کر بولا۔ ”میرے منہ میں خاک، کہیں اس خودکشی نہ کر لی ہو لیکن ایسی صورت میں بھی کسی اخبار کسی خبر کے ذریعے اسے سامنے آنا چاہئے۔ اس طرف بھی دھیان جاتا ہے کہ کہیں اپنے چچو کسی سیٹلی یا دوست کے ہاں نشے میں ڈوبی پڑی ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ کہیں بد قماشوں کے ہتھے چڑھ گئی ہو۔۔۔“

”ہاں، بہت ممکن ہے۔۔۔“ شایان نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہا۔ ”اچھا، دوست! خدا کرے کہ ہماری بہن جہاں بھی ہو، سلامت ہو۔ تم تلاش جاری رکھو، تم قدم قدم تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔“

”شایان! ایک بات اور کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں نے سنا ہے، بلکہ خود بھی محسوس کیا ہے کہ تم بھی منشیات استعمال کرتے ہو۔ اگر یہ سچ ہے تو ایک بھائی کی التجا ہے کہ اس لعنت سے دور ہو۔ یہ نشہ انسان کے پلے رسوائیوں، پیاریوں اور انجام کار بھیانک موت کے علاوہ اور کچھ نہیں ڈالتا۔۔۔“

شایان نے جواب دیا۔ ”تم نے بالکل سچ کہا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں منشیات کا علاج نہیں ہوں البتہ کبھی کبھی موج میلے میں انکار بھی نہیں کرتا۔۔۔ ویسے بھی میرے پلے نہیں ہے جس کے بگڑنے یا برباد ہونے کا خدشہ ہو۔ اب رہی بھیانک موت! تو ہم ہجڑوں، موت صرف موت ہوتی ہے، بھیانک یا خوبصورت نہیں۔ ہجڑے اندھیرے منہ، منہ اندھ

ناہوشی سے مر جاتے ہیں۔ نماز، جنازے سے بے نیاز کسی اندھے گڑھے میں گڑ جاتے ہیں۔ ان کی قبریں ہموار اور بے نام و نشان ہوتی ہیں۔ دیانہ بقی، پھول نہ پتی، کتبہ نہ لوح، موتیانہ نیاز بو۔ منافقت، تکلف، تصنع سے منوں مٹی دور، موت سی موت۔۔۔“

”توبہ ہے، یارا! تمہاری باتوں سے خوف آنے لگتا ہے، جیسے کوئی پراسرار مخلوق تمہارے اندر حلول کر گئی ہو۔ اپنی عمر، علم، تجربے سے بہت آگے سوچتے اور بولتے ہو۔۔۔“

”نہیں، بھائی! ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ اصل میں جب مجبوری اور محرومی کے دو باتوں کے درمیان آرزوؤں کا گھیسوں بے بسی سے پس کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کا ہر سالہ، اپنی سالمیت کے لئے تحفظ اور تخصّص چاہتا ہے اور جب ایسا نہیں ہوتا تو پھر وہ ایٹم، ایٹم ہم کی مانند پھٹ جانا چاہتا ہے۔۔۔ بس، ایسی ہی کوئی کیفیت ادھر بھی سمجھ لو۔۔۔“

”ارے سائنس دان، بھائی! بد قسمتی سے میں اتنا پڑھا لکھا نہیں ہوں، ایسی باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔۔۔“ زلفی بولا۔

یہ دن ایسی ہی باتوں میں گزر گیا۔ اگلے روز وہ دوپہر سے پہلے حاجی رتی بیگم کے ہاں پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆

ایسے خرابے میں اڑائے کہ ہڈیاں دھواں چھوڑنے لگیں۔ بازوؤں کا کوئی ایسا مسام نہ بچا جس سر نہیں نہ ٹھکی ہوں۔ ایک وقت آیا کہ خون زہر ہو گیا۔ عام منشیات، تیز سے تیز شراہیں بے اثر پڑ گئیں۔ پاکستان ہو تا تو زبان پہ سانپ ڈسوتا، وہاں نت نئے سریلع الاثر نئے آزماتا رہتا۔ اسی تلاش میں ایک آبرو باختہ، تمکین عورت سے ڈبھیڑ ہو گئی، یہ بھی کسی ناگن کی نسل سے تھی، اس نے اسے ایک انتہائی خوفناک نئے بلیک ٹائیگر سے متعارف کرایا جو انجکشن کے ذریعے پاؤں کے ناخن کی جڑ میں لیا جاتا تھا۔ کالے ناگ کے زہر سے کئی گنا زیادہ زود اثر کہ نئے کی آخری حد تصور کیا جاتا اس کا عادی بھوک، پیاس، آرام سے بے نیاز ہو کر ہر وقت بدکاری کی جانب راغب رہتا۔ عیاش لوگ اسے بطور خاص استعمال کرتے۔ خون آہستہ آہستہ تار کول کی طرح سیاہی مائل ہو جاتا تھا۔ سر کے بال اڑ جاتے۔ زبان کالی، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے ابھر آتے۔ اگر عورت اور مرد دونوں عادی ہوتے تو وہ کئی کئی دن دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے رہتے۔ اس کا عادی شاید ہی کوئی اکیلا مرا ہو ورنہ ساتپوں کے جوڑے کی مانند، آپس میں لپٹے ہوئے واصل جہنم ہوتے تھے۔

شہزاد کو اس نئے نے کچھ ہی عرصہ میں انسان سے خون آشام درندہ بنا دیا۔ شکل و صورت جو بگڑی سو بگڑی، پاؤں کے ناخن سیاہ پڑ کر طوطے کی چوچ کی مانند مڑ گئے تھے۔ یہاں آیا تو یار دوست اسے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ شہزادوں جیسا خوبصورت نوجوان، اب امریکن ابوہول بنا ہوا تھا۔ اس کے دوست احباب بھی کون سے انسان تھے جو اس کی حالت و ہیبت کو کوئی اہمیت دیتے، اہمیت تو اس بلیک ٹائیگر پوڈر کی تھی جو وہ دوستوں کے لئے تحفہ لایا تھا۔ ڈالر جیبوں میں مٹے ہوئے تھے چنانچہ آتے ہی یار باشوں کی راتیں زندہ اور جوان ہو گئیں۔

چوبارے والی قتالہ موتیاں اب شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ زینت ہلاک میں دس مرلے کی کوٹھی کے علاوہ نئے ماڈل کی کار بھی نیچے تھی۔ دو فلاپ فلموں کی ہیروئن اور دو تین فلمیں مزید بھی سائن کر چکی تھی مگر اپنے چوبارے میں ٹائم وہ اب بھی لگاتی۔ شہزاد تو کب کا قصہ پارنیہ بن چکا تھا لیکن شہزاد کے دل میں وہ ہر جانی اب بھی روز اول کی مانند تیر کی طرح ترازو تھی۔ شہزاد کو یاد تھا کہ اس نے اپنا سب کچھ اس پہ نچھاور کر دیا تھا مگر جب اس پہ برے دن آئے تو اس نے نہ صرف طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں بلکہ در پردہ اسے پھنسانے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس بے وفاموتیاں کو شہزاد نے دل کی گہرائیوں اور پوری سنجیدگی سے چاہا تھا مگر طوائف تو ایسی دوکاندار ہوتی ہے جو گاہک سے زیادہ اس کی جب سے دلچسپی رکھتی ہے۔ اسے یہی دکھ تھا کہ قسمیں وعدے اور ٹوٹ کر چاہنے کے باوجود وقت بدلتے ہی اس نے بھی منہ موڑ لیا۔

شہرہ تھی تو انسان! مگر ظہوری شاہ کے لئے نوٹ چھاپنے کی مشین بن گئی تھی۔ وہ جتنے اور جس رنگ کے نوٹ چاہتا، چھاپ لیتا۔ رنگ ورامش کی محفلیں اسی کے دم سے اُبلتھیں۔ وہ محض ایک کٹہ پتلی تھی جو نئی گڑیا، نقلی زیورات، نئے نئے کپڑوں کے لانچ میں ہر سانچے میں ڈھل جاتی۔ گدگدی کے نام پہ ہر اچھے برے مراحل سے گزر جاتی۔ دو اکے طور پر وہی خاص مشروب اسے ہر روز پلایا جاتا، دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ اپنی بے خبری کی دنیا میں ہی رہی تھی یا جینے پہ مجبور تھی۔

ان ہی دنوں مس عاشری کا ایک پرانا آشنا جو چارپانچ سال پہلے امریکہ گیا تھا، واپس آیا۔ بھلا کا شکیل شہزاد، کسی زمانے میں شاہی محلے میں ویڈیو فلموں کا سنٹر چلاتا تھا۔ کمرشل فلموں کی آڑ میں دراصل وہ بیہودہ فلموں کا دھندا کرتا تھا۔ پورے لاہور میں وہ سویڈن، ہالینڈ، بلجیم، ڈنمارک سے سبکل شدہ خاص خاص پرنٹ سپلائی کرتا۔ اس کے کارندے گھروں کو ٹھیوں کو ٹھوں میں فلمیں ہوم ڈیلیوری کرتے تھے مگر دوکان پہ وہ صرف کمرشل فلمیں ہی دیتا تھا۔ مس عاشری سے اس کا تعلق انہی فلموں اور لڑکیوں کے حوالے سے تھا۔ اس گھناؤنے کاروبار میں اس نے لاکھوں کمائے۔ پھر حرام مال، حرام بوند والی بات ہوئی۔ دوکان کے سامنے چوبارے پہ اک نوعمر طوائف زادی موتیاں سے آنکھ منکا ہو گیا اب گندی کمائی، گندے تعلقات کی پائپ لائن کے ذریعے چوبارے پہ منتقل ہونے لگی۔ اسی عشق چوبارے میں اسے منشیات کی چھینک بھی لگ گئی، ہوتے ہوتے منشیات کا کاروبار بھی کرنے لگا۔ نیا ایس ایچ او آیا تو اس سے بن نہ پائی دوکان پہ چھاپ پڑا۔ چوبارے والی کی اور پولیس والے کی ”چار چوٹ“ سے نہ سکا تو امریکہ بھاگ گیا۔ آسمان سے گر کر بھور میں اٹک گیا، چھپڑ سے نکل کر سمندر میں اتر گیا۔ پاکستان میں آیا چوبارے والی چھوٹی تھی تو وہاں کئی چٹی چڑی والیاں مل گئیں۔ دہلی اور ٹھوٹھے کی جگہ دلا اور کمرشل کے گلاس مل گئے، دو نمبر کی جگہ ایک نمبر ملنے لگی اور وہ بھی وافر — چار بر

اٹھے تھے، اعصاب پہ تشنچ طاری تھا۔

طوائفوں کے اپنے پرائیویٹ ڈاکٹر اور سیانے ہوتے ہیں جو ان کے امراض خبیثہ سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ کچھ صدری ٹوٹے ٹوٹکے طریقے بھی جو کھوپچل بوڑھی نانکاؤں اور دندہ مارے کھوسٹ استادوں میں سینہ بہ سینہ چلتے ہیں۔ علاج معالجہ شروع ہوا تو تحقیق معائنہ کے بعد عقدہ کھلا کہ ماریہ، کارسیہ کر گیا ہے۔ علاج شروع ہوا۔ افادہ تو کچا، لمحہ بہ لمحہ حالت بگڑتی گئی۔ پاؤں کے سیاہ رنگت اٹگوٹھے سوج کر اخروٹ بن گئے۔ آخر منہ سے پھوٹی کہ شہزاد اٹگوٹھوں میں انجکشن ٹھوکتا تھا۔ زہر پھیلا تو امراض نسوان کے ایک پرائیویٹ کلینک کے پرائیویٹ روم میں لٹادی گئی۔ کئی مختلف ٹیسٹ کیے گئے۔ رپورٹ ملی کہ وہ ایک لاعلاج مرض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ دو تین فلمیں سیٹ پر تھیں، برادری اور ہزار دشمن جتن تھے۔ بڑی مشکل میں پھنس گئے۔ ہر لحاظ سے رازداری برتی جا رہی تھی کہ بات باہر نہ نکلے۔ یہ ہولناک انکشاف بھی ہوا کہ جس مرد سے یہ مرض ملا وہ انتہائی خطرناک مریض ہے اور پاؤں کے اٹگوٹھے میں انجکشن لینے کا طریقہ بڑا جارحانہ ہے۔ پاؤں، ٹانگوں اور ریڑھ کی ہڈیوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ پرائیویٹ کلینک تھا، دے دلا کر ان کا منہ بند کر دیا اور شہزاد کی تلاش شروع کی جس نے بڑی ہوشیاری سے اگلا پچھلا حساب بیباق کر دیا تھا۔ موت کے منہ میں بڑی موتیاں لے کر یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ شہزاد اس سے زیور اور اچھی موٹی رقم بھی لے چکا ہے۔

دہل سے اڑ کر یہ اڑن سانپ، دو مونی پسنی مس عاشری کی بانی میں گھسا بیٹھا تھا۔ اس روز مس عاشری نے اس کے اعزاز میں ایک شہینہ دعوت کا انتظام کر رکھا تھا۔ ولایتی شرابوں اور دہلی کبابوں کے ساتھ حکیم جمالی، ظہوری شاہ اور اس کے تمام ساتھیوں کے علاوہ شایان اور نسہ بھی مدعو تھے۔ استاد شفق کی سنگیت منڈلی بھی پوری تیاری میں تھی۔ امریکہ اور وہاں کی میوں کے قصے، نائٹ کلبوں اور جوئے خانوں کی دلچسپیاں اور رنگینیاں، دولت ڈالر کی ریل ٹل۔ باتوں کے ساتھ کھانا پینا بگنا بگنا بھی ہوتا رہا۔ رات ذرا بھیگی تو طبیعتیں بھی بھیگنا شروع ہو گئیں۔ محفل عام کو برخواست کر دیا گیا۔ شایان اور رفیق ڈوگر اپنے ڈیرے چلے گئے، باقی ٹولہ سوائے مس عاشری، ظہوری شاہ کے فلیٹ میں پہنچ گیا جہاں ”محفل خاص“ کا خاص اہتمام تھا۔ یہاں پہنچتے ہی بوتلوں کے کاگ اڑنے شروع ہو گئے۔ سوڈا، منرل واٹر، برف، کاجو، تلی مچھلی، ہر چیز موجود تھی۔ بات چیت، انکشافات، خوش گہیوں کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا۔ آہستہ آہستہ بوتلیں ہلکی اور پینے والوں کی سرور آنکھوں کے پوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ شہزاد بڑا بے چین اور بیکل تھا، ظہوری شاہ سے کہنے لگا۔

لاہور آتے ہی اس نے موتیاں کے بارے میں ساری معلومات اکٹھی کر لی تھیں اور شہزاد موتیاں کو بھی اس کے آنے اور اس کی جیب میں بھرے ہوئے ڈالروں کی اطلاع مل چکی تھی۔ ایک رات وہ اس کی میز پھیاں چڑھ رہا تھا۔ خوبصورت گھڑی، قیمتی پروفوم دیتے ہوئے تین ہزار ڈالر کا ہار اس کے گلے میں ڈال کر بیٹے دنوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے اس کو پہلو پر بیٹھا لیا۔ موتیاں نے بھی اسے مایوس نہ کیا، بڑی گرم جوشی سے اس کی پذیرائی کی۔ رگ شکوے، آپس کی غلط فہمیاں دور کر کے پھر باہم شیر و شکر ہو گئے۔ شہزاد نے امریکہ میں اب کاروبار، تعلقات اور ڈالروں کی ریل پیل کا نقشہ بڑی خوبصورتی سے کھینچتے ہوئے اسے ہیرو لے کر ایک انٹرنیشنل نوعیت کی فلم شروع کرنے کا منصوبہ اس کے سامنے رکھا۔ اس کی تو باچیں کھل گئیں۔ اسے خوب یاد تھا کہ کئی برس پہلے اسی شہزاد نے اسے کس طرح نہال کیا اس کی کوئی ایسی خواہش اور فرمائش تھی جو اس نے پوری نہیں کی تھی۔ وہ اچھی طرح جانچی تھی کہ یہ اس سے بہت پیار کرتا ہے اور اب تو اس کے پاس ڈالروں کی بوریاں تھیں۔ فلم کا منصوبہ، وہ انٹرنیشنل فلم کی ہیروئن بن رہی تھی، گو یہ شہزاد پہلے والا شہزاد نہیں تھا۔ چٹا گورا، وجیہ، صحت مند اور کہاں یہ کہ سر بالوں سے خالی، چہرے پہ نحوست اور وحشت۔۔۔ بھدا اور بے ڈول جسم، سیاہ ناخن، ریچھ کی مانند ہاتھ پاؤں لیکن وہ تو طوائف تھی اور پھر فلموں کی ہیروئن! جو شکلیں، عریں، پیاریاں اور جسمانی خوبصورتیاں نہیں دیکھتیں۔ وہ تو نوٹوں پہ چھٹی ہوئی تصویر، سیریل نمبر، گورنر کے دستخط اور تھوک لگا کر اس کا کچا پکارنگ دیکھتی ہیں جو اس نے دیکھ لیا تھا۔۔۔ اب شہزاد کی راتیں، اس کی زینت ہلاک والی کوٹھی میں روشن ہونے لگیں۔ اس نے ایسا منتر پھونکا کہ موتیاں نے اپنی جوانی کی ساری کلیاں، پھول اس کے آگے ڈھیر کر دیئے۔ بلیک ٹائیگر جو درمیان میں کودا تو نقشہ ہی بدل گیا۔ گھربار، دفتر، چوبارہ، اسٹوڈیو، سب کچھ فراموش ہو گیا۔ چوبیس گھنٹے دروازہ اندر سے بند رہنے لگا۔ بلیک ٹائیگر کے کالے ناگ نے اس ناگ منی کو ایسا بدست کیا کہ اب بین بجانے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی، یاد تھا تو صرف شہزاد! جس کے پاس بلیک ٹائیگر تھا۔۔۔ گھر والوں نے جب یہ حالت اور کیفیت دیکھی تو بری طرح بوکھلا اٹھے، اسے شہزاد کے چنگل سے نکالنے کے جتن کرنے لگے مگر اب شاید دیر چکی تھی۔ شہزاد نے اپنا انتقام لے لیا تھا۔ پھر مناسب موقع دیکھ کر وہی منظر سے اوجھل ہو گیا۔ موتیاں کے گھر والوں نے سمجھا کہ چلو، بات ختم ہو گئی مگر اصل بات تو اب شروع ہو رہی تھی۔ ایک آدھ دن جیسے تیسے گزر گیا۔ بلیک ٹائیگر کی ٹوٹ اور ”بلیک کو برے“ شہزاد کی کہنے نے اسے شاید بے چینی اور بے تابی کے کانٹوں پہ لوٹا دیا۔ جسم کے اندر جیسے انگارے دہک

”شاہ جی! آپ دوستوں کے لئے امریکہ سے جو خاص تحفہ لے کر آیا ہوں، اجازت ہو تو اس کے ورژن کرادوں۔“

سب سے پہلے اس نے سرنج بھر کر اپنے پاؤں کے انگوٹھے میں ٹھوکی، پھر باری باری سب کے ساتھ شمسہ کو بھی آشنائے راز کر دیا۔ رات اچھی خاصی بھیگ چکی تھی اور ایسے میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جب پورا باحول بھیگ جاتا ہے۔ پھر اپنے اپنے طرف اور بساط کے مطابق انسان سرشار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی پرانے پرانے پانی تھے ایسا ساں بھیگا کہ ہر طرف پھسلن ہی پھسلن ہو گئی۔

ٹیلی ویژن یا سینما میں برف پہ پھسلنے کے منظر آپ نے دیکھے ہوں گے۔ برف پہ پھسلنے اور اس پھسلن میں بس تھوڑا سا ہی فرق ہے۔ ایک پھسلن میں توازن اور توجہ پہ کنٹرول ضروری ہے اور اس پھسلن میں کنٹرول ہی تو ہوتا ہے جسے ختم کرنا ہوتا ہے۔ آج خرابیت کا انداز اور لطف ہی جدا گانہ تھا۔ ہوش و خرد اور معقولیت کی کوئی ایسی حد بندی قائم و حاصل نہ تھی جو وجہ ناسف یا شرمندگی کا باعث ہوتی۔ وہ ہڑونگ مچی کہ شیطان بھی اپنی شیطنت پہ شرمندہ ہو گیا۔ صبح کا زب سے صبح صادق کی جانب سرکتی ہوئی ظلمت کے چرے کو ملے گھونگھٹ میں ڈھانپتی ہوئی رات اپنے انجام کے قریب پہنچ چکی تھی۔ شغل شب بیداری سے بیزار ہو کر کتے اور چوکیدار بھی اپنی دیم اور چہرے پلیٹ کر اوگھنے لگے تھے۔ شب زندہ دار، تسبیح و تہلیل سے فارغ ہو کر حمد و ثنائیں مصروف تھے۔ موزن، مرغ صبح نوا کی بانگ پہ کلن دھڑے، نیند کے ٹوٹے خمار سے لبریز آنکھیں نیم واکئے رات کے کسی اوجھورے خواب کی کڑیاں ملا رہا تھا مگر شمسہ خواب کیا دیکھتی کہ اس بیچاری کو تو کسی نے سونے ہی نہیں دیا تھا۔

ایک نیم جان فاختہ اور کئی شرے اور پھر بلیک ٹائیگر کی خرمستیاں۔ اس کا انگ انگ انکا کی مانند دھک رہا تھا لیکن جب کسی میں درد اور کرب کا احساس ہی مردہ ہو جائے تو وہ جیتا جاگتا مردہ ہوتا ہے۔

اصولِ فطرت کے تحت۔ رات کی کوکھ سے دن، روشنی کے اندر سے اندر سے علموں سے نور، بھوتوں کے گھروں، اچھے میں برے اور بدوں میں نیک پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بلیک ٹائیگر کے نشے نے ان چھوٹے شیطانوں کو تو بہکا دیا تھا مگر شمسہ کے لئے یہ زہر ملاط کی بجائے ترقیقِ ثابت ہوا۔ آذان کے آہنگ کا ارتعاش فضا میں نور بن کر پھیل گیا۔ نورجی ویلا، رمتوں کے نزول کا وقت۔ کونپلیں، کلیاں بن رہی تھیں اور کلیاں غنچوں کا روپ دھا رہی تھیں، غنچے پھول بن شبنمی غسل کر رہے تھے جب ایسے میں ایک ساعت رحمت بھرا

ایسی بھی آئی کہ شمسہ کی ناک سے نکسیر پھوٹ نکلی۔ منہ گردن، سینہ، تھڑ، ہاتھ ہو گئے۔ آخر میں ناک سے ایک سیاہ چھوٹا سا خون کالو تھڑا سا برآمد ہوا اور دماغ کی وہ نس کھل کر صاف ہو گئی جو دماغ کے اس حصے کو صاف خون سپلائی کرتی تھی جو بھول کی اندھی کو ٹھہری بن چکا تھا۔ سوچ کی پہلی کرن کسی پھڑے ہوئے ساتھی کی طرح چپکے سے یادداشت کے روزن سے اندر داخل ہوئی، تاریکی آہستہ آہستہ دماغ میں تبدیل ہونے لگی تو آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ سب کچلا کھائے ہوئے کتوں کی طرح مردار پڑے تھے۔ منہ سے بہتی ہوئی لیس دار غلیظ رطوبتیں، چڑھی ہوئی سرخ آنکھیں، خالی بوتلیں، اونڈھے پڑے ہوئے گلاس، تعفن، ٹھن۔ کراہت اور خوف سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ کمرے سے باہر کی طرح اس کے اندر بھی روشنی بڑھتی جا رہی تھی، ذہن کی بند کڑکیوں سے ایک ایک کر کے پردے ہٹتے جا رہے تھے۔

پہلا چہرہ جو اسے دکھائی دیا، ماں کا تھا۔ جھریوں بھرا چہرہ، ٹڑھوں میں اتری ہوئی آنکھیں، سفید بال، لاغر، بیمار۔ پھر ہمیں سامنے آگئیں۔ معصوم، ڈری ڈری، سہمی سی۔ جنہیں نہ گزیاں ملیں نہ کھلونے، پینگ جھولیں نہ جھولا، کسی بھائی کا پیار ملانہ باپ کی شفقت نصیب ہوئی۔ پھر گھر، کلج۔ اسے زور سے ابٹائی آئی تو کسی عمر رسیدہ بگدھ کی بیٹ جیسی بڑی سی نے اگل دی۔ اس کی آنکھیں نمک بھرے آنسوؤں سے جل تھل ہو گئیں، منہ جیسے کڑواہٹ سے بھر گیا ہو۔ خون اور اٹنی کاغلیظ اس کی گردن سینے کے علاوہ بستر پہ بھی پھیلا ہوا تھا۔ ظہوری شاہ کی اس پہ نظر پڑی تو بوکھلا کر اٹھ بیٹھا، حکیم جمالی اور شہزاد بھی ہڑبڑا کر آنکھیں ملنے ہوئے بیدار سے ہو گئے اور بستر کی چادر سمیت ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے اسے غسل خانے کے اندر رکھ آئے۔ پھر شہزاد خباثت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں، جن جاتے ہوئے کوئی نہ کوئی نشانی دے کر ہی جاتا ہے۔ بلیک ٹائیگر پہلی مرتبہ لینے سے یہی حالت ہوتی ہے، تھوڑی دیر بعد میں وہ سری خوراک دوں گا یہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

ظہوری شاہ ملازم کھڑے کو شمسہ کو نہلانے اور کپڑے تبدیل کرانے کا کہہ کر دوبارہ دستوں میں آ بیٹھا۔ شہزاد سرنج کو صاف کر کے بلیک ٹائیگر سے بھر رہا تھا اور حکیم جمالی، نزل سے کہہ رہا تھا۔

”شہزاد صاحب! کیا مکمل کا نشہ ہے، آج تک میں نے ایسا زور آور نشہ نہیں دیکھا، یہ تو انسان کی نسلوں اور رگوں میں چار سو چالیس دولٹ کا کرنٹ دوڑا دیتا ہے۔“ وہ شہزاد کی

چالوسی کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”شہزاد صاحب! اس کا کوئی نسخہ ہمیں بھی عطا کر دیں۔ اگر جانتے ہیں کہ میں حکیم ہوں، میرے پاس بھی بڑے بڑے بم نئے ہیں مگر یہ تو ایٹم بم ہائیز رو جن بم کی تاثیر رکھتا ہے۔ برا لہا مال پیدا کیا جاسکا ہے، بڑے نوٹ چھاپے جا رہے ہیں۔“

”حکیم صاحب! یہ نشہ ابھی نیا نیا ہے، امریکہ میں بھی ابھی عام نہیں۔ میرا پاکستان کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس کو مارکیٹ کرنے کے لئے یہاں کے ماحول کا جائزہ لیا جائے۔ تو صرف آپ کو نمونہ چکھایا ہے، ابھی ماحول بنا تو آپ کو اس کی اور بھی جاود گری دکھا گا۔“ در عیاشوں کی طرح آنکھ دبا کر بتانے لگا۔ ”اگر تھو تھے مرد اور فریزر میں لگی عورت کو اس کا انجکشن دیا جائے تو دونوں پارے کی مانند تھرکنا شروع کر دیں گے۔“

صبح کا دودھیا اجالا پھیل چکا تھا۔ شہزاد نے سرنج بھر کر اس پہ کیپ چڑھاتے ہوئے کہا ”فرینڈز! بریک فاسٹ، یعنی ناشتے کا ٹائم۔ نہاری کچے، سری پائے اور لسی کا انڈا جائے۔ آفر ڈیٹ، یعنی اس کے بعد دو سرار اونڈ شروع ہو گا۔“

ناشتے کا انتظام باہر کھلی چھت پر کیا گیا تھا۔ کھاپی کر، فریش ہو کر یہ سارے والپر آئے۔ شمس نہادھو، نئے کپڑے پہنے پلنگ پہ نیم دراز تھی، چہرے پر وہی کھلوت معصومیت۔ پاؤں کی حرکت سے ردھم دیتی ہوئی، میوزک سن رہی تھی۔۔۔ میوزک طرح کا سن رہی تھی۔ ایک ریکارڈ پلیئر سے، دو بے اپنے ذہن کی لاسکی سٹم سے۔ اذہن کی، کھوئی یادداشت سے فری کو نسنی مل گئی تھی۔ ماں بہنیں، شوکت، ریس کورس تھپڑ، وہ غنڈے، ٹیکسی۔ حکیم جمالی کے ہاں وہ رات، ایک ایک چہرہ، مس عاشی، اس قیام اور شایان!۔۔۔ ہر منظر، ہر حرکت، ہر سسکی، ہر زخم کچھ دھندلا، کچھ صاف، رد کی مانند واضح ہو گیا تھا۔ اس کا نوچا کھوٹا ہوا جسم، انگ انگ سے اٹھتی ہوئی درد کی لہ کے باوجود اس نے برے کے گھر تک پہنچنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ فیصلہ کر لیا وہ انہیں یہ محسوس ہونے دے گی کہ وہ ہوش میں آچکی ہے، اس کی کھوئی یادداشت واپس مل چکی ہے ویسے ہی معصوم اور بے حس پلنگ پہ بڑی تھی جب وہ سارے شیطان اندر آ گئے۔ شہزاد دیکھتے ہوئے حیران ہو کر بولا۔

”ونڈر فل، بہت اچھے۔ بیوٹی فل، چار منگ یگ برڈ!۔۔۔ کم آن فرینڈز!۔۔۔“

دور شروع ہوتا ہے۔۔۔

باری باری سب نے انجکشن لئے، شیشی اور سرنج خالی ہو چکی تھی۔ شمس انجک

ارہ گئی۔

”سوری، یگ لیڈی! بلیک ٹائیگر ختم ہو گیا، کل اور آجائے گا۔ آج تم رم سے گزارہ کر لڈ، جیکسن رم۔۔۔“

انجکشن لگانے کے بعد وہ بلیک ٹائیگر کی افادیت اور اس کے دیگر پہلوں پہ شیشیوں بکھیرتا اب حکیم جمالی بھی بولا۔

”شہزاد صاحب! یہ بڑی کامی شہزادی ہے، چپ چاپ تعاون کرنے والی!۔۔۔ جتنی اس کے نہ ہوتی ہے، کوئی اور ہوتی تو کبھی کی فوت ہو چکی ہوتی۔۔۔“

شہزاد نے شمس کو گہری نظروں سے تولتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ”شی از گرٹ ی۔۔۔ واقعی یہ بڑی ہمت والی لڑکی ہے لیکن مجھے کچھ ایثار مل سی لگتی ہے۔۔۔“

ظہوری شاہ نے بتایا۔ ”یار! یہ اپنی یادداشت ضائع کر چکی ہے، یعنی مینٹل کیس ہے۔ جس بائے لگا دو، وہیں سیٹ ہو جاتی ہے۔“

شمس کے کان ادھر ہی تھے۔ وہ سب کچھ سن رہی تھی، دیکھ رہی تھی اسی انجانے پن، بے باور معصومیت سے۔۔۔ رم کے نیچے اوپر دو تین پیگ اس کے حلق سے اتر کر سینے کو رداوی بنا چکے تھے، جبکہ دماغ آہستہ آہستہ کافور کی ڈلی بنتا جا رہا تھا اور متورم سرخ پیوٹے پہنی آپ بند ہوتے جا رہے تھے۔

ہوش آیا تو شام کے سائے اتر چکے تھے۔ انگ انگ میں دھن۔ بازوؤں، ہاتھ، گردن پہ بانٹل دھبے۔ گردن کے پٹھے اکڑے ہوئے، سر جیسے چکی کا پٹ، زبان کاٹھ کی مانند اکڑی ل لگنے دار جھاڑ۔۔۔ بڑی مشکل سے تھوک نلگتے ہوئے خشک حلق کو تر کرنے کی کوشش دے ہوئے وہ اٹھی، اسے شدت سے پیاس اور بھوک محسوس ہوئی۔ کمر خالی، اجاڑ تھا جیسے بال اڑ جانے سے کھیت خالی رہ جاتا ہے۔ بہت دیر اسی حالت میں وہ پلنگ پہ بیٹھی خالی خالی لمحوں سے درو دیوار کو دیکھتی رہی۔ کھلی کھڑکی کے اس پار آسمان پر سفید روٹی کے گالوں کی ند، اکہرے اکہرے بادل اور بادلوں کے پرے۔۔۔ خدا جانے وہ کیا دیکھ رہی تھی؟۔۔۔ پھر وہ تیسے اٹھی اور کھڑکی کے پاس آکر، کھڑکی کے پٹ کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی، دُر تک کھلا، مل، اس کے نیچے اونچے نیچے مکان، کوشیاں، مسجدوں کے مینار، کبوتروں کی چمتریاں، ٹیلی فون کے آنتینے، گڈیاں پتنگیں اڑاتے ہوئے بچے اور لڑکے۔۔۔ تصور میں وہ کبھی پتنگ بن گئی، کبھی کسی کبوتری کا روپ لیتی۔ دیر تک وہ کھلی نضاؤں، ہواؤں میں لہرائی اور تیرتی رہی۔ مل، نیچے، ایک تنگ سی گلی میں وہ اپنا گھر تلاش کرتی رہی جہاں اس کی بیمار ماں اور بہنیں نہ

جانے کس حال میں ہوں۔ اس کی اڑان کو ایک اڑتی ہوئی آواز نے اڑا کر رکھ دیا۔  
 ”ہائے۔۔۔ میں صدقے“ میں واری۔۔۔ میری بنو جاگ پڑی، مجھ کلہوہی کو خبر نہ ہوئی۔۔۔“

اس کا نگران زرخا کھڑکی کے باہر ہاتھ نچانچا کر اپنی بے پرکی ہانک رہا تھا، پھر آنا، ”فانا“ وہاں گھسا اور ہاتھ پکڑ کر ہاتھ روم میں لے گیا۔۔۔ گھنٹہ بھر بعد گھنٹھی پٹی، کپڑے لٹے پر ہانک کر کے لئے کھانے پینے کا سامان لینے نیچے اتر گیا اور یہ اپنی گڑیا اور ہار سنگار کا سامان لے کر باہر چھت پہ نکل آئی۔ بڑا خوشگوار موسم تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا، صاف آسمان پر نیلی، پیلی، اور ہری لال چٹنگیں۔ اسے اپنے رگ و پے میں بڑی خوشگوار سی تازگی کا احساس ہوا شاید اس بھی کہ اب اس کا احساس بیدار ہو چکا تھا۔

اچانک جیسے گردن کے پیچھے کسی نے تیز دھار کی چھری پھیر دی ہو، بیساختہ منہ نہ نکل گئی۔ کسی کئی چٹنگ کی بانجھا لگی ڈور پھر گئی تھی۔ ساتھ ہی ذرا پرے، اپنے فلیٹ کی جانب شانی بیٹھا پڑھ رہا تھا، چیخ کی آواز پہ بھاگا اور آیا۔ ڈور شمسہ کی گردن میں لپٹی ہوئی نظر آگئی تھی۔ شمسہ اپنی گردن پہ ہاتھ رکھے وہیں ڈھیری ہو گئی تھی۔  
 ”کیا ہوا۔۔۔؟“

وہ بھاگا بھاگا آیا اور جھیرا بھلا گنتے ہوئے پوچھنے لگا۔ شمسہ نے گردن اٹھا کر اسے دیکھ کر کوئی جواب دینے کی بجائے ہاتھ ہانک کر گردن دکھانے لگی۔ سرخ سی لکیر، جیسے کسی رنگ کی مار کرٹپ پنسل سے لائین لگا دی ہو۔

”ارے“ یہ تو ڈور پھر گئی ہے۔۔۔“ وہ ہاتھ سے بالوں کا جوڑا ہانک کر گردن دیکھنے لگا۔  
 ”یہیں ٹھہرو، میں کچھ لگانے کے لئے لاتی ہوں۔۔۔“

وہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ نیلے ہلکے رنگ کی زنانہ شلوار قبض، ”نا“ میک اپ، کندھوں سے جھولتے ہوئے بال۔ وہ ایک خوبصورت، اسارٹ لڑکی دکھائی دے رہی تھی اور کتنا سبک مہیاں ہاتھ تھا اس کا، جیسے کسی مسیحا کا ہاتھ ہو۔ کتنے ہی لمحے وہ اپنی گردن کی ڈور رنگ کا سامان لے کر آیا۔ شمسہ گردن کو بھول کر اس خوبصورت چٹنگ کو دیکھ رہی تھی۔ شانی نے پھرتی سے ڈور پکڑ لی، ہاتھوں میں ڈور آتے ہی رنگ ریشمی کئی چٹنگ سے سر بلند ہو گئی۔ کئی ایک، اک تاوے، دو تاوے، بھدے سے گڈے اسے چھانڈ

دیں تھے۔ ایک اوچھا سا بد مغز تو سر پہ چڑھا ہوا تھا، دائیں بائیں طرح طرح کے چکھے دے کر سے چھانٹا چاہتا تھا۔ اس سے دو ہاتھ کرنا ضروری ہو گیا۔ شانی نے ڈھیل دے کر بائیں جانب پائی لی۔ وہ ادھر تیرتا ہوا، ہوا کی طرح آیا تو شانی نے اس کی ڈور پہ ڈور ڈال دی، ہلکی ہلکی ہان دینے لگا۔ وہ بھی ڈھیلی ڈور پہ تھا، ادھر ڈور ختم ہو گئی۔ آریا پار۔ شانی نے آہستہ سے تنکا لیا تو وہ کٹ گیا۔ شمسہ بڑی دلچسپی سے دیدے پھاڑ پھاڑ مقابلہ دیکھ رہی تھی۔ کن کٹا، معاش گڈا بڑی ذلت سے ڈولتا ہوا نائیوں کی دوکلن پہ پانی کی ٹسکی کی اوٹ میں غرق ہو گیا۔  
 ”وہ مارا۔۔۔“ شمسہ نے تالیاں پیٹتے ہوئے نعرہ لایا۔ ”کمال کر دیا، شانی بھائی!“

بے ساختگی میں اس کے منہ نکل گیا۔ شانی کے ہاتھ سے چٹنگ کی ڈور چھوٹ گئی، وہی تھ زبانی سے اس کے گل سے نکل آیا تو وہ وہیں پہنچے سے اتری ہوئی ڈور کی مانند فرش پہ ڈھیر دگنی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ نہ تو ہاتھ والے کو احساس ہوا کہ وہ کیا کر گزرا ہے اور نہ گل والی کو اندازہ ہوا کہ اس کے ساتھ کیا ہو گزری ہے۔ شانی بھائی جا چکا تھا۔۔۔ چوٹ منہ پڑے یا من پہ، ملال تو ہوتا ہے۔ ہکا بکا پاؤں میں الجھی ہوئی ڈور کو دیکھنے لگی۔ شیشے کا مانجھا لگی ٹواری تیز دھار والی، پیچ در پیچ جس کے سرے جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ گم صم، کچھوے کی طرف اپنا سر اندر کئے پڑی رہی اور نگران زرخا نجانے کب سر پہ آکھڑا ہوا۔

”اے“ میں قربان۔ صدقے واری۔۔۔ تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟“

وہ مسکراتے ہوئے ڈور کو سیویوں کی طرح اچھالتے ہوئے بولی۔

”سیویاں پکار رہی تھی، اپنے گڈے کی شادی کے لئے۔۔۔“

☆☆☆

تھپڑے جیسے اس کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی، اس کے اندر جرات اور توانائی کے بند سوتے کر دیئے تھے۔ اسے وہ تھپڑ بھی یاد آگیا تھا جو شوکت نے اسے اسی انداز میں جڑا تھا۔ فرق اس اتنا کہ وہ تھپڑ دانستہ برائی کا تعلق پیدا کرنے کی پاداش میں تھا اور یہ تھپڑ ناواستگلی میں کارشتہ جوڑنے کے صلے میں تھا۔

”ٹھو“ میری جان! اندر چلو، آج میں تمہیں ریشم کے لمبھوں جیسی سیویاں ہی پکا کر ہوں۔ کیا یاد کرو گی۔“

اندر پہنچتے ہی وہ دانستہ گڑیا لے کر بیٹھ گئی۔ نگران نے اسے ایک کیپول اور گلاس میں امانت شروب پینے کو دیا جسے تھوڑے تامل کے بعد وہ پی گئی۔ پھر گڑیا کھیتے کھیتے ہی وہ نائی محسوس کرنے لگی، ذہن سوچوں سے بالکل صاف ہو گیا لیکن اس کے باوجود وہ سمجھ

گئی کہ یہی وہ زہر ہے جس کی وجہ سے وہ کچھ سمجھنے، جاننے اور عمل کرنے کی صلاحیتوں پر محروم رہی ہے۔ تھوڑی بعد وہ گہری نیند سو گئی۔

شانی نے تھپڑ تو مار دیا تھا مگر اب بچپتا رہا تھا۔ اپنے بستر پر بچھتاوے، شرمندگی کی گٹھری بنا ڈھیر تھا۔ ”شانی بھائی، شانی بھائی!“ کی بازگشت اس کے کانوں میں پکھلا ہوا سیر رہی تھی۔ جان قربان کرنے والی بہنوں کا اکلوتا بھائی! جن کے بغیر وہ جینے کا تصور نہیں کرتا تھا۔ جو اسے دیکھ دیکھ جیتی تھیں، اس کی ہر خواہش پوری کرتی تھیں مگر کئی مہینوں سے ان کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ انہیں دیکھنے کو دل تڑپتا تھا مگر باپ نے سختی سے رکھا تھا اور آج ایک ایسی لڑکی نے جسے کئی بار پوشاک سے بے نیاز دیکھا، جسے ہر روز گھر خراب کرتے ہیں اس لڑکی نے اسے بھائی کہا۔ وہی جس کے ساتھ وہ شرمناک حالت میں قلم بنوا چکا تھا، وہ اسے بھائی کیسے کہہ سکتی ہے؟۔ اسے یہ لفظ کہاں سے ملا، یہ مقدس کہاں سے سمجھائی دیا؟۔ ایک دم وہ اٹھ بیٹھا، آنکھیں میچ کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ یاد آیا کہ وہ ہمیشہ اسے اپنا گدا کہتی آئی ہے۔ میرا گدا! میں اپنی گڑیا اس سے بیاہوں گے گدا، بو کاٹا۔ اسے یاد آیا کہ اس کی گردن کے پیچھے سرخ لکیر تھی، ڈور پھر گئی تھی۔ اور روٹی لے کر گیا تھا۔ ڈیوٹل تو لگایا ہی نہیں، وہ پتنگ کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ ٹائم آٹھ بجنے والے تھے۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ ذہنی تناؤ سے چھٹکارے کی خاطر نیچے اکیڈمی آیا۔

استاد برکت ہارمونیم پر سُر میں ملارہے تھے، عنایتِ طبع کی طنابیں ٹھونک رہا تھا، لڑکیاں کھڑکی کے پاس کھڑی گھسّر پھسّر کر رہی تھیں۔ استاد شفو شاید غسل خانے میں تھا۔ وہی منحوس ساما حول، دھندلا دھندلا بے کیف سا۔ عجیب سی ناگوار بساندناک سزا دیواروں پر گویا کرشن، مہاراج کتک، مہاراج برجو پرشاد اور ستارہ دیوی کی پرانی اوپر باسی پرانے گئے کے ہار، کانسی کی مورتیاں، اکیڈمی کے مختلف فنکشنوں کے موقعاً ہوئی فلمسٹارز کے ساتھ تصویریں۔ لکڑی، گلت اور تانبے کے ایوارڈ، باسی ہار، تنبورے، طبلے مردنگ، ڈھولک، گھنگھرو۔ میلا دم گھسا ہوا قالین، ڈھیلے ڈھیلے گاؤں سب کچھ جو وہ روز دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ نفاست پسند طبیعت میں ناگوار سا کھدر، مردوڑ کا وہ اٹھ کر باہر بالکونی کی ریٹنگ پر ٹیک لگا کر نیچے آتے جاتے لوگوں کا نظارہ کرنے لگا۔ مارکیٹ کی میزھیوں کے قریب گرے میٹک ٹیوٹا نے بریک لگائے۔ زلفی سے باہر نکلتے ہی اسے بالکونی میں کھڑے دیکھ لیا تھا، کئی دنوں کے بعد دکھائی دیا

اٹارٹ، نیوی بلیو میچنگ پینٹ شرٹ میں۔ وہ مسکراتا ہوا سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ دونوں فوٹ گھٹ کر چمچی ڈال کر ملے اور پھر شانی ہاتھ پکڑ کر اسے فلیٹ میں لے گیا۔

”کہاں رہے اتنے دن۔“ ”شانی نے قدرے خفگی سے پوچھا۔

”مگر یہی سوال میں تم سے کروں۔“ ”زلفی نے جواب دیا۔

”تو۔“ تو میں یہی کہوں گی کہ پڑھائی اور تعلیم میں مصروف ہوں۔ طبیعت بھی کچھ ٹیک نہیں رہی۔“

زلفی اسے خشمگین نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”فلا سفر بھائی! ذرا ایڑی۔۔۔ خدا کے بندے! کبھی تو عام فہم بات کر لیا کرو یا پھر تم مجھے تنگ کرنے کے لئے ایسا کرتے ہو۔“ ”شانی نے کھل کر قہقہہ لگایا۔ ”خوب، بہت خوب۔ بھائی! میں نے کون سی ایسی بات کر دی ہے جو مشکل اور سمجھ میں نہ آنے والی ہو، ذرا بتاؤ۔“

زلفی جیسے یاد کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ”ایک تو تم نے کہوں گا، کی بجائے ”کہوں گی“ کہا۔ دوسرے پڑھائی اور تعلیم کی تکرار کی ہے جب کہ پڑھائی اور تعلیم ایک ہی بات ہے۔ رہے یہ کہ طبیعت ٹھیک نہیں۔“

شانی جواب دینے کے لئے پرتوں ہی رہا تھا کہ زلفی نے جھٹ اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا رولا۔

”میں نے گناہ کیا جو یہ بات کر دی۔۔۔ بھائی! کوئی جواب نہ دینا ورنہ سوال و جواب میں لٹ کر جائے گی جبکہ میں یہاں صرف دس پندرہ منٹ کے لئے آیا ہوں صرف تمہیں اپنے جلدی سے یہ بتاؤ، نصیب دشمنان تمہاری طبیعت کو کیا ہوا۔“

”یار! آپریشن کی جگہ کھلی بہت ہوتی ہے۔ دانے نکل آئے ہوئے ہیں، ایک آدھ پھنسی لی لگی ہوئی ہے۔ پیشاب والی تکلیف بھی ابھی موجود ہے۔“

”وہ تشویش ظاہر کرتے ہوتے ہوئے مشورہ دینے لگا۔ ”جناب! یہ سب تمہارا اپنا قصور ہے اتنا عجیبہ کیس ہے مگر تم ذرا بھی توجہ نہیں دیتے۔ تمہیں فوراً ڈاکٹر سے رجوع کرنا ایسے تمہارے مجھے فون کر دیتے۔“

”یار! تم ٹھہرے کاروباری بندے، کہاں تمہیں زحمت دیتا پھروں۔ پہلے ہی تم نے میرے طے میں بڑا ٹائم ضائع کیا ہے۔ ویسے حکیم جمالی صاحب میری دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں۔“

”مجھے تمہاری مرضی، بھائی! تم کسی کی مانتے، سنتے تو ہو ہی نہیں۔ اچھا، مجھے اجازت

جس والہانہ انداز اور یقین بھرے لہجے میں اس نے یہ الفاظ دہرائے تھے، زلفی اس انداز کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

”شانی! کیا تم نے اسے کہیں دیکھا ہے۔۔۔ تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟“  
شانی ابھی تک گم صم تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کس قدر بھولی اور معصوم سی تھی۔ چہرے پہ توار پنے کا نقدس، آنکھوں میں حیا، تصنع سے پاک خدوخال۔۔۔ یہ تصویر بہت پہلے کی تھی جب وہ کلیوں کی حکمت کی طرح لطیف اور پاکیزہ تھی۔ زلفی اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔  
”شایان! میں کیا پوچھ رہا ہوں۔۔۔ یاد کرو، تم نے میری بہن کو کہیں دیکھا ہے۔؟“  
شایان تصویر واپس دیتے ہوئے پراعتما لہجے میں بولا۔ ”میرے بھائی! جب کوئی چیز ہاتھ سے نکل کر زمین پہ گر جاتی ہے تو وہ نہیں رہتی جو وہ پہلے ہوتی ہے، کسی نہ کسی حد تک وہ آلودہ ہو جاتی ہے۔۔۔“

”کیا مطلب؟۔۔۔ پسلیاں نہ بھواؤ۔ خدا کے لئے بتاؤ کہ میری بہن کہاں ہے؟“  
وہ قطعیت سے بولا۔ ”ابھی کچھ مت پوچھو، میں سردست یہی بتا سکتا ہوں کہ وہ زندہ ہے، باقی تم سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔۔۔ دیکھو، کیا ہوتا ہے؟“  
زلفی دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا، کافی دیر کسی سوچ میں ڈوبا رہا پھر سر اٹھا کر بولا۔  
”شکریہ۔۔۔ بہت بہت شکریہ، شایان! تم نے کم از کم نگہت کے زندہ ہونے کی خوشخبری تو سنا لی۔ میں جانتا ہوں کہ اس بات کے علاوہ تم مجھے اور کچھ نہیں بتاؤ گے مگر پلیز! صرف یہ بتا دو کہ وہ کہاں ہے، میرا مطلب ہے کہ میں لاہور میں یا کہیں۔۔۔“

”کہہ جو دیا، یارا! صبر کرو، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔۔۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، مجھ پہ بھروسہ رکھو۔۔۔“ پھر وہ اٹھتے ہوئے اسے کہنے لگا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب تم جاؤ مگر کسی سے اس بات کا ذکر تک بھی نہ کرنا، اس کرائم رپورٹر سے بھی اب ملنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ اللہ سے دعا کرتا اور میں خود ہی تم سے جلد رابطہ کروں گا، مجھے ٹیلی فون کرنے یا یہاں آنے کی زحمت نہ کرنا۔“

وہ کچھ مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔ یاد ہو گا، تم نے مجھے بھائی بنایا ہوا ہے۔ اس ناطے نگہت بھی تمہاری بہن ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ اور نہیں کہتا۔۔۔“

شایان قدرے خفگی سے بولا۔ ”یارا! تم اس وقت چلے جاؤ، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔۔۔“  
زلفی اس کے اچانک بدلتے ہوئے رویے کو سمجھ نہ پایا اور حیران پریشان اللہ حافظ کہہ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شایان کمر اندر سے بند کرتے ہوئے شکستہ سا بستر پہ گر گیا۔

”۔۔۔“

”نہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ تم یوں نہیں جاسکتے۔ کھانا کھائیں گے، باتیں کریں گے اور پھر کراچی سی فلم دیکھیں گے۔“  
”کھانا تو خیر، میں کھاؤں گا نہیں۔ مجھے ایک شادی میں شریک ہونا ہے۔۔۔ رہیں باتیں، وہ میں تمہارے آگے کر ہی نہیں سکتا۔ میری ہر بات کا تمہارے پاس ایسا مدلل جواب ہوتا ہے کہ میری بات بچاری اپنا سامنہ لے کر شرمندہ ہو جاتی ہے۔ باقی رہی فلم، تو وہ تو بالکل باہر خارج از عمل ہے۔ ٹائم نہیں۔۔۔“ وہ گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مجھے اجازت“  
میں سبزہ زار میں مجھے ایک کرائم رپورٹر سے بھی ملنا ہے۔“  
”خیریت۔۔۔ اس سے کیا کام پڑ گیا؟“

”سوہی۔۔۔ اپنی گم شدہ بہن کے سلسلے میں کچھ بات چیت کرنی ہے۔“  
شانی غلٹ سے پوچھنے لگا۔ ”کیا کوئی سراغ ملا۔۔۔؟“  
”فی الحال کوئی سراغ تو نہیں ملا لیکن مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا۔ یہ کرائم رپورٹر کسی زمانے میں میرا کلاس فیلو رہا ہے۔ میں اوسو ری پڑ چھوڑ کر بزنس کی طرف نکل آیا، وہ پڑھائی مکمل کر کے صحافت کی جانب جانکا۔ بڑا مخلص، لڑکا ہے۔ جیل خانے، پاگل خانے اور دیگر رفائی اداروں میں اس کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ میں اتفاقاً ایک روز اس سے بات کی تو اس نے مجھے امید دلاتے ہوئے حکمت کی تصویر مانگی تم آج میں اسے تصویر دینے جا رہا ہوں۔“

”اللہ کرے، یارا! ہماری بہن کا کوئی سراغ مل جائے۔ مناسب سمجھو تو مجھے بھی دکھا دو۔“

زلفی نے پرس کھول کر اسے تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔  
”یہ ہے میری بد نصیب بہن، نگہت۔!“  
شانی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، یہ چہرہ اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ پاب ساڑ کی تصویر میں شرمندہ دوپٹہ اوڑھے مسکرا رہی تھی وہ گنگ منگ لہجے میں پوچھنے لگا۔  
”یہی تمہاری بہن ہے۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ بڑی سوہو اور اچھی لڑکی تھی، نہ جانے کس کی نظر اسے نگل گئی اور نے اسے نشے پہ لگا دیا۔ اللہ جانے کس حال میں ہے، زندہ بھی ہے یا۔۔۔“  
بے اختیار شانی کے منہ سے نکلا۔ ”وہ زندہ ہے، زلفی!۔۔۔ وہ زندہ ہے۔“

واقعی اسے اس وقت تنہائی کی بے حد ضرورت تھی، تنہائی ہی ایک ایسا گوشہ ہے جہاں انسان خود سے ملاقات کرتا ہے، خود ہی سوال اور خود ہی جواب دیتا ہے۔ سوچوں اور خیالوں کے پلاں میں فیصلوں کا دودھ ملاتا ہے، امیدوں کی شکر گھوٹتا ہے۔ پھر کہیں سے اندیشوں کی پھینکری جاتی ہے اور سب کچھ پھٹ کر رہ جاتا ہے۔ پھر انسان چاہے بھی نہ تو یابی الگ ہوتا اور نہ دودھ شکر۔۔۔ ”شایان! اس ناطے وہ تمہاری بہن ہے۔“۔۔۔ ”بائیں، دائیں، کان انہی الفاظ کی بازگشت سے گونج رہے تھے۔۔۔ شمس، زلفی، حکیم جمالی، مس عاشی، عامل ظہوری شاہ، استاد قرمان، استاد شفو، رفیق ڈوگر، حاجی رجب بیگم، ایک ایک چہرہ اپنی صداقتوں، ملاحتوں اور خباثتوں کے ساتھ مختلف انداز میں اس کے سامنے گھوم رہا تھا۔ دودھ، پانی، شکر، سب کچھ آپس میں گڑ مڑ ہو رہا تھا۔ اسے نیند سی آگئی۔ موت کی چھوٹی بہن نیند سب درووں، دکھوں غموں پریشانیوں، الجھنوں کا دریاں۔۔۔ یہ دونوں نہ ہوں تو انسان پڑا پڑا پھٹ جائے اور دل، بگر کر کرپانی کی طرح بہہ جائیں، دماغ سے بھیجا اہل کر باہر آجائے اور آنکھوں سے دھواں اٹھے لگے۔

چند گھنٹوں کی جھپکی نے اسے پرسکون کر دیا۔ نہاد ہو، کرکڑے بدل کر وہ نیچے اکیڈمی ٹر چلا آیا۔ وہاں حسب معمول رونق تھی، ساز چھڑے ہوئے تھے۔ محمود بوٹی، بوٹی کے ترنگ ٹر بڑی دھیرج۔۔۔ سے ”دیکھ تو، دل کہ جاں سے اٹھتا ہے، یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے“ گا، تھا۔ ”مُر کار چاؤ“، آواز کا درد اور کچھ اس کی اپنی کیفیت۔۔۔ وہ دھوئیں کی طرح بل کھاتا ہوا۔۔۔ شفو کے پلو سے جالگا۔ غزل نے بڑا سکون دیا تھا۔۔۔ حکیم جمالی، ظہوری شاہ، آج دونوں غائب تھے، رفیق ڈوگر بیٹھا چرس پی رہا تھا۔ بیچڑوں کی اصطلاح میں وہ اس کا ”پار کرتا“۔۔۔ کے ساتھ اس کی بھی رسمی طور پر شادی ہوئی تھی مگر بے ضرر، بے نیاز سادہ علت۔۔۔ شانی آگے پیچھے وہ کتے کی مانند دم ہلاتا رہتا۔ شانی آج ناچ گانے کی تعلیم میں نہیں بیٹھا تھا، سوچا سوئی شمس پر انکی ہوئی تھی مگر آنکھیں سامنے ناچتے ہوئے زخموں اور زخم نما لڑکوں پر انکی تھیں۔ بھائی شمشاد ہاتھ میں ہاتھی دانت کی ٹٹھ والی بید کی چھڑی کے اشارے سے شاگردو زرت بھاؤ تیار ہے تھے بلکہ کبھی خود بھی اٹھ کر ردھم پہ قدم ملا کر دکھاتے۔ پیرانہ سلا رعرش زدگی کے باوجود بھی وہ گھنٹوں ناچتے اور کہتے تھے کہ گانا اور ناچنا، مسلسل ریاضت۔ ساتھ رہتے ہیں۔۔۔ یہاں سے بھی طبیعت ادبی تو شایان استاد شفو کو لے کر دفتر آ بیٹھا۔ ”کیا بات ہے، شہزادے! آج ریسرسل سے بھی غائب اور موڈ بھی آف۔۔۔؟“۔۔۔

نے چرس کی پھلکی کو دیا سلائی سے شعلہ دکھاتے ہوئے پوچھا۔

”بس یونہی۔۔۔ آج طبیعت بوجھل سی ہے، شاید بدلتے موسم کا اثر ہے۔“ شانی نے جیسے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ اسی وقت دواجنی اجازت لے کر اندر داخل ہوئے۔

”جی۔۔۔ فرمائیے؟“

استاد شفو نے انہیں بیٹھنے کے لئے کہا، میوزک پروگراموں کے لئے لوگ آتے جاتے رہتے تھے مگر وہ کھڑے کھڑے ہی پوچھنے لگے۔

”ہم شہزاد کے بارے میں دریافت کرنے آئے ہیں۔۔۔ کیا وہ یہاں آیا تھا؟“

استاد شفو نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ غلط جگہ پہ آئے ہیں، ایسے کسی شخص کو ہم نہیں جانتے۔ یہ میوزک اکیڈمی ہے، یہاں صرف میوزک ڈانس سیکھنے والے ہی آتے ہیں۔۔۔ ویسے آپ کہاں سے آئے ہیں اور شہزاد کون ہے؟“

ان میں ایک بڑی مونچھوں والا بولا۔ ”یہ شہزاد بڑا حرامی اور فراڈی ہے۔ اسے ایک خطرناک بیماری ہے۔ اس نے ہمارے ساتھ بہت بڑا ہاتھ کیا ہے، ہم اسے تلاش کر کے فائر ٹھوکنا چاہتے ہیں۔۔۔“ وہ موزر دکھاتے ہوئے مونچھوں پہ تاؤ دے رہا تھا۔

استاد شفو بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”آپ یہاں کیسے تشریف لائے ہیں۔۔۔؟“

اب دوسرا مشنڈا بولا۔ ”بس جی، کسی نے بتایا تھا کہ اس بلڈنگ میں اس حرامی کا کوئی دوست رہتا ہے۔ وہ بھی مونیج میلے اور ناچ گانے کا شوقین ہے اس لئے ہم یہاں اس کا پتہ کرنے آئے ہیں۔۔۔“

استاد شفو نے بھرا ہوا سگریٹ شانی کو دیتے ہوئے ان سے کہا۔ ”آپ کوئی چائے پانی۔۔۔؟“

ایک بولا۔ ”ہم یہاں پینے پلانے نہیں، اس کتے کو تلاش کرنے آئے ہیں۔۔۔“ استاد شفو اب دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ موزری اپنی بغل میں دبالو اور نیویں نیویں یہاں سے شکل گم کر دو ورنہ اس کھڑکی سے نیچے پھینکوا دوں گا۔۔۔“ ہکا بکا دونوں اس چرخ کو دیکھنے لگے۔ ان کی شی گم ہو چکی تھی، ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے وہ باہر کھبک گئے۔

”واہ، استاد جی! کمال کر دیا آپ نے۔۔۔ ان بٹے کئے ساندوں کو ایک منٹ میں بکری بنا لیا۔ آپ ان کے موزر سے بھی نہ ڈرے، میرے خیال میں وہ بالکل اصلی تھا۔۔۔“

وہ سگریٹ کاش کھینچتے ہوئے مسکرایا پھر کہنے لگا۔ ”بھولے بادشاہ! میں نے انہیں پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا، یہ اس بازار کے دلال اور دو نمبر کے بد معاش ہیں۔ ان کے موزر فائر نہیں کرتے، یہ صرف منہ سے فائر کرتے ہیں اور اگر آگے سے بھی کوئی منہ سے فائر کر دے تو یہ بکری بن جاتے ہیں۔ یہ پہلے پرکاتے ہیں، کوئی نہ پرکے تو خود پرک جاتے ہیں۔“ وہ آنکھ دبا کر مزید کہنے لگا۔ ”اپنی برادری کے جو ہوئے۔“

”یہ شہزاد والا کیا چکر ہے۔۔۔ وہ اسے بڑی گالیاں دے رہے تھے۔۔۔؟“

”میری جان! ہمیں کیا لینا دینا۔ کوئی کیا کرتا ہے، وہی جانے۔۔۔ آنکھیں، کان اور منہ پہ کنٹرول بڑا ضروری ہے۔ کبھی کسی کی نشاندہی نہیں کرنا چاہئے، خواہ مخواہ بیلے میں بازو دینے والی بات ہو جاتی ہے۔۔۔“

”مگر یہ بیماری والی بات۔۔۔ مجھے تو کوئی خطرناک بات معلوم ہوتی ہے۔۔۔“

”شانی صاحب! امریکہ اور یورپ میں ایسی کئی بیماریاں پھیلی ہوئی ہیں۔ آپ تو پڑھے لکھے ہیں، اخباروں میں پڑھتے ہوں گے۔ یہ بیماریاں مرد و عورت کو ایک دوسرے سے لگ جاتی ہیں۔ ایک دوسرے کے خون، غلاظت، تھوک اور انجکشنوں کی سرنجوں سے ایک دوسرے تک منتقل ہو جاتی ہیں۔“ پھر وہ خود ہی تشویش بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ ”میری چھٹی جس بیماری ہے کہ ان لوگوں کا یہاں تک آنا بے معنی نہیں ہو سکتا، ضرور کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ شہزاد نے ضرور کوئی کارنامہ دکھایا ہے۔۔۔“

تھوڑی دیر کے لئے دونوں کو چپ سی لگ گئی پھر استاد شفو خود ہی بڑبڑانے لگا۔

”پچھلے موج میلے میں شہزاد نے ایک سرنج سے سب کو بلیک ٹائیگر کے انجکشن لگائے تھے اور وہ بتا بھی رہا تھا کہ وہ کئی روز موتیاں جان کے ہاں موج میلہ کرتا رہا ہے۔“ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ موتیاں جان کو یہی سرنج ٹھوکی ہوگی جس سے وہ بیمار ہو گئی ہوگی۔ اسی وجہ سے یہ لوگ شہزاد کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔۔۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اس رات، شمسہ کو بھی انجکشن۔۔۔؟“

”اس کو تو سب سے پہلے ٹھوکا تھا۔ میں نے ہی۔۔۔ وہاں سب نے انجکشن لگوا۔

تھے۔“

شایان کا سارا ابو کھینچ کر اس کی مٹھیوں میں آگیا، اس نے زور سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں غصے اور جذبات سے اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ دانتوں تلے زبان داب کے سر جھکا کر:

گیا۔

اسی رات گیارہ بجے کے قریب یہ سب شیطان، ظہوری شاہ کے دفتر بیٹھے اس نئی افتاد پہ تپاس آرائیاں کر رہے تھے۔ عامل ظہوری شاہ کے علاوہ سب کے چروں پہ بارہ بجے ہوئے تھے۔ یہ شاید پہلا موقع تھا کہ چاریاری ساری جمع تھی مگر شراب نہ کباب نہ شباب، سگریٹ تھے وہ بھی سادے جن کو وہ بے پیرادھواں کہا کرتے تھے۔ آج وہ اپنے ”امریکن“ پیر شہزاد کی کارستانی اور اچانک گمشدگی پہ بڑی سنجیدگی اور تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ بلیک ٹائیگر کے استعمال سے اس کی اور اپنی خستہ حالت، ایک ہی سرنج، پیر کے انگوٹھے، انجکشن لینے کے بعد مسلسل بدکاری کا رجحان پیدا ہونا، اس کی پراسرار گمشدگی، موتیاں جان کا بیمار پڑنا، اس کے آدمیوں کا اسے تلاش کرنا۔ یہ سب کچھ، یہ ساری باتیں جب ان کے دماغ میں آئیں تو ان کے اندر ہول اٹھنے لگے۔ ٹیلی ویژن اور اخباروں کے اشتہارات ان کی نظروں کے سامنے پھرنے لگے۔ ایڈز کی تباہ کاریاں، ہولناکیاں اور دہشت ناک موت کے مردہ ڈھانچے رقص کرنے لگے۔ سب کے سب خوف کے خول میں سمبے ہوئے چوہوں کی مانند دبکے پڑے تھے جبکہ عالم ہری شاہ اسے محض واہمہ قرار دے رہا تھا۔ کسی نے حکیم جمالی سے ایڈز کی نشانیاں پوچھیں سب ہی اپنے جسم پہ سرنج دانے، دھبے اور گلٹیاں دیکھنے لگے۔ استاد قربان نے تو باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ حکیم جمالی قدرے سکون سے تھا، اس کا کہنا تھا کہ اول تو ایسی کوئی بات نہیں اور کچھ ہے بھی تو اس کا ابتدا میں ہی قلع قمع کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی مرحلے میں یہ بالکل بے ضرر ہے، اس کے تدارک کے لئے اس کے پاس کئی ایک نسخے موجود ہیں۔ استاد شفو نے رائے پیش

نا۔

”شہزاد کو ہر حال میں تلاش کرنا ضروری ہے، وہی ہمارے خدشات اور پریشانی دور کر سکتا ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارا سب کا محض وہم ہی ہو۔“

اس رات کوئی بھی سکون سے نہ سو سکا۔ دوسرے روز شہزاد کی تلاش شروع ہوئی۔ جہاں ہاں اس کی موجودگی کا امکان تھا، ہر جگہ پتہ کروایا مگر اسے ملنا تھا، نہ ملا۔

ایڈ پارٹی تو اصلی پھیلیوں کو چھانسنے کے لئے بطور چارہ تھے۔ جس طرح گینہوں کے ساتھ گھن بھی پیتا ہے، یہ بھی رگڑے گئے۔ وہ شاطر، ان کو موت مات دے کر سباط سے لڑھک کر ان کی سباط سے باہر کراچی بیٹھا تھا۔ سکندر بخت اور شہزاد یہاں حاجی گل کے مہمان تھے جو روزانہ کروڑوں کی خام اور پختہ منشیات کالین دین کرتا تھا۔

اگلے دن حاجی گل کے پاس ان دونوں کے علاوہ مشہور منشیات اسمگلر سردار تمن، مطیع الرحمن اور رہبر شاہ بیٹھے بلیک ٹائیگر کے فارمولے کا تجزیہ کر رہے تھے۔ سکندر بخت ان کو بریفنگ دے رہا تھا۔ فارمولے کا بنیادی عنصر بائٹھ فیصد خالص مائع کو کین تھی، اس کے علاوہ چند اور مسکن ادویات جو سیکرٹ تھیں۔ سارا فارمولا اوپن تھا اور یہ سیکرٹ ادویات، ان کے نام دیگر معلومات اس کے دماغ اور ایک ڈائری میں تھیں۔ پچاس فیصد خالص منافع کے عوض وہ یہ معلومات فراہم کرنے پہ آمادہ تھا اس شرط کے ساتھ کہ ان کے نام اور مقدار، پروسیڈنگ وہ ظاہر نہیں کرے گا۔ مال کی ایک کھیپ تیار کرنے کے بعد وصولی کر کے دوسری کھیپ تیار کرے گا۔ شہزاد اپنی خدمات اور معاونت کے عوض محض پانچ فیصد کا پارٹنر تھا۔ بات چیت ابھی کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی۔ سردار تمن پورا فارمولا حاصل کرنے کے بعد اس منصوبے پہ سرمایہ کاری کرنے کے حق میں تھے جبکہ حاجی گل اور دیگر لوگ، پچاس فیصد شراکت کوئی اچھا مناسب سمجھتے تھے۔ ان جرائم پیشہ، کالے دھندے والوں کی وفاداریاں محض وقت کے تقاضوں اور وسیع تر مفاد حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ وعدے، اخلاق، تعلقات اور انسانی جانیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ مکاری، ابن الوقتی، ہوشیاری اور خطرات مول لینے کے فن میں جو طاق ہو گا وہی سکندر کہلائے گا۔ ایک اور راز جس سے صرف سکندر بخت اور شہزاد ہی واقف تھے، یہ تھا کہ بلیک ٹائیگر کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ مرد یا عورت دونوں کے جنسی اور جذبات نظام کو بری طرح انکیت کرتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے شدید گرمی میں انسان ٹھنڈی بوتلوں پہ بوتلیں چڑھا جاتا ہے، پیٹ پھٹنے پہ آجاتا ہے مگر پیاس نہیں بجھتی۔ بلیک ٹائیگر کے انکیشن لینے والے کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ اندرون جسم زخم بن جاتے ہیں۔ اگر فوری طور پر نشہ نہ چھوڑے یا علاج نہ توجہ نہ دی جائے تو زخموں میں پیپ پڑ جاتی ہے جو بگڑ کر خطرناک آفتک کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور آفتک وہ نامراد مرض ہے جو میل ملاپ سے آگاہ نیل کی طرح پھیل کر زندگیاں تباہ کر دیتا ہے۔ انگارے پھانکنے سے وہ جلن سڑن نہیں ہوتی جو پیشاب کا ایک قطرہ رکنے سے ہوتی ہے۔ شہزاد بھی اس قبیح عارضے کا پرانا علاج مریض تھا۔ سکندر بخت نے اسے اس خوفناک حقیقت سے بے خبر رکھا۔ شہزاد کو ہوش اس

شہزاد صبح کی پہلی فلاٹ سے کراچی پہنچ چکا تھا اور اس وقت اپنے ایک پاکستانی نژاد امریکی دوست سکندر بخت کے ساتھ سہراب گوٹھ کے ایک زیر زمین دفتر میں بیٹھا بلیک ٹائیگر کا پاکستانی برانڈ تیار کرنے پہ غور و خوض کر رہا تھا۔ سوات کارہنے والا اعلیٰ تعلیم یافتہ سکندر بخت پیشے کے اعتبار سے ایک کیمسٹ تھا، اعلیٰ تعلیم اس نے ورجینا کی یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ امریکنوں کی طرح سرخ سفید، سبز آنکھیں، تانبہ بال، امریکن لہجہ۔ وہ کسی طور بھی پاکستانی باشندہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ عیش و عشرت کا دلدادہ، بلا کا مروجہ اور موقع شناس، غیر معمولی ذہانت اور علم و عقل کا مالک۔ نیویارک کے بدنام زمانہ علاقے بروک لین میں ایک ٹیکس ٹانگوں سے معذور عورت کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ عورت بھی کیمسٹری کی استاد تھی، سکندر بخت کی طرح یہ بھی ذہانت اور پیشے کی آڑ میں منفی سوچ کی حامل تھی۔ بلیک ٹائیگر ان دونوں کی مشترکہ کاوشوں، طویل صبر آزمائیوں کا نتیجہ تھا۔ زیر زمین منشیات کے کاروباری حلقوں میں اسے خاطر خواہ پزیرائی ملی تھی۔ اب یہ نیا زود اثر نشہ آہستہ آہستہ وہاں اپنی گونا گوں خصوصیات کی بنا پہ مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ تجربے سے ظاہر ہوا کہ یہ نشہ جہاں انسان کو بے پناہ سکون فراہم کرتا ہے وہیں حیوانی خواہشات کی تکمیل کے لئے بڑا مسکت اور معاون ثابت ہوتا ہے۔ انسان کی جسمانی خامیوں، کمزوریوں کو بے پناہ استحکام اور رغبت بخشتا ہے۔ سکندر بخت نے انہی خوبیوں کے پیش نظر اسے تیسری دنیا کے بے سکون، بے وقوف اور بے لذت لوگوں کو فیض یاب کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے خولیش، بعد درویش والی بات پہ عمل کرتے ہوئے وہ پاکستان گیا۔ شہزاد سے اس کا تعلق بھی اسی منشیات کے دھندے کی وجہ سے تھا اور وہ یہاں اسی ساتھ ایک ایجنٹ کی حیثیت سے آیا تھا۔ لاہور سے تو وہ بھاگ کر امریکہ گیا تھا، موتیاں جان بے وفائی کا داغ سینے پہ تھا۔ اب وہ ایک منصوبے کے تحت لاہور آیا۔ اصل مقصد تو موتیاں جان سے بدلہ لینا تھا، عاشری سے بھی ایک پرانا حساب چکانا تھا۔ یہ بیچارے حکیم جہاںی، ظہوری

وقت آیا جب پانی سر سے اوپر ہو چکا تھا، کوشش کے باوجود پھر نہ تو وہ اس مرض سے خلام حاصل کر سکا اور نہ ہی بلیک ٹانگیر سے جان چھڑا سکا۔ اس کو یقین تھا کہ وہ کتے کی موت مر گا۔ اسے اپنے انجام بد کی خبر تھی لیکن وہ مرنے سے پہلے سکندر بخت، موتیاں جان اور م عاشی کو بھی ان کے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ بالکل وہی بحرانہ ذہنیت۔ اچھی طرح علم ہے کہ انجام گولی ہے پھر بھی مجرم پولیس سے مقابلہ کرتے ہیں۔ موتیاں جان اور مس عاشی وہ ڈس چکا تھا بلکہ ان کے ساتھ غیر ارادی طور پر مکافات عمل کے تحت مس عاشی کے دوسرے ساتھی بھی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ اب صرف سکندر بخت اس کے سامنے تھا، وہ کسی مناسب نفع بخش موقع کی تلاش میں تھا اور یہ موقع اسے خود ہی فراہم ہو گیا۔ کئی روز گزر گئے منصوبے میں شامل افراد کسی قابل قبول فیصلے پہ پہنچ نہیں سکے تھے۔ ایک دن حاجی گل اور ٹ اکیلے بیٹھے اسی موضوع پہ غیر رسمی بات چیت کر رہے تھے۔ حاجی گل نے یونہی اسے کرایا۔

”شنزاد بھائی! یہ سکندر بہت بڑی ڈیمانڈ کر رہا ہے۔ تم بھی تو اس کے ساتھ ایک لمبے عرصے سے کام کر رہے ہو۔ وہ تمہارا دوست ہے۔ کچھ اسے سمجھاؤ، ہاتھ ذرا نرم کرے۔“

بہت بڑی رقم مانگ رہا ہے۔ تم جانتے ہو یہ نیا نیا نشہ ہے، چلے نہ چلے۔ شروع شروع میں اتنا بڑا رسک نہیں لیا جاسکتا۔“

”حاجی صاحب! آپ اس فیلڈ میں پرانے اور تجربہ کار آدمی ہیں۔ یہ نشہ، تمام دوسرے نشوں کا باپ ہے۔ اس کے اثرات اور فائدے تو آپ جانتے ہی ہیں۔۔۔ بلیک ٹانگیر کو ذرا مارکیٹ میں ہوا تو لگنے دیں۔ پھر دیکھیں، کتنی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔۔۔“

”یقیناً“ تم بھی تو اس فارمولے کو جانتے ہو گے۔۔۔ وہ اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے چالوسی کرنے لگا۔ ”اتنا بڑا سودا اور تمہارا صرف پانچ فیصد حصہ۔۔۔ سچی بات ہے، اگر تم جیسا شخص میرے پاس ہو تو تمہیں ساٹھ فیصد کا حصہ دار بنالوں۔“

شنزادہ بھی بڑا کالیاں تھا، وہ اس کا اصل مقصد بھانپ گیا۔ اپنی عیاری پر قابو رکھتے ہو۔ بڑی معصومیت سے کہنے لگا۔ ”حاجی صاحب! سکندر بخت کی ڈیمانڈ واقعی کچھ اوپر ہے لیکن بات تو یہ ہے کہ میں تو ملنگ آدمی ہوں۔ نشہ پانی مل جائے، وہی بہت ہے۔ اس نے جو آفرنا میں نے بھی بنا سوچے سمجھے قبول کر لی تھی۔۔۔ باقی رہا فارمولا تو اسے بنا میں بھی سکھا ہوں بس ایک آدھ کیمیکل میں ذرا شک ہے کہ وہ کیا ہے اور مقدار کتنی ہے۔۔۔؟“

”دیکھو، شنزاد بھائی! اگر تم کسی طرح یہ فارمولا مکمل کر دو تو ساٹھ فیصد تم نفع میں حصہ دار۔۔۔ اگر ایڈوانس چاہو تو جتنا دل چاہے، ابھی نقد لے لو۔ تم بھی خوش ہو“

ابھی۔۔۔“

شنزاد گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر آہستہ سے اس کے قریب سرک کر سرگوشی کرنے لگا۔ ”یہ نامکن نہیں۔ اگر کسی طرح مجھے سکندر بخت کی ڈائری دیکھنے کا موقع مل جائے۔۔۔ وہ ہاکم زیادہ تر کوڈ ورڈ میں کرتا ہے لیکن کسی حد تک اس کی گرل فرینڈ میکی یا پھر میں پڑھ سکتا ہوں۔“

”یہ کون سا مشکل کام ہے؟ اگر آپ وعدہ کریں کہ فارمولے کا مسئلہ حل ہو جائے گا تو میں ڈائری کے ہر صفحے کی فوٹو اسٹیٹ آپ کو فراہم کر دیتا ہوں۔“

وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ”حاجی صاحب! وہ اتنا بے وقوف نہیں۔ اصل ڈائری تو چوبیس گھنٹے اس کی کلائی پہ گھڑی کی صورت بندھی رہتی ہے۔ یہ محض گھڑی نہیں، ایک مکمل کمپیوٹر ڈائری ہے۔ وہ اپنی تمام خفیہ معلومات اور تحقیقات مخصوص کوڈ ورڈ میں فیڈ کر دیتا ہے۔ ہوائف آدمی! اسے حاصل کرنے کے باوجود کچھ حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ اسے آپریٹ کرنے کا کوڈ ورڈ اور ڈیٹا سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔۔۔ میں اسے آپریٹ کرنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں، اگر وہ گھڑی مجھے مل جائے۔۔۔“

”میں گھڑی کا انتظام بھی کر لوں گا۔۔۔ بلکہ کل رات کسی وقت گھڑی تمہیں مل جائے گی۔“

اگلے دن، آدھی رات سے بہت پہلے حاجی گل نے وعدے کے مطابق وہ گھڑی شنزاد کے ماتھے، میز پر رکھ دی۔ شنزاد گھڑی کو پھٹی پھٹی نظروں سے گھورنے لگا جیسے وہ گھڑی نہ ہو، اڑ کر اٹھے، ٹنک مارنے والا اڑن سانپ ہو۔

”شنزاد بھائی! کیا دیکھ رہے ہو؟۔۔۔ یہ وہی گھڑی ہے۔“ وہ قلم اور کانڈوں کا پلندہ اس کے آگے دھرتے ہوئے بولا۔ ”ایک گھنٹے کے اندر اندر اس گھڑی کو واپس کلائی پہ باندھنا ہے۔۔۔“

شنزاد سمجھ گیا تھا کہ یہ گھڑی آسانی سے کلائی سے نہیں اتری۔ وہ حاجی صاحب سے کہنے لگا۔

”آپ آدھ گھنٹے کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دیں تاکہ میں سکون سے یہ کام کر سکوں۔“

حاجی صاحب اٹھ کر کمرے سے باہر نکل کر ساتھ والے کمرے میں ایک مخصوص صوفے پر بیٹھ گئے۔ دیوار پر لگے ہوئے بڑے سے فریم کو سرکایا، شنزاد کے کمرے کا پورا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ شنزاد نے اپنا کام شروع کر دیا۔ مختلف فنکشن گھماتا رہا، ساتھ ساتھ کانڈ پر

لکھتا بھی جا رہا تھا۔ تیس چالیس منٹ تک وہ مصروف رہا۔ اچانک ایک بٹن دبائے ہی ایک دھماکا ہوا، گھڑی سے زرد رنگ کا دھواں فوارے کی صورت خارج ہوا۔ شہزاد کے چہرے پر گھڑی کے درمیان چند انچ کا فاصلہ تھا، چشم زدن میں پورا چہرہ اڑ گیا۔ اگلے روز منگھوڑ پہاڑیوں سے مسخ شدہ چروں والی دو لاشوں کی برآمدگی کی خبر اخباروں میں چھپی، مگر کانگنڈات کے مطابق متوفی امریکہ سے آئے تھے۔ پولیس کا خیال تھا کہ کسی ٹیکسی والے انہیں لوٹ کر قتل کرنے کے بعد یہاں پھینک دیا ہے۔ پاسپورٹ بھی پولیس کو مل گئے غرض انہوں نے مزید کارروائی کے بعد لاشیں پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال پہنچا دیں۔ ان کی خراب تصویریں اخباروں میں چھپیں۔ ملنے والے پتہ پر شہزاد کی اطلاع لاہور پہنچی تو موتیاں جان عامل ظہوری شاہ اینڈ کمپنی کے رنگ پیلے اور سانسوں میں جیسے پھندے سے بڑ گئے، دوسرے کو یوں دیکھنے لگے جیسے آخری بار دیکھ رہے ہوں۔ شہزاد تو خس کم جہاں پاک کر رہے مگر انہیں نپاک وہم اور ایک خوفناک عارضہ ناقابل فہم تقسیم کر دیا تھا۔ ہر کوئی خود کو ٹھٹھا تھا، ایک دوسرے سے اس کی کیفیت پوچھ رہا تھا۔ کچھ وہم، کچھ اپنے بد اعمال کا خوف، کچھ سائی باتوں کا ڈر۔۔۔ سب سبے ہوئے چوہوں کی طرح ایک دوسرے کی وٹیں کتر رہے۔ اس قسم کی ہجانی کیفیت میں انسان نفسیاتی مریض بن کر رہ جاتا ہے اور جس بات کا خدشہ ہے وہی ہو کر رہتی ہے۔ اسی سہا سہی میں چند روز اور آگے کھسک گئے۔

☆☆☆

استاد قربان کے مٹانے میں مسور جیسے سنگ دانے رڑک رہے تھے، تکلیف بڑ پیشاب تیزاب کی طرح لگنے لگا۔ بیت الخلاء، بیت القضاء بن گیا۔ ایک ایک، یکے بعد دیگرے سب میں یہی آثار نمایاں ہونے لگے۔ سوزش پھیلنے لگی، سرخ دھبوں کے نشان بھی ہونے لگے۔ بلیک ٹانگیر، کالی موت کی صورت آنکھوں کے سامنے بھر رہا تھا۔ شبانہ خرم موقوف ہو گئیں۔ شاید یہ پہلا موقع تھا شمسہ کئی دنوں سے فارغ تھی۔ کسی نے اس کی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، دیکھ بھی لیتا تو کیا کر لیتا۔ وہ تو خود بھی نئی افتاد سے ہلکان ہو کر کپاڑے ہوئی تھی۔ اس کے جسم میں جیسے نور دھب رہا تھا۔ پکی پت جیسے پیپ دانے، کھجلی، خار بے دم کر دیا تھا۔ ہوش، یادداشت بحال ہونے پہ یہ پہلا عذاب تھا جو وہ جان پہ چہاں تھی۔ کھوئی ہوئی یادداشت کا ڈرامہ جاری تھا البتہ اس نے اب یہ اہتمام کر لیا تھا کہ کسی بہانے اپنی دوا کو ضائع کر دیتی مگر بے سدھ ہونے والی نشے کی کیفیت کا ڈرامہ دہرائی۔ حانت زیادہ مجبزی تو آلف ننگی ہو کر مگر ان کھسے کے روبرو پاؤں بیٹھنے لگی۔

دیکھا تو وہ گھبرایا، ظہوری شاہ کو فوری اطلاع دی تو وہ حکیم جمالی کے ساتھ بھاگا بھاگا آیا۔ شمسہ فرش پر بڑی ایزیاں رگڑ رہی تھی جیسے ہزاروں بھڑوں نے کٹ لیا ہو۔ حکیم جمالی نے آنکھوں، ہانڈوں کا تفصیلی معائنہ کیا لیکن کیا بتائے کہ اسے کیا ہوا ہے؟۔۔۔ وہی جو سب کے ساتھ ہو رہا تھا، جن میں وہ خود بھی شامل تھا۔۔۔ حسب عادت زبردستی مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔۔۔“

فی الفور منشیات اور حرام کاری، حرام قرار دی گئی۔ لوگوں سے ملنا جلنا، تمام مصروفیات رکی کر کے سوڈیوال ڈیرے پہ علاج معالجے کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ مکمل رازداری برقی گئی، کسی کو کانوں کن خبر تک نہ ہوئی۔ حکم دے دیا کہ جب تک افادہ نہ ہو، کوئی ڈیرے کی حدود سے باہر نہ نکلے۔ مزید شٹ لئے تو انکشاف ہوا کہ بشمول اس کے سب کو امریکن آتشک لگ گیا ہے۔ آپ اسے اینڈ مرض کی پہلی اسٹیج بھی کہہ سکتے ہیں۔ سب کو سانپ سونگھ گیا جیسے شہزاد کی بدروح نے سرنج کے ذریعے ان کے جسموں سے روح کھینچ لی ہو۔

”اب کیا ہو گا۔۔۔؟“ بڑی مشکل سے استاد قربان کے منہ سے نکلا۔

رفیق ڈوگر نے شہزاد کی ماں کا رشتہ کتوں کی نسل سے ملاتے ہوئے کہا۔ ”یہ امریکہ سے ہمیں برہاد کرنے کے لئے آیا تھا کیا۔؟“

حکیم جمالی نے اسے ازلی لاپرواہی سے ڈانٹا۔۔۔ ”گھبرانے اور گالیاں بکنے کی ضرورت نہیں۔ آج سے شہزاد کا نام اپنے ہونٹوں پر مت لانا ورنہ کسی اور مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ دونوں اسی وجہ سے مارے گئے ہیں کہ وہ خطرناک نشہ اور خوفناک بیماری لے کر یہاں آئے تھے اور ان کا پہلا شکار موتیاں جان تھی۔۔۔“

رفیق ڈوگر بولا۔ ”مگر تو اس کی موتیاں جان سے تھی، ہم سے اس کی کیا دشمنی تھی۔؟“

”میری جان! ایسے کاموں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ شاید وہ اپنے انجام سے باخبر تھا اور اپنی اطلاع بیماری کا بھی اسے علم تھا۔ وہ اپنے انجام تک پہنچنے سے پہلے یہ نکلے اپنے جیسے دوستوں میں مٹی باٹنا چاہتا تھا جیسے ہاتھی گرتے گرتے پانچ دس سوروں کو بھی لے کر مرتا ہے، ایسا سلوک وہ ہمارے ساتھ بھی کر گزرا۔۔۔ ڈوگر صاحب! آخر ہم اچھا برا سب مل بانٹ کر ہی کھاتے پیتے ہیں اور کچی پکی کھانے سے کبھی کبھی بد ہضمی بھی ہو جاتی ہے۔۔۔“ پھر سب سے سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔ ”اپنی منجوس شکلیں گم کر کے یہاں ڈیرے میں بند ہو جاؤ۔ علاج کراؤ، پرہیز اور آرام کرو۔ تین چار ہفتوں میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔ یہاں بند رہنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ

ہفت آتش ہیں۔ آگ گندھک سا تیزاب اور متعفن پیپ، مریض کا مقدر بن جاتی ہے۔ وہ دیواروں سے ٹکریں مارتا ہے مگر اسے چین نہیں پڑتا، زرخہ کئے بکرے کی طرح ڈکراتا اور بلانا ہے مگر اسے موت نہیں آتی۔ علاج بھی بڑے دردناک اور ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔ ابھی میں تو باشت بھر لمبی لمبی موٹی موٹی سرخیوں جب پیٹھ پہ ٹھوکنی جاتی ہیں تو مریض کی چیخیں لگ جاتی ہیں۔ حکیم، سنیا سی، عطائیوں ویدوں کے اپنے علیحدہ علاج اور طریقہ کار ہوتے ہیں مگر دیکھو وہ بھی عذاب ناک ہیں۔ مریض کے ایشٹام پہ لکھ دیتا ہے کہ ساری زندگی وہ ناف کے نیچے نظر نہیں ڈالے گا۔ حکیم جمال کے پاس ان جملہ عارضوں کے بے شمار تیرہ ہدف نسخے اور لاج موجود تھے، وہ کھاتا پیتا ہی انہی نسخوں ٹونوں کے دم سے تھا۔ سنیا سی باوا آنجنابی نے بتایا تھا کہ پچھانی کی پھانس اتنی ڈکھن نہیں دیتی جتنی آتشک کی دھانس دکھ دیتی ہے۔ آتشک کا مریض اور پاگل ہاتھی ایک برابر ہیں، دونوں توپ دم کے قابل ہوتے ہیں۔ ہاتھی کے پاگل رہنے کا کارن جوانی کی مستی، غضب کی انتہا ہوتی ہے جبکہ آتشک غلیظ بیمار عورت۔ یا پھر کسی حکیم کے ہاتھوں غلط سلط، کچے کچے بھسم استعمال کرنے سے جزیں پکڑ لیتا ہے۔ مرے ہاتھی سے سوا لاکھ نکل آتے ہیں مگر آتشک کا مریض اپنے اور دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنی آئندہ لک کا جواب دہیاد کر کے دو کوڑی کا کر دیتا ہے لیکن سنیا سی باوا شاید امر کی بلیک ٹانگیر، سنگاپور کی نڈرا اہرے، ویارگراسری لنکن لنگوروں کی غددوں کے قیمتی قلعے، ریچھ کی ہڈی اور بر شیر کی جلی، بزمین سلور کیپوٹ کے اثرات اور ہلاکت آفرینیوں سے واقف نہ تھا اور نہ ہی وہ بنگلہ، پھاٹوں، ویرانوں سے نکل کر شہروں کی منڈیوں، فیشن ایبل پوش علاقوں کے میٹ قبہ خانوں، کلبوں، ہوٹلوں، نام نہاد کمیونٹی سینٹروں، گیٹ ہاؤسوں اور ہوٹلوں سے گزرتا تھا جہاں ہزاروں الماسائیں، نیلیں، پکھر اچیں، زمردیں یہ سوغات فراوانی سے تقسیم ہیں اور نہ وہ مرض آتشک کے ماخذ اتنا محدود نہ بتاتا۔

حکیم جمالی کو ایک رات ابرق سیاہ کے بھسم کی کچھنڈ کھوتے ہوئے باوا نے بتایا تھا کہ بچہ! کو انا پڑھو تو کشا نڈر دباؤ تو آتشک باہر نکل پڑتا ہے۔ سنیا سی باوا کی ناظر سے اسے کئی مجرب، آزمودہ نسخے، نوٹکے اذیر تھے جبکہ وہ خود بھی اسی وقت اسی لمرض سے گلابی ہو رہا تھا اور یہ چند مریض ہر چند اس کے لئے لائق تشویش نہ تھے۔ جن میں تھا کہ اگر یہ سب جم کر علاج پر ہیز اور صبر کر لیں تو اس مصیبت سے نجات حاصل کر سکیں گے۔

کلاؤال ڈیرے پہ سب ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ ڈیرے دار حکیم جمالی نے عقب

شہزاد اور اس کے ساتھی مارے گئے ہیں۔ مجھے پکا یقین ہے کہ یہ کارروائی موتیاں جان غنڈوں نے ڈالی ہے۔ وہ شہزاد کی تلاش میں یہاں بھی پھیرا ڈال گئے تھے، شہزاد کے پہلے اور ہمارے اس سے تعلقات کا شک انہیں ہو گیا ہوا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ پھر ہمیں کریں یا پولیس کو ہماری نشاندہی کر دیں۔ پولیس ابھی ان کی موت کی تفتیش کر رہی، ممکن ہے کہ پوسٹ مارٹم یا کسی اور ذرائع سے ان کی بیماری بھی سامنے آجائے۔ پھر یقیناً ان لوگوں کو بھی تلاش کرے گی جن سے وہ ملا ہوا انہیں جانتا ہو اس لئے زبان بند، پانچ وقت نماز پڑھو، اللہ سے اپنے گناہوں کی توبہ کرو اور باقاعدگی سے علاج کراؤ۔“

عالم ظہوری شاہ بولا۔ ”یار! جمالی! بہت برا ہوا، ہم تو مارے گئے۔۔۔ کام دھندلا چو یہاں کپسہ بند رہ سکتے ہیں۔۔۔؟“

”شاہ جی! کام دھندا چھوڑ کر انسان قبر میں بھی تو رہ سکتا ہے، جیل میں بھی تو سوسکر ہم اگر یہاں نہ رہیں گے تو یقین کریں، پھر قبر ہی ہماری منزل ہوگی یا کم از کم جیل تو کبیر نہیں۔۔۔ کسی کو ہوانہ لگتے دیں کہ ہمیں کیا بیماری یا تکلیف ہے۔ کسی نہ کسی طرح ہر مہینہ پر ہیز اور علاج کرلو۔۔۔ وقت گزاری کے لئے کوئی نہ کوئی مشغلہ اختیار کرلو۔ یہ ہے کہ پہلے داڑھیاں بڑھاؤ، بابے میاں ہنگامی کے مزار پر نعت قرأت کے مقابلے شروع دو۔ رمضان شریف بھی آ رہا ہے۔ خوب روزے، نمازیں، تراویح پڑھو۔ انظار پارہ اپنی صحت اور عاقبت کے لئے دعائیں کراؤ، اللہ بہتر کرے گا۔۔۔“

”شمسہ کا کیا کریں، اس کا تو ہم سے بھی برا حشر ہے۔۔۔ مس عاشی کہہ رہی تھیں لیڈی ڈاکٹر کو دکھائیں۔۔۔“ ظہوری شاہ نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

”نہیں، بالکل ایسا نہ کرنا۔۔۔ فی الحال اسے وہیں فلیٹ میں رہنے دو۔ میں نے اسے بندوبست کر دیا ہے، اس کا علاج وہیں ہو گا۔۔۔ ہاں، کوئی بھی اس کے قریب جائے۔۔۔“

سیانے کہتے ہیں کہ عورت کے لئے بچہ جننے سے زیادہ اور کوئی تکلیف یا مصیبت ہوتی اور مرد ہر مصیبت، دکھ، درد ہنسنے مسکراتے برداشت کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ عالم ہاتھ پاؤں تک کٹا دیتا ہے مگر پیشاب اور اسی نوع کے جملہ عوارض ایسے عذاب تکلیف دہ ہوتے ہیں کہ بڑے بڑے شہہ زوروں اور حوصلے والوں کو بچوں کی مانند ہوئے دیکھا ہے۔ انہی امراض خبیثہ میں سرفہرست سوزاک اور آتشک ہے۔ سوزا شاید دو چار پل چین مل جاتا ہو مگر آتشک کا آزار، ایک عذاب ہے۔ آتشک لفظ کا

میدان باوا میاں ہنگامی کے مزار پہ دو تین ڈھول پیٹنے والوں کا مستقل انتظام کر دیا تھا، کچھ دھارے ملنگوں کو اکٹھا کر کے بھنگ رنگ کا انتظام بھی کر دیا۔ ڈھول اور دھمال والے باری چوکیاں بھرتے۔ مقصد اس دھماکو کڑی کا ان مریضوں کی آہ و بکا پہ پردہ ڈالتے ہوئے کرنا تھا۔ ڈیرے کے اندر چادریں دریاں بچھا کر ان کے گلوں میں ہار ڈال کر مرا تپے کی میں بٹھادیا، درمیان میں دو من کا پللی چنوں کا ڈھیر ڈال دیا۔ ادھر ادھر لوگوں میں مشہور کر دیا ہنگامی کا سوا کروڑی جلالی وظیفہ ہے۔ شامل ہونے والوں کے لئے ضروری ہے کہ آخراً مسلسل یہاں بیٹھ کر پڑھیں۔ پنج گانہ نماز کے علاوہ روزے کی بھی پابندی ہے اور تقریباً چالیس روز۔ دس دن پہلے اور تیس دن رمضان کے، ستائیسویں کی رات ختم پڑھ کر باوا کے مزار پر چار چڑھائی جائے گی۔ وہاں کن ٹٹوں میں ایسا کون سا پرہیزگار ساتھ بیٹھ جاتا۔ جس نے شرائط سنیں، دم دبا کر بھاگا۔ مقصد بھی یہی تھا کہ کوئی اور نہ پڑے۔ یہ پکھنڈیئے، وظیفے کی آڑ میں اپنا منوس علاج شرع کر سکیں۔ حاجی رجب بیگم نے اپنے چم کے چیلے ان کی دیکھ بھال اور خدمت پر نامور کر دیئے تھے اور دروازے بند۔ حکیم جمالی نے گائے کے مکھن میں دو تنکے کشتہ رکھ کر پہلی خوراک خود کھائی، پھر کو بھی چٹائی۔ بعد میں عرق بادیاں اور گلاب کے عرق کے ساتھ کوئی اور دوا بھی استعمال سرخ مٹی کے پختہ گلاس جن کے پیندوں میں ایک تہائی حسن ابدال کے چشموں اور کیلا ملی نیم گرم سفید ریگ تھی، کچے انگوروں پہ انگوچھوں کی مانند چڑھا کر انہیں ڈال دیا۔ پھر اوپر چادر ڈال کر اکڑوں بیٹھایا، پیٹھ تلے موٹی تلائیاں اور گدے نکادیئے اندازاً ”کلو بھر چنے آیتہ الکریمہ پڑھنے کے لئے رکھ دیئے۔ خاموشی سے ورد کرنے کا کر، خود بھی شامل ورد ہو گیا۔

بد معاش اور جرائم پیشہ لوگ بڑے بزدل اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔ ان کی دھمکیوں، داراتوں اور کاروائیوں کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کی طرح واضح ہو جائے گی کہ یہ سارے جعلی عکس ہوتے ہیں۔ قاتل، ڈکیت، اسمہ اشتہاریوں کو چھوڑ کر غلطی سطح کے جتنے بھی جرائم پیشہ ہوتے ہیں، بچارے قابل ر بکریاں ہوتے ہیں کہ ذرا کہیں کھنکھوا، جھٹ بینگیاں کرنا شروع کر دیں گے۔ ہلکا کے پیٹ پتلے کر دیتا ہے، یہ ہمیشہ ایک دوسرے کے کندھوں پر سوار ہو کر اور گیدڑو غولوں میں رہ کر شیر ہوتے ہیں، اکیلے دو کیلے کارروائی ڈالنا ان کے بس کی بات نہیں روہا ہوں کا غول بھی اسی ”قبیلہ بزدلان“ سے تعلق رکھتا تھا۔

ماہ رمضان کی آمد آمد تھی۔ اس مقدس مہینے میں یوں بھی قدرتی طور پر شیطانی کاموں اور اردوایوں میں کمی آ جاتی ہے۔ برے سے برے لوگ بھی وقتی طور پر ہی ہسی، دیکھا دیکھی اب اور بارسا بن جاتے ہیں۔ عشرت گاہیں، رنگ و رامش اور جام وینا کی محفلیں سنان ہو تی ہیں۔ تھنکرو خاموش اور طبلے سارنگیوں پہ غلاف چڑھ جاتے ہیں۔ چلو، اچھے برے ہسی اس مہینے اکثر لوگ مسلمان نماز تو بن جاتے ہیں۔ استاد شغوی اکیڈمی اس غیر موجودگی سے بے ہی پھسکی پھسکی سی تھی، رمضان شریف کی آمد سے بالکل ہی اجڑ گئی۔ ساز سازی، سفید نمونوں میں پلیٹ کر طاقتوں کی قبروں میں لٹا دیئے گئے۔ موسیقی اور رقص کے طالب علم عید ہچٹی پہ چلے گئے اور مستقل یہاں روٹیاں توڑنے والے سفید ٹوٹیاں اوڑھ کر انڈوں پہ بیٹھ گئے۔ بھائی جی، شمشاد پاندان اٹھائے اپنے میکے یعنی حاجی رجب بیگم کے ڈیرے آبراہمن گئے۔ آخری عشرے اعتکاف بیٹھنے کا ارادہ تھا۔ ادھر حکیم جمالی کے ڈیرے پر سارے لعنتی کارسوزا کیئے زانوں میں دوا آلود ریت سے بھرے ہوئے گلاس دبائے، چنوں کے پہاڑ سے نہ دانہ بھاڑ پھوڑتے ہوئے ہائے ہائے کر رہے تھے۔ علاج اور اذیت، دونوں عروج پہ تھے۔ رے کے پچھلے دروازے کے باہر، نیم کی سبز ٹہنیوں کا انبار پڑا ہوا تھا۔ حکیم جمالی نے ماہ صیام رعایت سے سب مریضوں کے لئے فٹ فٹ بھر لپی مسواکوں کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ کچھ بات قسم کے ملنگ نیم کی نبولیاں اور بکل بھنگ کے کوندوں میں گھوٹ رہے تھے جو سحری نماں روزہ داروں کو بطور سحری کھائی جاتی تھی۔ نیم نبولی کی گری گوند اور بور دانے کا لعوق تیار تھا جو انظار کی وقت چٹایا جاتا تھا۔ اندر پڑھائی کے کمرے میں اگر بیٹوں کی بجائے نیم اڑیں سلگ رہی تھیں، گردنوں میں نیم کے سبز پتوں کے ہار بہار دکھا رہے تھے۔ بڑے دلے استنجہ کے لئے نیم چھال کا ابلا ہوا پانی کنستروں میں بھرا پڑا تھا۔ کڑواہٹ سے بھرے نئے طلق، ادھ جلتے شور، مرؤے کی طرح سفید خاک رنگے ہونٹ، وحشت اور دہشت سے لالہ ہوئی آلوؤں کی مانند مردم، مرض اور ماحول بیزار آنکھیں اور لرزیدہ خمیدہ بدن کمرے کے مزار ماحول میں یوں دکھائی دیتے جیسے ماہ رمضان کی برکت کی وجہ سے اس علاقے کے طاقتور بدکاروں کو یہ نیاں ڈال کر یہاں قید کر دیا گیا ہو۔ حاجی رجب بیگم اور شاگرد پیشہ زنانوں، اندر باہر، سارا انتظام سنبھالا ہوا تھا۔ نیم پر ہیزی کھانے ان ہی کی نیم نگرانی میں تیار ہوتے۔ مزار پہ چوکی بھرنے والے ڈھولیئے سحری سے جگانے پہ مقرر کر دیئے تھے۔

☆☆☆

ادھر مشر بھی زیر علاج تھی۔ نواب بی بی کھرا اپنے ایک معتمد ہجرے کے ساتھ حکیم

کے فلیٹ سے چند فٹ دور ایک پنجرے میں بلبل کی مانند قید ہے۔ زلفی، شمسہ! بھائی، بسن کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجتی رہتی۔ عامل ظہوری شاہ اور اس کے چیلے چانٹوں پہ شہزاد کے حوالے سے جو گزر رہی تھی، اس سے بھی وہ بے خبر تھا۔ شہزاد کی موت کے بارے میں وہ جان چکا تھا مگر اس کی وجہ سے کتنی جانوں پہ بنی ہوئی ہے، وہ نہیں جانتا تھا۔ شمسہ پہ کتنا کٹھن وقت آیا ہوا ہے، سے بھی بے خبر تھا۔ اس کا زلفی سے اس دن کے بعد رابطہ ہی نہیں ہوا تھا، اس کو اس نے خود ہی ادھر آنے سے منع کیا ہوا تھا۔ یعنی اسے ٹیلی فون بھی نہ کر سکا اور والدین — وہ انہیں جیسے بھول ہی چکا تھا۔ منشی کرم الہی جمعہ کے جمعہ گھر پھر اڑا لیا اور خیر خبر، کبھی شکر لے آتا۔ اس کی اپنی تکلیف تقریباً "ختم ہو چکی تھی۔ نہ رہے بانس، نہ بچے بانسری۔

☆☆☆

ریشی سنہری زلفیں شانوں پہ جھول رہی تھیں۔ روئیدگی سے پاک چہرہ کنول کی مانند کھلا ہوا، مومی انگلیوں کے سروں پہ سرخ دراز نانتوں کی روشن لوتیں، تازہ چھدے ہوئے کانوں میں فیروزے جڑے ٹاپس، نازک سے نتھنے میں نیلم کی ننھی سی جھلمل جھلمل کرتی ہوئی لرزاں لوگی۔ دن بہ دن جیسے اس پر نکھار آ رہا تھا۔ نزاکت، نزاکت، مزاحمت، مزاحمت جیسے انگ انگ سے پھوٹ رہی ہو۔ چال ڈھال میں بھی اک نزاکت در آئی تھی۔ اس کے ملازموں اور ارد گرد جاننے والوں نے جیسے اسے اس نئے انداز و روپ میں قبول کر لیا تھا۔ پڑھائی کے لئے پلے وہ سمن آباد کے ایک سنٹر میں جاتا تھا، لباس رنگ و روپ بدلے تو وہاں جانا ترک کر دیا اور اسی سنٹر کے ایک ٹیوٹر عرفان صاحب سے اپنے فلیٹ میں ہی پڑھنے کا انتظام کر لیا۔

☆☆☆

استاد شہو اور ظہوری شاہ اپنے اپنے ٹھکانوں سے غیر حاضر تھے۔ مس عاشی انہیں کھوجتی ہوئی شملی کے پاس پہنچی، یہیں سے معلوم ہوا کہ یہ سب لوگ سوڈیوال ڈیرے پہے ہیں۔ دونوں اہل پنپے۔ بلاوے کے مزار کار نگ ہی بدلا ہوا تھا۔ ڈھولے ڈھول پیٹ رہے تھے، ملنگ اور بھنگ بڑے اپنے رنگوں میں رنگے ہوئے تھے۔ آگے پیچھے دروازے بند تھے۔ اپنی آمد کی اطلاع کو لائی تو دروازہ کھلا۔ اندر داخل ہوئے — سبحان اللہ! بگے بھگت، سفید ٹوپیاں پہنے پنے بدلے میں مصروف تھے۔ نہ علیک نہ سلیک، نہ کسی نے نظر ملائی، نہ بیٹھنے کو کہا۔ یہ دونوں تین پریشان، ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ عجیب سے چلے۔ چروں پہ نحوست اور ازیت بھری ہوئی، زیر لب کچھ گفتگو رہے تھے۔ ارد گرد چند زنانے سروں پہ اوڑھنیاں باندھے خاموشی سے بالاب بیٹھے تھے۔ مس عاشی بھی سر پہ دوپٹہ استوار کر کے ایک کونے میں بیٹھ گئی، نیم کی

جمالی کی ہدایات کے مطابق باقاعدگی سے اسکی دوا اور پرہیز علاج پہ دھیان رکھے ہوئے تھا۔ مہ و شام دو دو گھنٹوں کے لئے اسے سرکنڈوں کے موڑے پہ اکڑوں بیٹھایا جاتا تھا جس کی نشہ معذور بوڑھوں کی کموڈ کرسی کی طرح درمیان سے کھلی ہوئی تھی۔ مٹی کی سوراخوں والی کھلا منہ کی ہنڈیا جس میں چندن چیز، چلنوزوں کے چھلکوں کی ادھ، بجھی گرم گرم بھو بھل کموڈ کے نیچے دھری رہتی۔ وقفے وقفے سے نواب بی بی کسی دوا کا چٹکی بھر رواہ اس پہ ڈال دیتی۔ مددگار بیچرا شمسہ کے بازو دبا کر اس کے پیچھے کھڑا رہتا۔ ہنڈیا سے پیلا پیلا بدبودار دھواں اٹھتا تو تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے، جسم اٹھنے لگتا۔ ناقابل برداشت تو استنجا تھا۔ جو صبح دیر اور رات سوتے وقت کرنا پڑتا۔ برگ پیری، برگ حنا، عنکبوت کا جلا، بجھے چوٹے کا پانی، برہنہ تمباکو کے پتے ابال چھان پھر ٹھنڈا کر کے نیم گرم ہر فراغت کے بعد بطور استنجا استعمال کرنا پڑتا۔ اس تکلیف وہ علاج اور اٹھک بیٹھک نے جہاں اسے نحیف و نزار کر دیا تھا وہیں ذہنی طور چاک و چوبند بھی ہو گئی۔ اس کی یادداشت کے گرد رہے سے، کئے پھٹے جالے اور دھند۔ غبار بھی جیسے چھٹ گئے تھے۔ اپنی تکلیف اور ان کی وجہ کا اور اک بھی ہو گیا لیکن اس باوجود وہ اپنی پہلی سی ذہنی کیفیت کو اپنائے ہوئے تھی۔ وہ کسی حتمی نتیجے پہ نہیں پہنچ پائی تھی۔ رہ رہ کر اپنی بیمار ماں اور بہنوں کی طرف دھیان جاتا کہ خدا جانے وہ کس حال میں ہوں، زندہ بھی ہے یا اس کی جدائی اور اپنوں کی بے وفائی نے اسے موت کی نیند سلا دیا ہے۔ بابہ دھیان آتے ہی اس کا خون کھولنے لگتا۔ اسے اس حالت میں پہنچانے کا واحد ذمہ دار وہی ہے۔ دے کے سوتا، بھائی زلفی ہی تھا جس کے لئے اس کے دل میں نرم گوشہ تھا۔ جو باپ مخالفت کے باوجود اس کا خیال رکھتا تھا یا پھر اسے اپنے قریب شانی دکھائی دیتا تھا۔ نظر تو وہ آتا تھا مگر اس میں جرات، وقار اور رکھ رکھاؤ تو مردوں جیسا تھا۔ ابھی تک وہ اس کی صفحہ اور اس کے پس منظر کو صحیح طور پر نہ جان سکی تھی اور نہ ہی وہ اس دن کے بعد دکھائی دیتا تھا

☆☆☆

شانی دکھائی کیا دیتا، وہ تو اس دن پتنگ کے چکر اور شمسہ کی گردن پہ ڈور کاٹ گئے جیسے خود بھی کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس دن پتنگ کٹ گئی، ڈور ٹوٹ گئی تھی مگر زلفی اس کے میں بڑے تیز مانجھے والی ڈور تھا گیا تھا جس کے دوسرے سرے پہ کئی پھٹی مگر بڑی قیمتی شمسہ کی صورت ناموافق ہوا، تیز دھار ڈوریوں والے گڈوں کے جھرمٹ میں ڈنگا رہی وہ کس طرح اسے بچائے، نیچے اتارے؟۔ زلفی نے اسے بھائی کہا تھا، وہ کس طرح بتائے کہ جسے تو پاگلوں اور دیوانے کی طرح کھوجتا پھر رہا ہے وہ بہن تیرے اس منہ بولا

جڑوں کا کڑوا دھواں، مدھم سی روشنی۔ جن نکالنے والوں ایسا محول۔

مس عاشری کو دھوئیں سے حلق میں پھندا پڑ گیا تھا۔ شانی کی آنکھوں میں مرچیں سی ہل گئیں۔ ان دونوں کے لئے جب یہاں مزید بیٹھنا مشکل پڑا تو ایک دو جے کی جانب دیکھتے ہوئے باہر کھسک آئے، تازہ ہوا میں سانس درست کیا۔ ان کے پیچھے پیچھے عامل ظہوری شاہ بھی نکل آیا۔ علیک سلیک کے بعد شانی نے عرض کی۔

”شاہ صاحب! ہمہ یاراں دوزخ، ہمہ یاراں بہشت۔ اس نیک کام میں ہمیں بھی شامل لیتے۔۔۔ آخر یہ کیا سلسلہ ہے، کچھ ہمیں بھی بتائیں؟“

کچھ جواب دینے کے بجائے وہ عاشری اور شانی کو لے کر باوا کے مزار کی طرف آگیا۔ ازار وقت قریب تھا، ڈھول تاشے خاموش تھے۔

”شانسی جی! اتفاق ہی سمجھ لیں کہ آپ اور مس عاشری سے بات کرنے کا موقع نہ رہا۔۔۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ شہزاد کراچی میں مارا گیا ہے۔“

”ہاں، میں اخبار میں پڑھ چکا ہوں۔۔۔ کیا یہ ختم شریف اس کی مغفرت کے لئے ہے؟“

”لعنت بھیجو، یا۔۔۔ اس خبیث پہ۔۔۔ یہ ختم شریف دراصل ہم اپنے لئے پڑھ رہے ہیں، وہ حرام زادہ ہمیں ایک خوفناک مرض میں مبتلا کر گیا ہے۔۔۔“ اچانک وہ مس عاشری کی جا متوجہ ہوا۔ ”عاشری! تم تو ٹھیک ہو، نا! کوئی گڑبڑ۔۔۔ میرا مطلب ہے، کوئی تکلیف“

پریشانی۔۔۔ اس سے کوئی انجکشن تو نہیں لگوا یا تھا۔۔۔؟“

”اللہ کا کرم ہے، شاہ صاحب! میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔۔۔ آپ جانتے ہیں، میں نشہ دہ نہیں کرتی۔ انجکشن کے متعلق اس نے بتایا ضرور تھا۔۔۔ بس!“

”میدم! اس خبیث کے پاس بیٹھنے والا بھی بیمار ہو سکتا ہے۔۔۔ بہر حال، میں نے بر تذکرہ یونی پوچھ لیا تھا۔“ ظہوری شاہ اب شانی سے مخاطب ہوا۔

”یار! خدا جانے اس نے ہم سے کون سا بدلہ لینا تھا، وہ اپنا مرض ہمیں بھی تنھے بیٹھ گیا ہے۔۔۔ یہ جو آپ اندر دیکھ رہے ہیں، دراصل ہمارے علاج کا ایک حصہ ہے۔

اشارے سے اپنا بایاں ہاتھ دکھانے لگا جس سے اس نے اپنی ٹانگوں کے درمیان مٹی کا تھاما ہوا تھا۔

”یہ کیا چیز ہے۔۔۔؟“ شانی حیرانی سے پوچھنے لگا۔

”یہ بھی ہمارے علاج کے ایک حصہ ہے۔۔۔ حکیم جمالی صاحب کے مطابق: ہمیں چالیس روز برداشت کرنی ہے۔ رمضان شریف بھی ہے۔۔۔ میرا خیال ہے، آہ۔

بات سمجھ گئے ہوں گے؟“

”ہوں۔۔۔ میرا خیال ہے، میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں مگر صرف ایک بات اور سمجھا دیں۔ کیا یہ مرض خطرناک نوعیت کا ہے۔۔۔؟“

”ہاں، آپ ایسا کہہ سکتے ہیں مگر حکیم صاحب کے کہنے کے مطابق یہ کوئی ایسا خطرناک بھی نہیں کہ اس پہ قابو اور کنٹرول نہ کیا جاسکے۔ بس، ذرا پرہیز اور دل جماع کر صبر سے علاج کی ضرورت ہے اور ملنے جلنے کی پابندی کرنی پڑے گی۔ اسی لئے ہی ہم لوگ رازداری سے یہاں جمع ہیں۔۔۔ ہاں، آپ ذرا اپنے ہمسائیوں کا خیال رکھئے گا، وہاں بھی ایک مریضہ ہے۔ میرا مطلب شمسہ سے ہے، میں نے اس کے علاج کا بندوبست وہیں کر دیا ہے۔۔۔“

”یہ میرا فرض ہے، آپ مطمئن رہیں۔۔۔“ شانی نے جواب دیا۔

☆☆☆

شانسی کے اندر کھد بُد تو اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جب اس نے ان کی بیماری کا سنا تھا، اس کی چھٹی جس گھنٹیاں بج رہی تھی کہ شمسہ بھی ان کے ساتھ دلدل میں پھنس چکی ہے۔ ”وری شاہ کی تصدیق اور تشویش نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا، اسی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ میں ہلکے بھاگ واپس آیا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ شعی کرم الہی بیٹھا حساب کتاب میں بوف تھا۔ حیرے ملازم نے کھانے کا پوچھا مگر کھانے کا کسے ہوش تھا۔ وہ تنہائی اور یکسوئی، شمسہ کے معاملے پہ غور کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ ہر قیت پہ شمسہ کو بچائے گا ہے اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے، جو بھی قیمت ادا کرنا پڑے۔۔۔ کافی دیر وہ دماغی ٹانک میں مار تاراج کیا کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو کھلی چھت پہ آگیا۔

ہلکی ہلکی خنکی، تاروں بھرا آسمان، ہمیں نازک سا چاند۔۔۔ تھپ سے کوئی چیز گری۔ وہ اڑا تھا، پڑ پڑاتی ہوئی سفید کبوتری دانٹوں تلے دبی ہوئی تھی۔ بجلی سی سرعت سے شانی اس جانب لپکا، گھبراہٹ میں کبوتری بیلے کے دانٹوں تلے سے نکل گئی۔ بلا اسے گھورتا، غرغراتا انداز پہ جا چڑھا۔ پھولوں کا گلا شمسہ والی چھت پہ گرا۔۔۔ کبوتری زندہ تھی۔ گرم گرم ناخن، سفید پر۔ دامن بازو اور سینے سے خون رس رس کر اس کے سفید روئی جیسے پروں ماہر ہو رہا تھا۔ گیلے کے گرنے کی آواز سن کر نواب بی بی کھسرا باہر نکلا اور شانی کو دیکھ کر دبا سے کھسکیا۔

”ہائے، میں واری جاؤں۔ شانی بیٹی! آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں؟“

”اگلے پچھاری کبوتری، کو وہ بلا کہیں سے اٹھا لیا تھا۔۔۔“ شانی نے جواب دیا۔ وہ تیلے کی

میں پہنچ گئی تھی۔ نواب بی بی نے چائے پانی کا پوچھا تو شمسہ، شانی سے الگ ہو کر ”میں برگر کھاؤں گی“ میں برگر کھاؤں گی“ شمسہ بچوں کی طرح ضد سی کرنے لگی۔

نواب بی بی بتانے لگا۔ ”کئی دنوں سے برگر کھانے کو کہہ رہی ہے، میری بیٹیا! میں گلوڑی نیا کروں، شاہ جی نے پرہیزی کھانے کی تاکید کی ہوئی ہے۔۔۔ شانی چند! ویسے کئی روز سے میرا جی بھی برگر کھانے کو چاہ رہا ہے۔۔۔“

”میں برگر ضرور کھاؤں گی۔۔۔ اوں، اوں۔۔۔“ شمسہ نے پھر ضد کی۔

شانی نے اسے پیار سے پکارتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، بیٹا! ناراض مت ہو۔ ہم تمہیں اور نواب بی بی کو ابھی برگر لا دیتے ہیں۔۔۔“

”شانی بیٹا! شاہ صاحب ناراض ہوں گے، مجھے ڈانٹیں گے۔“ نواب بی بی نے خدشہ ظاہر کیا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ میں ان ہی کے پاس آج گیا ہوا تھا، انہوں نے مجھے اسے خوش رکھنے کی تاکید کی ہے۔۔۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اچھا، تم یہاں بیٹھ کر ٹیلی ویژن دیکھو۔ میں ہمارے لئے برگر اور جوس لاتا ہوں۔۔۔“

”میں بھی ساتھ چلوں گی۔۔۔“ وہ سیلپر پہنتے ہوئے پھر ضد کرنے لگی۔

”اس وقت؟۔۔۔ دیکھو، دیر ہو گئی ہے۔۔۔ میری پیاری بہن! ضد نہیں کرتے۔“

وہ باقاعدہ رونے لگی، کشن اٹھا کر ٹیلی ویژن پہ دے مارا تبھی نواب بی بی بولا۔

”ہائے ہائے، کیا کر رہی ہو چند! ٹیلی ویژن توڑو گی۔۔۔؟“ وہ شانی سے مخاطب ہوا۔

شانی چند! اسے بھی ساتھ لے ہی جاؤ، خواہ مخواہ یہاں روتی رہے گی۔ خود بھی ہلکان ہو گی اور نیے بھی پریشان کرے گی۔“

شانی نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، چلو۔۔۔ مگر پہلے اپنا حلیہ درست کرو، منہ ہاتھ نوکر بالوں میں کنگھی کرو۔۔۔“

\*\*\*

مون مارکیٹ، شیریں محل کے سامنے شانی نے ٹیکسی رکوائی۔ یہاں رات گئے تک اچھی سی میز رہتی ہے۔ ٹیکسیاں، کاریں، موٹر سائیکل، آس پاس کے متوسط طبقے کے لوگ جو ٹی فم برگ، مل روڈ یا دیگر اعلیٰ درجے کے کھانے پینے کے مراکز میں جانا، کھانا پینا فورڈ نہیں لے سکتے وہ یہیں اپنا رانچا راضی کر لیتے ہیں۔ تکیے، کڑا ہی گوشت، فرائی مچھلی، بندو خان کے بلب پرائٹس، چکن کارن سوپ، کانڈی سموے، آکس کریم، چائے کافی، فروٹ جات،

طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا جو ابھی تک منڈیر پہ بیٹھا تھا۔ نواب بی بی جوتی اتار، بیلے کی طرف لپکا مگر وہ بھاگ چکا تھا۔

”حرا خور، اوتر جانا۔۔۔“ وہ بیلے کو گالیاں بکتا ہوا واپس پلٹا۔ ”ذرا دکھانا کبوتری کو، وہ کبوتری کو لت پت دیکھنے لگا پھر بولا۔ ”جان بچ گئی بیچاری کی۔۔۔ آؤ، ذرا اسے ہلدی پھینک لگاتے ہیں۔۔۔“

شانی اندر داخل ہوا۔ دو نوخیز سے زنانے ٹیلی ویژن پر کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے، اثر اسے نظر نہ آئی۔ کبوتری کے بال اوپر ڈیوٹل سے صاف کرنے کے بعد نواب بی بی سے اثر کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہے۔ اس سے پتا چلا کہ وہ کچھ سوچتا، شمسہ اس کی آواز سن کر خود ہی باہر آگئی اور معصومیت سے تالی بجاتے ہوئے بولی۔

”آہ، میرا گڈا آگیا۔۔۔“

پیلا پھٹک رنگ، دھنسی ہوئی آنکھوں کے نیچے سیاہ ہالے، پیڑی جیسے ہونٹ، بے ترتیب بال، کمزور مرمحاتی ہوئی شمسہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر وہ اندر سے دہل سا گیا، کتنی لمبے ٹنگٹکی باندھے کھڑا دیکھتا رہا۔

”کیسی ہو۔۔۔ میری۔۔۔ بہن؟“ بغیر کچھ سوچے سمجھے، خود بخود اس کے منہ سے نکل گیا۔ شمسہ کی سمجھی سمجھی آنکھوں میں کیرہ فلیش کی مانند روشنی کا کوند اچکا اور بجھا۔ پلکیر جھپکے بغیر کئی ساعتیں کھڑی اسے دیکھتی رہی، اس دوران میں وہ شاید اپنی کیفیت پہ قابو پا گیا تھی۔

”اچھی ہوں۔۔۔ اچھی ہوں۔۔۔ اچھی ہوں۔۔۔“ وہ یہ کہتی ہوئی اس سے پلٹ کر اور وہ بے اختیار اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر وہ نواب بی بی سے مخاطب ہوا۔ ”اسے ہوا، یہ بڑی کمزور ہو گئی ہے؟“

نواب بی بی آنکھیں منکاتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ”اللہ نہ کرے، شاہ جی! بڑی تکلیف ہے بے چاری کو۔۔۔ یہ اسی معصوم بوٹی کا حوصلہ ہے جو سب کچھ برداشت رہی ہے۔ کوئی اور ہو تو اللہ معافی تھاں مر جاوے۔۔۔“

”اللہ رحم کرے۔۔۔“ وہ شمسہ کو پکارتے ہوئے بولا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا، اللہ۔۔۔“

سینے لگی شمسہ دنیا و مافیہا کے آزاروں سے بے نیاز، کیف میں ڈوبی ہوئی کسی اور دنیا

ہن سمجھ کر مدد کرنا چاہتا ہوں، ساتھی بن کر ساتھ بھانا چاہتا ہوں۔ اگر زیادہ مین مخ نکالو گی تو بات بنے گی نہیں، بگڑے گی۔۔۔ جن لوگوں میں تم پھنسی ہوئی ہو ان کے ہاتھ بہت لمبے اور مضبوط ہیں اور تم بہت کمزور۔۔۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کسی بھی وجہ سے تمہاری یادداشت لوٹ آئی ہے اور اس تبدیلی سے وہ شیطان بے خبر ہیں، صرف میں جانتا۔

وہ بات درمیان سے قطع کرتے ہوئے بولی۔ ”تم نے کیسے جانا کہ میری یادداشت لوٹ آئی ہے؟“

”تمہیں یاد ہو گا، اس دن چھت پہ تم نے مجھے بھائی کہا تھا جبکہ تم ہمیشہ مجھے اپنا گڈا کہتے تھے۔ اس دن تمہاری حرکات، آنکھیں، اور بھی بہت سی تبدیلیاں تھیں۔ تم اس وقت ایک بارل انسان کی مانند بات چیت کر رہی تھیں۔۔۔ نگہت! میں عمر میں تم سے کچھ چھوٹا ہی ہوں لیکن اتنا سمجھ بھی نہیں کہ یہ نمایاں تبدیلیاں محسوس نہ کر سکوں۔ پلیز! میں اسی دن سے اسی اوپر بن میں ہوں کہ کسی طرح تمہیں ان بھیڑیوں کے چنگل سے آزادی دلاؤں مگر یہ سب اسی وقت ممکن اور قابل عمل ہو سکتا ہے جب تم بھی یہی کچھ چاہو اور میری مدد کرو۔۔۔“

”بھائی! تمہارے جذبات قابل قدر ہیں مگر افسوس کہ میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ میری داستان بربادی بڑی طویل اور المناک ہے جسے سنا کر میں تمہارا مٹوڈ اور وقت برباد کرنا نہیں چاہتی۔ میرے اپنوں اور حالات نے مجھے جس راہ پہ چلنے پہ مجبور کر دیا ہے، میں چاہوں بھی تو واپس لوٹ نہیں سکتی۔ میں پہلے بھی کسی اپنے کے لئے قابل حفاظت و عزت نہ تھی اور اب جب میرے پلے نہ آ رہے، نہ عصمت و عفت کی پاکیزگی اور نہ صحت تو کون میرا لہنا ہے جو اپنے دل اور گھر کا دروازہ میرے لئے کھولے گا۔۔۔ نہ، بابا۔۔۔!“ اچانک لاٹل ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے وہ گھٹنوں پہ جھک کر پھس پھس رونے لگی۔

”لو۔۔۔ کوک پیو۔۔۔“ شانی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

وہ وہیں جھکی جھکی بولی۔ ”نہیں، مجھے کوک نہیں چاہئے۔۔۔ مجھے میری دوا چاہئے۔ میرا بدن بری طرح ٹوٹ رہا ہے، میرا دل ڈوب رہا ہے۔ مجھے فوراً“ فلیٹ پہ لے چلو۔۔۔“

”نگہت۔۔۔!“

وہ چیخی۔ ”میں نگہت نہیں، شمشہ ہوں۔ سنا تم نے۔۔۔“ پھر شانی کے چہرے پہ استہزائیہ ٹھٹھکی ڈالتے ہوئے بولی۔ ”نہ۔۔۔ اور تم شایان نہیں، شانی زنانے ہو۔۔۔“

برگر کا پیکٹ لے کر شانی نے ڈرائیور کو بلایا۔ ریورس لے کر ٹیکسی مسجد کے پاس سے گزری تو اسے قاسم اور زلفی دکھائی دیئے جو چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے نئے کباب کھا رہے

مٹھائیاں، ہار گجرے، پھل پھلاری، ہر چیز کی دوکانیں بھی رہتی ہیں۔ اُچکے، تیل ماشے، فیر، فقیریاں، پھانسنے والے، پھنسنے والے، ہر قبیل خرابات یہاں رات گئے تک موجود ہوتی ہے۔ گاڑی میں بیٹھے بٹھائے ہر چیز حاضر کردی جاتی ہے۔

اس سے اور اس چلنے میں تو وہ دیسے بھی باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ہجڑوں کھسروں، اُکلی، کیلی لڑکیوں کی تو ویسے ہی شامت آئی رہتی ہے۔ ٹیکسی والے کو شانی نے چکن سوپ، برگرا آرڈر دیتے ہوئے کہا کہ ”تم بھی باہر کھاؤ پیو، ہم کچھ دیر یہاں رکھیں گے۔“ ٹیکسی والا دونوں کو آزاد خیال لڑکیاں سمجھ رہا تھا لہذا ”جی، میڈم“ کہہ کر وہ سامنے برگرا والے کے پاس چلا گیا تو شانی بڑی سنجیدگی سے شمشہ کی جانب متوجہ ہوا۔

”نگہت۔۔۔!“ شمشہ کی آنکھیں پھیل کر دھنکی ہو گئیں، منہ کا دہانہ کھل گیا۔ وہ وحشت بھرے انداز سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”حیران تم ہو سکتی ہو مگر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔“ وہ اس کا رخ بستہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپانے لگا۔ ”یاد ہے، اس دن چھت پہ تم نے غیر ارادی طور پر مجھے بھائی کہا تھا۔ یاد ہے نا؟۔۔۔ اور آج کچھ دیر پہلے ہی میں نے ارادی طور پر تمہیں بہن کہہ تھا۔ ایک بار نہیں بلکہ دو بار، ہے نا!۔۔۔ جس طرح تمہارا ایک بوتل خون میری نس نس ٹر سرگرداں ہے اسی طرح تمہارا دکھ بھی میرے دل کے اندر پھوڑا بن کر تاسور کی طرح پھیل گیا ہے۔ میری بہن! میں تمہارے حال سے بے خبر نہیں، مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ یہ مرقہ تفصیل سے باتیں کرنے کا نہیں، اس وقت صرف میرے چند سوالوں کا جواب دو۔۔۔ کہ تمہاری یادداشت مکمل طور پر واپس آ چکی ہے، کیا تم غیر دانت کوئی نشہ آور دوا استعمال کرتی؟ یا تمہیں زبردستی یا بے خبری میں استعمال کرائی جاتی ہے اور تیسرا سوال، کیا تم اس جہنم سے نکل کر واپس اپنے گھر جانا چاہتی ہو۔۔۔؟“

برگر والے کا ”چھوٹا“ ٹرے اٹھائے باہر کھڑا تھا۔ شانی نے ہاتھ بڑھا کر کوک کی دو بوتلیں اٹھالیں، برگر بیک کر کے لانے کے لئے کہا تو وہ ”جی، جی“ کہہ کر چلا گیا۔

”ہاں، تو میں نے پوچھا تھا کہ۔۔۔“

”شانی بھائی! تم تو بہت کچھ کہہ چکے مگر میں تمہیں بہت کچھ نہیں بتا سکتی۔ اسے میرا معذوری سمجھ لویا مجبوری۔۔۔ اور اگر تم میری طرح مجبور نہیں ہو تو اتنا بتا دو کہ تمہیں یہ صحیح نام کیسے معلوم ہوا، تم مجھے کس حوالے سے جانتے ہو؟“

”ایزی، ایزی۔۔۔“ الجھ کر بات مت کرو، پہلے ہی بہت سے گورکھ دھندے ہیں۔ تمہیں

”بیٹا! وہ ہاتھ روم گئے ہیں۔ ذرا انتظار کر لیں، ابھی آتے ہی ہوں گے۔“  
 ”اچھا! آپ ایک پیکٹ ڈن مل اور سرخ رنگ کا لائیسٹر دے دیں۔ پانوں کے لئے ہم ان کا انتظار کر لیتے ہیں۔“

”ہاں، ہاں۔“ انہوں نے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے ڈن مل کا پیکٹ اور سرخ لائیسٹر نکال کر اسے دے دیا۔

”باباجی! مجھے نیا پیکٹ اور لائیسٹر چاہئے۔“ ڈرائیور نے کہا۔  
 وہ لکھنے سے ہاتھ روک کر پھر عینک کے اوپر سے گھورتے ہوئے کہنے لگے۔ ”بھائی! پیکٹ اور لائیسٹر پہلے دیکھ تو لو، پیکٹ سیل بند اور لائیسٹر استعمال تک نہیں ہوا۔“  
 ڈرائیور نے اک نظر گاڑی کی جانب دیکھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے پچاس کانٹ ان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لیجئے، پیسے لے لیجئے۔“

”نہیں، بیٹا! میں دوکاندار نہیں، امانت دار ہوں۔“ پھر بڑی شفقت سے مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ ”مجھے خوشی ہوئی کہ کوئی میری طرح ڈن مل اور سرخ لائیسٹر پسند کرنا والا آیا۔“ وہ جو لکھ رہے تھے، وہیں سے ایک ورق اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری جانب سے انہیں دے دو۔“

”لکھا تھا۔“ ”خون رگوں ہی میں سُرخ رو سرفراز رہتا ہے، رگوں کی گرفت و گردش سے باہر گر پڑے تو سرد ہو کر کوئلے کی مانند سیاہ پڑ جاتا ہے۔ سرخاب کی آنکھ، کلنی، پر، گلوٹی، سرخ ٹٹو، ہیز، موٹی۔“ ”مرغابی، اڑے بھی پڑ بھیگے۔ گرے بھی تو آنکھ نم۔“

وہ کانٹ پکڑے، منہ اٹھائے چلا آیا۔ باباجی نے یہ بات جس رنگ انگ ہی لکھی تھی، شانی نے اس سے کیا مطلب نکالا؟۔۔۔ چند لمحوں بعد ڈرائیور واپس آیا اور کہنے لگا۔

”باباجی! بابی آپ کا نام اور پتہ پوچھ رہی ہیں، آپ انہیں کچھ وقت دے سکتے ہیں۔۔۔ وہ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہیں۔“

باباجی اپنے دھیانے لکھنے میں مصروف تھے۔ گاڑی سائیڈ پر کھڑی تھی، نہ وہ گاڑی کو دیکھ سکتے اور نہ گاڑی والے انہیں۔۔۔ بابی کا لفظ سننے ہی وہ ہلکا سا مسکرائے۔

”بیٹا! میں یہاں کبھی کبھی آتا ہوں۔ یہ جگہ باجیوں سے بات چیت کرنے کی نہیں ہے۔“  
 ”لو! ان کے لئے بہتر کرے،“ انہیں میرا سلام کہئے گا۔۔۔“

☆☆☆

تھے۔ شمس کے اچانک بدلتے ہوئے رویے اور ہنگ آمیز سلوک سے وہ جل بھن کر کباب ہو رہا تھا، کیا جواب دیتا؟ ”مصلحتاً“ خاموش رہا۔ شمی پان والے کے پاس گاڑیوں کا جھنگھٹا دیکھ کر ٹیکسی والے کو سمن آباد موڑ چلنے کے لئے کہا۔ وہ دراصل شمس کی اس موجودہ کیفیت کی ابتدا دیکھنا چاہتا تھا، سمجھ گیا تھا کہ یہ نشے کی ٹوٹ ہے جو عادی کو وقت پہ خوراک دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اسے گھر نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ گاڑی سڑک پہ سیدھی ہوئی تو وہ اٹھنے لگی، واپسی جا ہی تو پہلے سے ہی بک رہی تھی۔ شانی آہستہ آہستہ اس کی گردن اور شانوں کے پٹھے سہلانے لگا مگر وہ زور سے اس کے ہاتھ جھٹک کر گالیاں بکتے لگی۔ شانی نے رخ پھیر کر ایک زنانے کا تھپڑ اس کے دائیں گال پہ جڑ دیا۔

”خاموش رہو، اب اگر کوئی حرکت یا کبوتر کی تو برا حشر کروں گا۔“  
 خلاف توقع وہ اسے سرخ سرخ آنکھوں سے گھورتی ہوئی، مُنڈی ڈال کر خاموش ہو گئی۔

یتیم خانہ پہنچ کر ایک پان شاپ کے پاس ذرا ہٹ کر اس نے ٹیکسی رکوائی۔ ادھر سے گزرتے ہوئے کبھی کبھی وہ یہاں سے پان سگریٹ لے لیا کرتا تھا۔ دوکاندار نظر نہ آیا تو وہ انتظار کرنے لگا۔ موڈ آف تھا، دونوں طرف خاموشی۔۔۔ ڈرائیور بھی سہا سہا سائیشی میں ان کو اچھتی سی نظر سے دیکھ لیتا، انجن چل رہا تھا اور وہ ان کے اگلے حکم کا منتظر۔۔۔ اور یہ دونوں بظاہر ایک دوسرے سے بیزار، بے تعلق منہ پھیرے آتی جاتی ٹریفک کو دیکھ رہے تھے۔

ہوئے ڈرائیور نے پل کی۔  
 ”میرے لئے کیا حکم ہے جی۔۔۔؟“  
 دوکاندار وہاں نہیں تھا۔ ایک سفید دھڑکی والے بزرگ اندر ایک سٹول پہ بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

”دیکھو، ڈرائیور! پان والا تو نظر نہیں آیا، یہیں کہیں گیا ہو گا۔ تم ان بزرگوں سے ڈن مل کا پیکٹ اور ایک سرخ لائیسٹر لے آؤ اور پان والے کا پوچھ لینا کہ وہ کہاں ہے؟ یہ ا پیسے۔۔۔“

شانی نے اسے پچاس کانٹ دیا۔ وہ دوکان پہ آیا تو اس بزرگ نے سلام میں پہل کر دی۔  
 ”جی، فرمائیے۔۔۔؟“ وہ عینک کے فریم سے اوپر میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے

بولے۔

”جی، پان چاہئے تھے۔۔۔ دوکاندار کدھر ہے؟“

بلکہ اسی وقت سے جب—جب میرے والد نے میری مظلوم دکھیاں کو اس لئے اپنی زندگی سے نکل دیا کہ وہ اس کے لئے ایک بیٹا پیدا نہیں کر سکی۔ بڑی بیٹی ہونے کے ناطے جب میں نے اپنی بے ساراں کا بیٹا اور معصوم بہنوں کا سہارا بننا چاہا تو مجھے قدم قدم پہ احساس دلایا گیا کہ اس معاشرے میں کسی عورت کا باعزت، باوقار رہ کر روزی کمانا بہت مشکل ہے۔ ہاتھ کی محنت سے تو ڈھنگ کا جو تا تک نہیں خریدا جاسکتا۔ البتہ جسم کی مشقت سے کار کو ٹھکی کی مالک بن سکتی ہے۔ کسی نے بہن کہہ کر مجھے برکایا، کسی نے منہ بولی بیٹی بنا کر، مجھے بیوی بنانا چاہا۔ بڑے بڑے حاجی نمازی نباطن پاجی نکلے۔ بیمار ماں، چھوٹی بہنوں کی پڑھائی، کرائے کا مکان، بیگانہ شہر، اجنبی لوگ—مجبوریوں اور ضرورتوں کا جب کوئی باعزت حل نہ نکلا تو میرے لئے خودکشی ہی واحد حل رہ گیا۔ پھر لکھت مرنے کی ہمت نہ پا کر قسطوں میں مرنے کی راہ بچھائی دی، یعنی اپنے احساس اور سچو کے لگاتی ہوئی سوچوں کو منشیات کے دھند لکوں میں دھکیل دیا۔ مرتے اور بے انسان کے سامنے اخلاقی، انسانی، قانونی شرعی قدریں اور تقاضے قطعی کوئی اہمیت نہیں رکھتے، وہ تو صرف جینا چاہتا ہے۔ سو شانی! میں بھی صرف جی رہی ہوں۔ کیسے، کیوں اور کس لئے؟ یہ میں سوچنا نہیں چاہتی۔۔۔

وہ ایک دم کیپول کو اچکنے کے لئے جھپٹی اور اس سے پشتر کہ شانی اسے پکڑتا، وہ کیپول نگل چکی تھی۔ مگر ایک کیپول شانی کے ہاتھ آگیا۔۔۔ پر سکون ہو کر وہ مسکرائی۔ ”تم مرد سے زنانے بن گئے، میں ساری کہانی سے واقف ہوں۔۔۔ سچ کہو، کیا تم نے ایسا بننا چاہا؟ یقیناً“ نہیں۔ میں تمہاری انتہائی عزت اور قدر کرتی ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لئے کہ تم یہ حقیقت جان چکے ہو۔ کہ تم صرف اور صرف ایک زنانے کی حیثیت سے ہی زندہ رہ سکتے ہو۔ ایک بہت بڑی حقیقت کو تم نے ذلیل اور خوار ہوئے بغیر وقت سے پہلے تسلیم کیا اور لکڑی پر عمل کر لیا۔ یہ حالات اور مقدر کے مقابل تمہاری بہت بڑی جیت ہے۔ منافق سے کافر بہتر ہوتا ہے، انکار تو کرتا ہے، مگر ہاں، ہاں کاغذ اب نہیں جھیلتا۔۔۔

ہاتھ کے اشارے سے شانی اسے روکتے ہوئے سمجھانے لگا۔ ”ٹھیک ہے، تم نے سچ کہا۔ میرے سامنے بھی دو ہی راستے تھے۔ زندگی یا موت۔۔۔ زندہ میں اسی حیثیت سے رہ سکتا تھا۔ مگر تمہارے آگے متبادل راستے بھی ہیں۔ جو تمہاری کم ہمتی، کمی فہمی اور عورت ہونے کی وجہ سے تمہاری نظروں سے اوجھل ہیں۔۔۔ ذرا سوچو، تمہارے اس طرز عمل اور تمام سوچ کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ ظاہر ہے، تم آج نہیں تو کل اپنے برے انجام کو پہنچ جاؤ گی۔ میں تمہارے باپ اور زلفی کسی کو کچھ خبر نہ ہو گی اور پھر جبکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم بہت سی

فلیٹ پہ پہنچتے پہنچتے بارہ بج چکے تھے، انہیں دیکھتے ہی نواب بی بی نے صدقہ واری ہوئے ہوئے کہا۔

”اتنی دیر لگا دی؟—اری، بھوک کے مارے پیٹ میں آنتیں ڈانس کر رہی ہیں۔۔۔ لاؤ، دو ہمارے برگر۔“

شانیان نے اسے برگر تھماتے ہوئے کہا۔ ”پان تو ملے نہیں۔۔۔ ذرا کڑک سی چائے بنا کر بھیجو، ہم یہاں کچھ باتیں کریں گے۔“

چائے کے ساتھ نواب بی بی چند کیپول اور ایک چوتھائی گلاس کسی محلول کا لایا، شمر کو دوا پینے کا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ تین کیپول نسواری رنگ کے شانی کے سامنے بڑے ہوئے تھے۔

”اچھا تو یہ تمہاری دوا ہے۔۔۔ اور گلاس میں کیا ہے؟“ شانی نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ میری دوا ہے، اس کے بغیر مجھے سکون نہیں ملتا۔۔۔ پلیز! مجھے میری دوا دے۔۔۔“ میری حالت دیکھو۔ میرا جسم ٹوٹ رہا ہے، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے۔۔۔“ شمر نے التجائی۔

”ہاں، شمر! اندھیرا تو ہے اور اندھیرے میں انسان کچھ واضح دیکھ نہیں سکتا۔ میں انہی اندھیروں کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور تم۔۔۔“

وہ جھنجھلا اٹھی۔ ”دیکھو، شانی! بات لمبی مت کرو۔ کچھ لوگ پیدائشی اندھے بھی ہوتے ہیں، ان کے لئے اندھیرے اجالے چنداں اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کے لئے سب ایک سا ہو ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نہیں جانتی؟۔۔۔ میں خوب جانتی ہوں کہ میں کیا پی رہی ہوں، کھا رہی ہوں لیکن میں کیا کروں؟ اب یہی زہر میرے لئے تریاق ہے، نشہ اور ایک گونہ۔۔۔“ شمر نے اپنی سوچ اور احساس کو ختم کر دیا ہوا ہے، آج سے نیند

برائیوں کے ساتھ ساتھ ایک خطرناک بیماری کے چنگل میں بھی پھنسی ہوئی ہو۔ کیا تم ایک نامراد کی حیثیت سے مرنا چاہتی ہو؟ نہ، تم ایسا نہیں کرو گی۔ میں تمہیں ایسے نہیں مرے دوں گا۔ تم زندہ رہو گی، جیو گی با مراد زندگی۔“

دوا کے اثر سے شمسہ کی پتلیاں سکڑنے لگی تھیں، سرور اور غنودگی کے لہریے اس کے چہرے پہ لہرانے لگے تھے اور رات دوسرے پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ چائے سامنے دھری ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ کیسپول اور گلاس اٹھا کر وہ اپنے فلیٹ میں چلا آیا۔

اگلے روز وہ صبح صبح ایک واقف کار کو ساتھ لے کر ایک پرائیویٹ منشیات کے عادی مریضوں کے شفاخانے میں پہنچا۔ کیسپول اور مخلول کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ انتہائی مسکن مگر خطرناک ادویات ہیں، دماغ آہستہ آہستہ مفلوج اور نفسانی خواہشات میں شدت پید ہو جاتی ہے۔ علاج ممکن ہے۔ دوا کی خوراک میں آہستہ آہستہ کمی، خوراک، پرہیز و ورزش اور صحت مند ماحول سے مریض افات محسوس کرتا ہے۔ ساتھ ہی اس نے ایک اور ڈاکٹر سے شمسہ کی زنانہ بیماری کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ معلوم ہوا کہ اس ابتدائی اسٹیج پر مرض قابو پانا ممکن ہے۔

عصر سے ذرا پہلے وہ زلفی کو ملنے چلا گیا، جو گیارہ بج کے ملتان کی مچھلی کاٹنا کام والے سوزہ چٹنوں والے قوس و قزحی دوپٹے، ہلکے سے میک اپ میں وہ ایک نوخیز الزامادرن دو شیراز کے روپ میں جب ٹیکسی سے اترا تو زلفی کے ملازم اور چند خریدار جو ایک تین سالہ پرانی پیجار دیکھ رہے تھے، اس نئے ماڈل کو دیکھ کر دیکھتے ہی رہ گئے۔ خوبصورت سنہری بالوں کو اک انداز دلیری سے جھٹکا دے کر وہ ان نندیدوں کو نظر انداز کرتا ہوا زلفی کے آفس کی جانب بڑھا، زلفی اس آتی ہوئی قیامت کو پہچان چکا تھا۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی، اٹھ کر دروازہ کھولا اور ہاتھ بڑھا کر سینے سے چمٹا لیا۔ ایک دو خریدار دفتر میں بھی بیٹھے تھے، دیکھنے والی نظریں دیکھ ہی رہ گئیں۔ کوئی بھی اس بت طناز کو پہچان نہیں پایا تھا، دیکھنے والے اسے لڑکی ہی سمجھ رہے تھے۔ گاہکوں کی موجودگی میں اس بے ساختگی سے بغل گیری؟ زلفی کو بھی بعد میں اس احساس ہوا مگر اب کیا کر سکتا تھا۔ زلفی کے ملازموں نے ایسا منظر اور یہ لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ گاہک چلے گئے تو اس نے دفتر کے پردے کھینچ دیئے اور ایک دفعہ پھر اس سے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ شایان نے شرارت بھرے انداز میں اس سے پوچھا۔

”خیریت ہے نا، پردے بھی کھینچ دیئے ہیں۔“

”خیریت ہوتی تو ایسی حرکت نہ کرتا، آج تو جی چاہتا ہے کہ تمہیں سمیٹ کر اپنے سینے

بند کر لوں۔“ سچ پوچھو تو میں تم سے بڑا سخت ناراض ہوں۔“

اس کے سینے سے چٹنے چٹنے ہی شانی نے اس کے کان میں اشرفی سی کھنکتی آواز میں سرگوشی کی۔ ”ناراض بھی ہو اور سینے سے بھی لگا رکھا ہے۔“

وہ اسے مزید بھینچتے ہوئے بولا۔ ”ہاں، سینے سے تو میں نے اپنے بھائی کو لگایا ہوا ہے۔ نہیں نہیں۔۔۔ تم ایسی خوبصورت چیز کو کوئی اس طرح سرعام سینے سے لگاتا ہے۔“

شانہ مصنوعی غصے سے اسے علیحدہ کرتے ہوئے شکایتا ”کہنے لگا۔“ بھائی کے بغیر تکتے کباب تو خوب کھائے جاتے ہیں، کبھی جھوٹوں منہ پوچھا تک نہیں کہ بھائی کو بھی کبھی آؤنگ کرا دیں۔“

کبھی نظر آؤ تو پوچھوں بھی، جب بھی جاؤ تو غائب۔ ٹیلی فون مصروف۔۔۔ ویسے تم نے مجھے تکتے کھاتے ہوئے کہاں دیکھا؟“

”ڈی۔۔۔ کل رات مون مارکیٹ۔۔۔“ شانی نے سرگوشی کی۔

”تم نے مجھے دیکھا۔۔۔ تو ملے کیوں نہیں؟“

”مجبوری۔۔۔ اور پھر تم دوستوں کے ساتھ تھے۔“

”تو پھر کیا ہوا؟۔۔۔ آج بھی تو یہاں بہت سے لوگ ہیں، آج کی طرح کل بھی مل لیتے۔“

”آج میں اکیلی ہوں۔۔۔“

”ہاں، آج تم اکیلے ہو تو کل تمہارے ساتھ کون تھا۔۔۔؟“

”ابھی نہیں بتا سکتی۔۔۔ اچھا یہ بتاؤ، آج تم مصروف تو نہیں۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔ بولو، کیا بات ہے۔ کہیں چلنا ہے۔۔۔؟“

☆☆☆

شانہ، زلفی کے ساتھ اس کی گاڑی میں اپنے ماموں کے گھر پہنچا۔ ماموں شاید گودام میں نئے، قاسم کی موٹر سائیکل باہر کھڑی تھی۔ کھنٹی بجانے پر ممانی نے دروازہ کھولا۔ حسب سابق ”شایان کو پہچان نہ سکیں، زلفی سے پوچھنے لگیں کہ یہ بیٹی کون ہے؟“

”آپ خود ہی پہچان لیں۔۔۔“ زلفی نے کہا۔

”وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے پہچان کر چیخے ہوئے بولیں۔ ہائے وے شایان“

شایان۔ زلفی کے۔ تے ہوئے سلام کیا۔

”وے“ اتنی تیز خوشبو؟ بیڑا پار تیرا۔۔۔ چل اندر، پڑا“

قاسم بھی میں کی چیخ سن کر آگیا تھا، نین تارا، صحن کی دوسری طرف کھڑی اکھیوں کے جھروکوں سے دیکھ رہی تھی۔۔۔ رمضان کا مہینہ تھا مگر شایان کے علاوہ زلفی بھی روزے سے نہیں تھا۔ زبردستی ان کی تواضع کی گئی۔ کافی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شانی بار بار ہل پہل بدل رہا تھا۔ بظاہر باتیں ہو رہی تھیں، دھیان کسی اور جانب تھا۔ زلفی کے پسندیدہ موضوع یعنی گاڑیوں پہ سلسلہ گفتگو چل نکلا۔ قاسم اور زلفی کو مصروف چھوڑ کر وہ بہانے سے ممانی کے پاس آ بیٹھا، ممانی نماز کی تیاری کر رہی تھیں۔۔۔ نین کی خیر خیریت پوچھی، نین کو نیناں تلاش کر رہے تھے۔

”نین نظر نہیں آئی۔۔۔ کہاں ہے؟“

”جہاں ہوتی ہے“ اپنے کمرے میں۔۔۔ کتابیں، کتابیں اور کتابیں اور، وہ۔۔۔؟“ وہ اجازت لے کر اس کے کمرے میں چلا آیا تو وہ خلاف توقع بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔

”کیسی ہو، نین!۔۔۔ سب باہر اور تم اندر کیا چکر ہے؟“

”مُرے اپنی قبروں میں پڑے اچھے لگتے ہیں۔۔۔“ نین نے جواب دیا۔ شانی شرارت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ ”اتفاق کہہ لو کہ میں نے کسی مُرے کو بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے آج پہلی بار دیکھا ہے اور اسی موقع مناسبت سے ایک شعر یاد آگیا۔

زلفیں سنوارنے سے بنے گی نہ کوئی بات

جائیے کسی غریب کی قسمت سنواریے،

وہ غصے سے کنگھی میز پر پٹختی ہوئی دباڑی۔

”شایان۔۔۔!“

شانی اس کے غصے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے تھجج کرنے لگا۔ ”میرا نام شایان نہیں مس شانی ہے۔۔۔“ پھر الفاظ چباتے ہوئے منہ بگاڑ کر بولا۔ ”تم شاید میرے شعر کی داد نہ دے رہی تھیں، میں نے درمیان میں ہی تمہاری بات قطع کر دی۔ آئی ایم ساری۔۔۔“ وہ اس قریب آکر اس کے اچھے ہوئے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے مشورہ دینے لگا۔ ”چھی، چھی، چھی۔ کیا جھاڑ جھاڑو بال بنا رکھے ہیں۔ انہیں کھٹی لسی سے نہیں، واش اینڈ شیمو سے دھویا کرو۔ میرے بالوں جیسے ملائم اور چمک دار ہو جائیں گے۔۔۔“ پھر اس کی نازک سی ٹھوڑی کو اوپر اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”ذرا میری طرف دیکھو۔۔۔ میرے مدھ بھرے نین

میری چمک دیکھو۔ ہونٹ، آئی شیڈ، آئی لیش، یہ سب میکس فیکچر کے برانڈ نیشنڈ ہیں۔ یہ میری گردن، جسم سے لہراتی ہوئی بھیجی بھیجی مہک محسوس کرو۔“ وہ لمبی سی سانس بھر کر آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔ ”پوائزنڈ ناٹی ناٹن، وٹ اے چارمینگ فینسی ڈریبی خوشبو۔“ ماڈل گرل کی مانند پوز بناتے ہوئے اس نے کہا۔ ”لک مائی ڈریس، کلر کنٹراسٹ، ڈیزائن اینڈ ویئر۔۔۔ میری جان! چارمینگ لک بنو، گلیمر پیدا کرو۔۔۔ ہاں، آج میں اپنے یار، زلفی کو ساتھ لائی ہوں۔ وٹ اے ونڈر بوائے! ایک دم سارٹ، ہینڈسم، فل آف لائف اینڈ لف۔“

وہ پٹنگ گی پٹی پہ بیٹھ کر رونے لگی تو اس کے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر شانی نہایت متانت سے سمجھانے لگا۔

”نین! اپنے خول اور خوابوں کے حصارے باہر آ جاؤ۔ زندگی جیسی نعمت یوں ضائع اور برباد کرنے کے لئے نہیں۔ اس کی قدر کرو، جو کھو گیا اسے بھول جاؤ اور جو مل سکتا ہے اس کو حاصل کر کے اللہ کا شکر ادا کرو۔۔۔ میری بہن! اگر مجھے خوش اور زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو زلفوں کو نہیں، زلفی کی قسمت کو سنو اردو۔۔۔“

پٹنگ سے کنگھی اٹھا کر اس کے دو ٹکڑے کر کے نین کے ہاتھ میں تھا کر وہ باہر نکل آیا۔ وہاں سے نکلتے نکلتے اظہار کا وقت سر پہ آگیا لیکن ممانی کے اصرار کے باوجود وہ وہاں نہیں رکا۔

☆☆☆

واپسی پہ وہ اور زلفی نہر کی طرف نکل گئے۔ موسم خوشگوار اور فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ یونیورسٹی کمپس کی جانب کنارے کنارے خوبصورت سبزہ زاروں میں سفیدے کے درخت، بوسلی کے جھاڑ، پھولوں کی کیاریاں، طالب علم لڑکے لڑکیاں اکیلے دو اکیلے، گردپس مختلف مشاغل میں مصروف۔ اندرون لاہور کی گہما گہمی، بھیڑ بھاڑ، گھٹن اور شور شرابے سے نکل کر انسان میں کتنی طمانیت اور فرحت محسوس کرتا ہے۔ ذہنی بوجھ اور دین و دنیا کی ذمہ داریوں کا دباؤ انسان میں کھلی تھری ہوئی معطر فضا میں پہنچتی ہی آزاد پرندے کی مانند چھپانے لگتا ہے۔ پیل ہو تو قنارے کنارے یا کسی درخت کی گھنیری چھاؤں میں بیچ پہ بیٹھ جاتا ہے اور انداز ہونے کی کوشش کرتا ہے۔۔۔ شایان بھی سیٹ بیک سے سر نکاتے، آنکھیں موندھے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسٹریو ڈوبی ساؤنڈ ڈیک پہ مہدی حسن نے فراز کی غزل چھیڑی ہوئی تھی۔

۔ ایک عمر سے ہوں لذت گریہ سے بھی محروم

حسن ادائگی، سرکار چاؤ اور شعر کے باطن میں چھپی ہوئی محرومی التجا، انا اور کک لے  
اسے منہمک کر دیا ہوا تھا۔ اس کا سراپا جلی کی مانند گاڑی کی حرکت کے ساتھ جھول رہا تھا۔  
”طبیعت ٹھیک ہے؟۔۔۔“ زلفی نے ڈیک کا سوچ آف کرتے ہوئے پوچھا۔  
”ہوں، ٹھیک ہوں۔۔۔ اچھا کیا جو ٹیپ بند کر دی۔“ پھر دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔  
”یہیں کہیں گاڑی روک لو۔۔۔“

سڑک کی سائیڈ پہ گاڑی پارک کر کے وہ سرسبز میدان میں اتر کر ایک بیچ پہ بیٹھ گئے۔  
شایان نے پرس سے ڈن بل کا پیکٹ اور سرخ لائٹرن نکال کر غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔  
”کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔ دو نمبر تو نہیں لے آئے؟“  
”زندگی میں پہلی بار ایک نمبر چیز ملی ہے۔۔۔“ اس نے مسلسل پیکٹ کو گھورتے ہوئے کہا۔

ایزی ایزی بات کرو، یہاں کا موسم اور ماحول فلسفے کی خشکی اور سنجیدگی برواشت کرنے کا  
متمثل نہیں ہو سکتا۔۔۔“ زلفی نے اس کے ہاتھ سے پیکٹ لیتے ہوئے کہا۔  
وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے دکھاتے ہوئے بولا۔ ”وہ دیکھو، پھولوں کی باڑی اوٹ میں  
ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ تمہیں کتابیں نظر آ رہی ہوں گی لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ  
وہ کتابیں نہیں بلکہ اک دو بجے کو پڑھنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔۔۔ ایک اور منظر۔ ادھر وہ  
دیکھو۔ وہ درخت کے نیچے ایک خوبصورت سی لڑکی اور لمبے لمبے بالوں والا لڑکا۔ بظاہر  
دکھائی دے رہا ہے کہ لڑکی ایزل کے سامنے کھڑی سامنے درختوں اور کھیتوں کی منظر کشی کر رہی  
ہے، لڑکا پاس کھڑا اے برش پکڑنے کا طریقہ بتاتے ہوئے بار بار اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ رہا  
ہے اور لڑکی بھی بڑی دلچسپی سے نیلے پیلے رنگوں میں چاہت کا رنگ کس کر رہی ہے۔ دیکھ  
رہے ہو، ناایہ لڑکا اسے مصوری سکھانے کے لئے نہیں، پریم سکھانے کے لئے یہاں لایا ہے۔  
کچھ ان لوگوں سے ہی سبق حاصل کرو۔۔۔“

زلفی شرارت سے اس کے لہراتے بالوں کی ایک لٹ چہرے سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”ام  
بھی ایک جوڑا یہاں بیٹھے ہیں، اور کچھ نہیں تو کم از کم بیار بھری باتیں تو کر سکتے ہیں۔۔۔؟“  
”بس، ختم ہو گئی تمہاری جج جج۔۔۔؟“ شانی نے کہا اور پیکٹ اس کے ہاتھ سے چینے  
ہوئے بتانے لگا۔ ”زلفی! یہ پیکٹ اور لائٹرن کل رات مجھے ایک بابا جی نے دیئے ہیں، اور یہ  
بھی۔۔۔ وہ پان والی دوکان پہ بیٹھے تھے۔۔۔“ پرس سے کانڈ نکال کر اسے دکھانے لگا۔

تحریر انہوں نے میرے لئے نہیں لکھی تھی بلکہ وہ میرے پہنچنے، سگریٹ لائٹرن طلب کرنے  
سے پیشتر ہی لکھ رہے تھے۔۔۔ اے پڑھو۔ میں اسے سمجھ نہیں سکی لیکن مجھے یوں محسوس  
ہوتا ہے کہ اس تحریر میں، میرے لئے کوئی پیغام چھپا ہوا ہے، کسی نہ کسی طور اس تحریر کا مجھے  
سے تعلق ضرور ہے۔۔۔“

زلفی بڑے بے دلی سے کانڈ پر لکھی تحریر پڑھنے لگا۔ شایان دور سامنے ایک گھنے درخت  
کے تن پہ نظرس جمائے مزید بتانے لگا۔

وہ بزرگ کوئی عام بزرگ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ان کی سادہ سی شخصیت، پر نور مطمئن  
چہرہ، لمبے کی شائستگی اور رُوح میں اتر جانے والی نظریں۔۔۔ مجھے تو وہ کوئی خاص ہستی دکھائی  
دیئے۔

زلفی کانڈ لوٹاتے ہوئے معذرت کے لہجے میں کہنے لگا۔ ”بھائی! پلے تو کچھ نہیں پڑا لیکن  
اس تحریر کے اندر کچھ نہ کچھ ہے ضرور جو کم از کم میری عقل سے بالا ہے۔۔۔ میرا خیال ہے  
کہ وہ کوئی ٹھہری قسم کا بابا تھا۔ جو تم پہ ریشہ کھٹی ہو گیا ہو گا۔ ایسے بڑے نمبر ہوتے  
ہیں۔ تمہیں خوبصورت اور بیوقوف لڑکی سمجھ کر اوٹ پٹانگ تحریر لکھ دی اور اس طرح تمہیں  
تاثیر۔۔۔“

”نہیں، یا! ایسی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے تو مجھے دیکھا تک نہیں اور نہ ہی سگریٹ  
لائٹرن کے پیسے لئے بلکہ ڈرائیور سے کہا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ کوئی تو میری طرح ڈن بل اور  
سرخ لائٹرن پسند کرنے والا آیا۔۔۔ عجیب سی بے نیازی تھی ان کے انداز میں، ان سے میں نے  
لئے اور نام جاننے کی کوشش کی مگر جواب میں انہوں نے مجھے صرف دعا دی اور بس۔۔۔!“

”اچھا، بابا! وہ بابا جی بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔۔۔ آگے۔۔۔ بولو؟“

”میں چاہتی ہوں کہ تم ان سے ملو۔ کیا حرج ہے؟۔۔۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم ان سے مل  
کر بہت خوش ہو گئے۔ کیا عجب ان کی دعا برکت سے ہمارا بھی کچھ بھلا ہو جائے۔۔۔ زلفی!  
انہیں دور سے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کئی بار پہلے بھی ان سے مل چکی ہوں۔ وہ  
مٹے قطعی اجنبی نہیں لگے۔ میرے اندر جیسے وہ کہیں موجود ہوں، میری رُوح سے ان کی  
شائستگی ہو۔۔۔“

”اچھا، بابا! مل لیں گے۔۔۔ ویسے ایک بات کہوں، برا نہ ماننا۔ تم بد قسمتی یا خوش قسمتی  
سے ان لوگوں میں شمار کئے جاسکتے ہو۔ جو اپنی اوقات، سمجھ وقت اور اندازے سے کوسوں  
آگے کی کوڑی لاتے ہیں۔ ہر بات میں اسرار تلاش کرنے اور سہنس پیدا کرنے میں تمہیں

شاید مزہ آتا ہے۔ میری جان! اگر تم داتا دربار یا کسی بھی مزار پہ چلے جاؤ، ادھر بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھو تو تمہیں وہاں بیٹھا ہوا قریب قریب ہر شخص دلی اللہ دکھائی دے گا۔ کوئی تمہیں آگے کی خبر دے گا، کوئی بشارت سنائے گا، ڈراے گا تو کوئی پیری مریدی کے چکر میں ڈال کر تمہیں الوبٹائے گا۔ بھائی! ڈھونگیوں سے بچو، پہنچے ہوئے لوگ پانوں کی دوکانوں اور تھوڑوں پر نہیں بیٹھتے، دن مل اور سرخ لائینر استعمال نہیں کرتے۔ ایسے لوگ ٹھکری اور بڑے بھوڑے ہوتے ہیں۔ ہو سکے تو اپنی یہ کربید بُرید کرنے والی عادت ترک کرو اور ایسے فراڈیوں سے اجتناب کرو۔

وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مشورے کا شکریہ!۔ اجازت ہو تو ایک واقعہ گوش گزار کروں۔“

زلفی ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ”وہ بھی ارشاد فرمائیں، بندہ بے دام ہمہ تن گوش ہے۔“

شمالیان، وہ سرکنارے ایک بوڑھے آدمی کو گندے کپڑے دھوتے دیکھتے ہوئے بتائے لگا۔ ”کچھ عرصہ ہوا، میں اسی تکلیف کے سلسلے میں ماں جی کے ساتھ پاکپن شریف سلام کے لئے گئی۔ عرس کے دن ہم دور کے ایک رشتہ دار کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک روز شام کو میں اکیلی ہی دربار شریف چلی آئی۔ جنتی دروازے سے گزرنے کی بہت خواہش تھی مگر بیڑ بھاڑ کی وجہ سے اپنی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔ بڑی بڑی لمبی قطاریں اور عجب افرا تفری کا عالم تھا، کئی لوگ کچلے گئے، کئی زخمی ہو گئے۔ یہی سب کچھ دیکھ کر میری ہمت نہ پڑی۔ میں پریشانی کے عالم میں قبرستان کی جانب نکل آئی۔ یہاں بیرون شہر اور بیرون ملک آنے والے زائرین کے گروپ ٹھہرے ہوئے تھے۔ گھومتے گھومتے ایک پرانی بیری کے نیچے عجیب وغریب چیلے کے لوگ دکھائی دیئے۔ یہ دس بارہ اوہڑ عمر کے بھجڑے تھے جو زرق بنی لباس، لمبے لمبے بال، رنگ برنگی مالائیں، ہاتھ پاؤں مندے، سولہ سنگار کئے ہوئے اپنے ایک بہت ہی بزرگ بھجڑے کے گرد حصار باندھے عجیب وغریب بھاشا میں بکت پڑھ رہے تھے۔ ایسی وضع قطع حال چیلے کے بھجڑے کم از کم میں نے پاکستان میں کبھی نہیں دیکھے تھے کچھ! میں کھڑی دیکھتی رہی، پھر مزید کربید کرنے کی خاطر میں ان کے ٹولے کے پاس بیٹھ گئی۔ جو کچھ پڑھ رہے تھے۔ اس میں ہندی، فارسی، اردو اور پوربی کے الفاظ کی بھرمار تھی۔ ایک بات جو میں نے خاص طور پر محسوس کی، یہ تھی کہ ہمارے ہاں ملنگوں، مست قلندروں کے برعکس ان میں بڑی متانت سنجیدگی اور وقار تھا۔ ایک قرینہ اور اسلوب تھا، تھے تو وہ بھجڑے مگر بھجڑوں!

والا اوجھاپن اور سوقیانہ حرکات و سکنات نہیں تھیں۔

پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ رکا تو چائے کا دور شروع ہوا۔ ایک مرغبال مرغ بھجڑے نے مٹی کی پیالی میں میرے سامنے بھی چائے لا کر رکھی۔ عجیب سی چائے تھی۔ جس میں دھویں کی کڑواہٹ کے علاوہ مٹی کا ذائقہ بھی شامل تھا۔ چائے شروع ہوئی تو آتے جاتے لوگ بھی چائے کے لوبھ میں جمع ہونے لگے، دیکھتے ہی دیکھتے ایک اچھا خاصا تماشا لگ گیا۔ کچھ لوگ آگے بڑھ کر بزرگ بھجڑے کے ہاتھ بھی چوم رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ بزرگ دہلی سے تشریف لائے ہیں۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے خلیفہ خاص حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اس خاص عقیدت مند اور منظور نظر بھجڑے کے سلسلے سے ہیں جو بستی نظام الدین کے راستے میں مٹی کی کوری ناند رکھے بیٹھا رہتا تھا، درگاہ شریف جانے والوں کی ٹھنڈے پانی سے تواضع کیا کرتا اور ہر اک سے بیتی کرتا کہ ”نجام پیا“ تک میرا سلام پہنچا دینا اور کہنا کہ اس لونڈی کو ساگن ساگن بناؤ گے؟۔ ساری زندگی وہ دلنوں جیسا لباس اور ہار سنگار کئے لمبے راستوں کے تھکے ہارے پیاسے زائرین کی ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے پیاس بجھاتا اور اپنے بابا کے گیت گاتا، اپنے ساگن ہونے کی درخواست اور انتظار کرتا رہتا۔ آخر ”نجام الدین پیا“ نے اپنی لونڈی کو ساگن بنا کر بلند مرتبت کر دیا۔ حضرت نظام الدینؒ اپنے اس عقیدت مند سے بعد از وصال بھی بے پناہ شفقت فرماتے اور بے حد عزیز رکھتے۔ اس سلسلے کے بھجڑے سوقیانہ طرز زندگی اور ناچ گانے سے متفر ہوتے ہیں۔ البتہ لباس، بناؤ سنگھار اور زیورات کا اہتمام بھجڑوں کی طرح ہی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے نامور اور عالی مرتبت بزرگ گزرے ہیں اور موجود بھی ہیں۔ ان میں مکمل مرد بھی ہوتے ہیں۔ جو صرف لباس اور بناؤ سنگھار کی حد تک بھجڑے نظر آتے ہیں۔ داتا سرکار کے پہلو میں بھی ایسے کئی ایک بزرگ بقید حیات ہیں۔“

زلفی نے گھڑی پہ نظر ڈالتے ہوئے اس کی بات اُچکی۔ ”بھائی! ذرا سانس بھی لے لو۔ تمہاری باتیں سن کر تو میرا جی بھی چاہ رہا ہے کہ فوراً انھوں، گلبرگ سے کوئی اچھا سازنہ سوٹ اور میک اپ کا سامان خریدوں اور مونچھیں منڈوا کر تمہارے ساتھ ہی چل نکلوں۔“

بھیا! میرے کان دُکھنے کو آئے مگر تمہاری تو تلی نہیں تھکتی۔ اگر آج مجھے یہی بابوں، بزرگوں اور پیروں مریدوں کی کہانیاں ہی سنانی تھی تو یہاں کیوں لائے، ادھر داتا دربار چلے جاتے۔“

”مجھے ٹوکو نہیں، صرف سنو۔“ ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ لوگوں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اتفاق سے میں نے اس دن سر پہ سرخ رنگ کی پی

کیپ پہنی ہوئی تھی، زین کی پتلون پہ سرخ شرٹ تھی۔ آگ کے لاؤ کے قریب بیٹھے۔ چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔ میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر اپنے عقیدت مندوں سے فرمایا۔ ”ارو بلبلو! دیکھو، سرخاب آیا ہے۔ آنکھ، کلنی، پر گلوٹی، سرخ شعلہ بھری ہوئی۔“

میرے پلے کچھ نہ پڑا، میں گستاخی کر کے مطلب پوچھ بیٹھا تو وہ بولے۔ ”ناہیں بڑا، باوا ہی سمجھائیں گے۔“

کون باوا؟۔۔۔ مجھ سے پھر گستاخی سرزد ہو گئی۔

جواب ملا۔ ”وہ خود ہی تمہیں ملیں گے، اوش ملیں گے۔“

شایان خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد زلفی خاموشی کو توڑتے ہوئے بولا۔ ”اب تم کہو گے کہ یہ باباجی وہی ہیں جن کے متعلق دہلی والے باباجی نے اشارہ دیا تھا۔“ شانی نے کہا۔

بظاہر تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ میں اس حقیقت سے انکار کروں۔۔۔

زلفی اٹھتے ہوئے معذرت کرنے لگا۔ ”چچا، بھائی! کبھی ان سے بھی مل لیں گے۔ فی الحال اٹھو، کہیں چل کر اچھی سی چائے پلاؤ۔۔۔“

”بور ہو گئے میری باتوں سے۔۔۔؟“

”نہیں، یار! بور نہیں ہوا۔۔۔ دراصل تمہاری داستان الف لیلہ ختم ہونے کو ہی نہیں آتی۔ تمہیں یاد ہی نہیں رہتا کہ سننے والا محض کان ہی نہیں منہ میں زبان بھی رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں بھی کچھ تم سے کہنا چاہتا ہوں۔“

وہ اسے کھینچ کر بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”میری جان! اب صرف تم بولو گے اور میں صرف سنوں گی۔۔۔ بولو، کیا کہنا چاہتے ہو۔ مگر میرا خیال ہے تم نہ ہی بولو۔ میں ہی بولتی ہوں کیوں کہ تم دھکا اشارت ہو، پیڈ پکڑتے پکڑتے، پکڑو گے۔۔۔ پہلی بات کہ تم بہن کے بارے میں پریشان ہو۔ میں نے خود کہا تھا کہ ٹیلی فون کروں گی جو میں نہیں کر سکی، معذرت!۔۔۔ دوسری بات جو تم جانا چاہتے ہو یا پوچھنا چاہتے ہو۔ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ شہنائیاں ضرور بجیں گی، انشاء اللہ!“

”اچھے بھلے بات کرتے کرتے تم پٹری سے کیوں اتر جاتے ہو؟۔۔۔ میں واقعی بڑی بے تابی سے بہن کے بارے میں جانا چاہتا ہوں۔ تم اس کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تم یہ سب کچھ مجھ سے چھپا کیوں رہے ہو اور وہ کون کا مجبوری اور مشکل ہے جس کا اظہار کرتے ہوئے تم ہچکچا رہے ہو۔۔۔ حالات کچھ بھی ہوں، تمہیں مجھ سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں ورنہ ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر کرنے سے بہت

دیر ہو جائے۔“

”تم اپنی سمجھ کے مطابق صحیح کہہ رہے ہو۔ شانی نے کہا لیکن جو کچھ میرے سامنے ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ فی الحال صبر اور انتظار کا دامن نہ چھوڑا جائے کیونکہ کبھی کبھی جذبات اور جلد بازی سے بازی چوٹ بھی ہو جایا کرتی ہے۔۔۔ سردست یہ جان کر مطمئن ہو جاؤ کہ ہماری بہن ہمارے سامنے ہے، صرف وقتی طور پر حالات میری گرفت میں نہیں۔“

”شانی نے زیر لب مسکرا کر کہا تم نے پوچھا تھا کہ مون مارکیٹ میں میرے ساتھ کون تھا؟ میرے ساتھ میری بہن تھی۔۔۔“

”تم نے مجھے ملایا بھی نہیں، ظالم!۔۔۔ میں کب سے اس کی صورت دیکھنے کو ترس رہا ہوں، کم از کم تم مجھے دور سے ہی اسے دکھا دیتے۔“ زلفی اچانک پھٹ پڑا۔

میر، صبر۔۔۔ تمہاری اس بے صبری اور جذباتی کیفیت کی وجہ سے ہی میں نے اسے تمہیں ملانا یا دکھانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ دوست! دیر آید درست آید، جو میں جانتی ہوں تمہیں بھی بتا سکتی ہوں مگر وہ سب کچھ سن کر جو تمہارا رد عمل ہو گا۔ وہ میرے اور تمہارے حق میں کچھ زیادہ بہتر نہیں ہو گا۔۔۔“

”یار! کیا ہو گا۔ جھگڑا، لڑائی، قتل، تھانہ پولیس؟۔۔۔ میں اپنی بہن کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ میرے ارد گرد بھی کچھ لوگ ہیں، اللہ کا دیا روپیہ پیسہ بھی ہے۔ زور، طاقت، اسلحہ، پولیس، سب کچھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ عزت سے پیاری تو کوئی چیز نہیں آتی۔ کاش! تم سمجھ سکتے کہ بھائی کیسا بھی برا گیا گزرا کیوں نہ ہو لیکن ماں بہن کی عزت کے مسئلے میں بڑا حساس ہوتا ہے۔۔۔“

شانی مسکرانے لگا۔ ”دیکھا۔۔۔ کچھ بھی نہ جاننے کی حالت میں تمہاری یہ حالت ہے کہ پولیس اور اسلحے کی نمائش کرنے لگے اور روانی میں یہ بھی بھول گئے کہ میں تمہاری اور بہن کی کیا لگتی ہوں۔۔۔؟“

ایک تو میں تمہارے اس طرزِ تکلم سے بڑا پریشان ہوں۔ لگتی ہوں آتی ہوں، جاتی ہوں، کہتی ہوں۔۔۔ خدا کے بندے! سیدھی طرح سیدھا سادا انداز اختیار کرو۔ عورتوں کا لباس بہن لیا ہے سو پہنو، بات تو مردوں کی طرح کرو۔۔۔“

”وہی معصوم سی مسکراہٹ شانی کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ وہ بولا۔ اس موضوع پہ تو بہت مت بولو۔۔۔ تم اس وقت جذبات میں ہو۔ اس لئے ساری گفتگو پلیٹ کر ایک طرف رکھ دو، پھر کبھی ہرے۔۔۔ وہ بہن تمہاری بھی ہے اور میری بھی، یہ معاملہ میری صواب دید پہ چھوڑ

پوچھا ”بابی! حکیم صاحب نے جو دوائیں بھیجی تھیں وہ اسے دے رہی ہو؟“  
وہ دو ہتھرتالی بجاتے ہوئی خفا سی ہونے لگی۔ ”نگوڑی دوائی چاٹ چاٹ کر میری بچی ہلکان  
ہو رہی ہے، یہ کمینے جو کس بھی ان دواؤں کی نحوست اور بدلو سے پیدا ہوئی ہیں۔ اب اس  
کے کپڑوں لتوں اور جسم جسے بھی سڑیل بدلو کے بھیکے اٹھ رہے ہیں۔“

وہ جیسے انجان بننے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”اسے کیا تکلیف ہے، بابی؟“  
”زنانہ تکلیف ہے۔“ وہ کانوں کی چھپھڑوں کی طرح لٹکتی ہوئی لوؤں کو ہاتھ لگا کر  
بولی۔ ”خدا دشمن کو بھی ایسا روگ نہ لگائے۔“

شانی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”لاؤ، بابی! میں اس کی جو کس دیکھتی ہوں، تمہیں ان موٹے  
موٹے شیشوں سے چھوٹی چھوٹی جو کس لیکھیں کہاں نظر آئیں گی۔“ وہ زبردستی شمرے کا سر  
پکڑ کر بیٹھ گیا، نواب بی بی سے پوچھنے لگا۔ ”روزے رکھ رہی ہو، بابی؟“

”ہاں، ہاں۔۔۔ بڑی رحمتوں کا مہینہ ہے۔ روزے رکھوں گی، قرآن پاک ختم کروں گی،  
رو رو کر اپنی اس بیٹی کی صحت تندرستی کے لئے دعائیں مانگوں گی۔“ وہ اٹھتے ہوئے مزید  
بولی۔ ”اچھا، بیٹی! تم اس کے پاس بیٹھو، میں ذرا کپڑے دھو لوں۔“ یہ کہہ کر نواب بی بی  
باہر نکل گیا۔

”یہ کیا اجڑا اجڑا حلیہ بنا رکھا ہے، بے بی۔۔۔؟“ شانی ناک سکوڑتے ہوئے کہنے لگا۔  
”واقعی بڑی بدو آ رہی ہے تمہارے جسم سے۔۔۔ اٹھو، نہاؤ، کپڑے تبدیل کرو۔۔۔“  
”کپڑے بھی بدل لوں گی، نہا بھی لوں۔۔۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر  
پوچھنے لگی۔ ”مگر بدلو کیسے دور ہوگی، یہ تو میری سانسوں، آسوں میں رچ بس گئی ہے۔“

وہ اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟۔۔۔ میں  
در اصل تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں نے تمہیں تھپڑ مارا تھا۔ معاف کر دو۔۔۔“

وہ جیسے ٹھنھری گئی، خدا جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ اچانک اس کے ہاتھ برف کی مانند  
ٹھنڈے ہو گئے، گرفت میں آیا ہوا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ سر جھکائے، پاؤں کے ناخن سے فرش  
کیدنے لگی اور اس کی جھکی ہوئی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش میں محض  
ہونٹ پڑ پڑا کر رہ گئی اور اس کی جانب رحم طلب نظروں سے نکلنے لگی۔

”۔۔۔ میری بہن! مجھے یوں نہ دیکھو۔ میں تمہارے لئے اپنی جان لڑا دوں گی مگر تمہیں  
آٹا نہ آنے دوں گی، یہ میرا وعدہ ہے۔ تم تھوڑی سی کوشش اور ہمت۔۔۔“

”کچھ فائدہ نہیں۔۔۔ میں جس اذیت میں مبتلا ہوں، دکھائی دیتا ہے کہ اسی کی وجہ

دو۔ جب میں تمہاری انٹری کی ضرورت محسوس کروں گی، تمہیں آواز دے لوں گی۔ مرنے  
چند دن اور صبر کرو، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ پھر موضوع بدلتے ہوئے شرارت بھرا  
انداز میں چھیڑنے لگا۔ ”زلفی! آج میں نے نین اور اس کی امی سے اشارتاً تمہارے متعلق  
بات۔۔۔“

”شایان! خاموش ہو جاؤ۔ اس موضوع پہ کبھی کوئی بات مجھ سے اور نہ ہی ان سے کرنا،  
میں پہلے ہی اپنی اس گھٹیا سوچ پہ بڑا شرمندہ اور پریشان ہوں۔۔۔ اب میں نے خواب دیکھنے  
چھوڑ دیئے ہیں، زندگی اور ذمہ داریوں کی تلخ حقیقتوں نے مجھے سوتے ہوئے بھی آنکھیں کھلی  
رکھنا سکھا دیا ہے۔ وہ تمہاری منگیتر تھی۔ اب ہے یا نہیں، یہ تمہارا مسئلہ ہے مگر میرے لئے وہ  
صرف میری بہن ہے اور پھر میں اب شادی کرنا بھی نہیں چاہتا۔ اس وقت میرے پیش نظر  
سب سے اہم مسئلہ بڑی امی اور بہنیں ہیں۔۔۔“

☆☆☆

شانی دوسرے روز دوپہر کے قریب شمرے کی خیر خبر لینے کے لئے اس کے فلیٹ پہ پہنچا تو  
نواب بی بی شمرے کا جھاز سا سر کھولے موٹے موٹے شیشوں والی عینک سے اس کی جو کس دیکھ  
رہا تھا۔

”ہائے ہائے، اتنی موٹی موٹی حراخوڑ جو کس۔۔۔؟“  
وہ اپنے بھدے آنکھوں کے ناخن دکھانے لگا۔ جو جوڑوں کے خون سے داغ داغ  
تھے۔ شمرے اسے دیکھتے ہی تالیاں پیٹنے لگی۔  
”اٹھا، میرا گڈا آگیا۔۔۔ کہاں تھے تم؟ میری گڑیا اپنے گڈے کا انتظار کرتے کرتے سو گئی  
ہے۔۔۔“

شانی اس کے پاس بیٹھ کر محبت بھری نظروں سے نکتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ گڑیا کے سونے  
کا وقت نہیں، جاگنے کا ہے۔ بے سُدہ نیند سونے والوں کو قافلے والے چھوڑ جایا کرتے ہیں  
اور نیند کی خاطر اپنوں سے بچھڑ جانا کوئی اچھی بات نہیں۔۔۔“ وہ اس کے گال تھپتھپاتے  
ہوئے نواب بی بی سے پوچھنے لگا۔ ”بابی، میں نے کچھ غلط کہا۔۔۔؟“

وہ اپنے دھیانے لگا ہوا تھا بولا۔ ”میں صدقے جاؤں، شانی بیٹی تم کچھ غلط کیوں کہو گی پر تم  
نے کہا کیا ہے، میں تو ایک مسنڈی جوں کا بچھا کر رہی تھی۔ حراخوڑ کہیں ٹھکالگا کر چمکے دے  
گئی ہے۔۔۔“

شمرے آنکھیں پھاڑے سن اور شاید سمجھ بھی رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ شانی نے

سے میری موت واقع ہو جائے گی۔۔۔

وہ کلائی چھوڑ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے دلاسہ دینے لگا۔ ”ایسی بات منہ سے مت نکالو۔ برکتوں رحمتوں کا مہینہ شروع ہو گیا ہے، میں اپنی بہن کے لئے رو رو کر دعاؤں مانگوں گی۔ انشاء اللہ تم ٹھیک ہو جاؤ گی مگر اس کے لئے کچھ تمہیں بھی ہمت کرنا ہو گی۔ جانتی ہو، میں آج تمہاری دوا اپنے ایک کیمسٹ دوست سے ٹیسٹ کروا کر لائی ہوں۔ یہ دو دواؤں دوائیں انتہائی خطرناک ہیں، ان ہی کی وجہ سے تم اس حالت میں پہنچی ہو۔ تمہیں ہمت کر کے اس دوا کے ساتھ ساتھ اس جگہ کو بھی چھوڑنا ہو گا۔ اس جہنم میں رہو گی تو اک دن بھسم ہو جاؤ گی۔۔۔ بس اب تمہیں تھوڑی سی ہمت اور کوشش کرنا ہو گی۔ میں قدم قدم پہ تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔“

شمسہ آنکھیں بند کرتے ہوئے لمبی سی کراہ لے کر بولی۔ ”میں بھی یہ سب کچھ جانتی اور سمجھتی ہوں لیکن اب بازی ہاتھ سے نکل چکی ہے۔۔۔ میری یہ حالت تم دیکھ رہے ہو؟ کسی اور کو کیا، میں خود اپنے آپ کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ ان لوگوں نے جو میری درگت بنا دی ہے، تمہارے سامنے ہے اور اب شاید میں بھی۔ گندی موری کے کیڑے کی طرح غلاطی کی عادی ہو چکی ہوں۔۔۔ تم کس ہمت اور کوشش کی بات کرتے ہو اب یہ سب کچھ فضول ہے۔ تھوڑی بہت جو باقی رہ گئی ہے۔ اس کو بچا کر کیا کروں گی؟۔۔۔ دکھیاں اور معصوم بہنوں کو مزید ذلیل اور رسوا کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ میں یہیں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں۔۔۔“

”شمسہ! تمہارا باپ بھی موجود ہے۔ تمہارا بھائی زلفی بھی جو تمہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے، جو دن رات پاگلوں کی طرح تمہیں تلاش کرتا پھرتا ہے۔۔۔“

وہ اسے پاگلوں کی طرح گھور گھور دیکھنے لگی، ماتھے پہ تیوریاں چڑھا کر پوچھنے لگی۔ ”تم میرے باپ اور بھائی کو کیسے جانتے ہو۔۔۔ کیا انہیں معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں اور کیسی زندگی بسر کر رہی ہوں۔۔۔؟“

چند لمحے سکوت کر کے پھر پوچھنے لگی۔

”پھر تو تم میری ماں اور بہنوں کے بارے میں بھی جانتے ہو گے۔۔۔ بتاؤ؟ شانی! بتاؤ۔ میری ماں اور بہنیں کس حال میں ہے، خدا کے لئے مجھے کچھ ان کے بارے میں بتاؤ۔؟“

”تمہاری ماں اور بہنوں کے بارے میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ زندہ ہیں اور خیریت سے ہیں۔ باقی باتوں کا جواب میں اس وقت نہیں دے سکتی، صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ تمہارا

سو بڑا بھائی میرا بہت ہی پیارا دوست بلکہ اس سے کہیں زیادہ ایک بھائی ہے۔ تمہاری تلاش میں اس نے مجھے تمہاری تصویر دکھائی تھی۔ میں نے اسے تمہاری باریابی کی امید تو دلائی ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ میں تمہیں جانتی ہوں اور نہ یہ کہ تم کہاں ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تم بڑے خطرناک لوگوں کے درمیان پھنسی ہوئی ہو اور وہ لوگ اس وقت اپنی ہی مصیبت میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ تمہاری کیا، انہیں خود اپنا ہوش نہیں۔ اب میں کسی ایسے موقع کی تلاش میں ہوں کہ تم ان کے چنگل سے نکل کر اپنے ماں باپ، بھائی، بہنوں میں پہنچ جاؤ۔۔۔ ماں کی مات تو میں نہیں جانتی مگر تمہارا بوڑھا بیمار باپ اور بھائی تمہارے لئے بہت پریشان ہیں۔۔۔“

وہ طنز بھرے انداز میں مسکرائی بولی۔ ”تم شاید میرے والد صاحب کی ہسٹری سے اچھی طرح واقف نہیں ہو۔۔۔ جو شخص اپنی وفادار اور نیک خوبوی، جس سے اس کی تین بیٹیاں دل اور وہ عورت اس کی قریبی رشتہ دار بھی ہو، وفا نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی بیٹی سے کتنا مخلص ہو لتا ہے؟۔۔۔ باقی رہا بھائی، تو وہ اس کا دوسری بیوی سے بیٹا ہے، اس کی اپنی ماں اور باپ وجود، نہیں اور بھائی موجود۔ اس کی اپنی دنیا، اپنے مفادات۔ اسے میرے بڑے بھلے سے یاد۔۔۔“ غصے سے اس کی مٹھیاں بھینچ نکلیں۔ ”شانلی! مجھے اس دنیا میں اگر کسی سے بے انتہا رت ہے تو وہ میرا باپ ہے۔ ان لوگوں سے بھی زیادہ نفرت جو دن رات مجھے نوچتے اور سونٹے ہیں، کم از کم یہ لوگ منافق تو نہیں۔ کھانا لباس سر کی چھت، سب کچھ دیتے ہیں۔ رابا پ جس کا میں خون تھی، عزت تھی، بائبل بن کر مجھے ڈولی میں بٹھانا مگر وہ میری ماں کو چھوڑ ایک پڑھی لکھی خوبصورت عورت کی ڈولی لے آیا اور ہمیں بے گھر، بے عزت، بے وقار بنے آسرا کر دیا۔ مجھے باپ کی بعد ہر اس چیز سے بھی نفرت ہے جو میرے باپ سے تعلق تی ہے یا منسوب ہے اور یہی خیالات میری ماں کے بھی ہیں۔ جس نے ہمیں ماں سے زیادہ بہن کر پالا، جو ان کیا ہے۔ ہم نے ہر اس چیز سے قطع تعلق کر لیا جو ہمیں باپ کی یاد دلائے۔ ہر مکان، رشتہ دار، سب کچھ دفن کر دیا۔۔۔ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد اگر آج میرا بھائی منافقانہ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں یا اپنی عزت بے عزت کا رونا رو تے ہیں تو یہ مارنا یاد کھانا ہے، حقیقت نہیں۔۔۔“

”قطع صحیح، میں سو فیصد تم سے متفق ہوں۔۔۔“ پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے لگا۔ ”کیا تمہیں مجھ پہ یقین ہے۔۔۔؟“

”یہ پوچھنے کی تمہیں کیا ضرورت محسوس ہوئی۔۔۔؟“ شمسہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے

ہوئے پوچھنے لگی۔

”اس لئے کہ میں جو کچھ تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔ اس سے پہلے میرے لئے یہ بات ضروری ہے کہ تمہیں مجھ پہ اعتماد ہے یا نہیں۔؟“

”شانی! مجھے تم پہ پورا پورا بھروسہ ہے۔ تم کو کیا کہنا چاہتے ہو۔؟“

شانی نے نین تارا کے گھر زلفی سے پہلی ملاقات سے لے کر آج تک گفتگو تک تہہ کمبانی بلا کم و کاست اسے سنا کر کہا۔ ”ہم! اعتماد، یقین بہت بڑی قوت اور نعمت ہیں۔ جسے حاصل ہو جائیں اس کے لئے کوئی مشکل، مشکل نہیں رہتی۔ حالات، خیالات وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں، نفرتیں، محبت میں اور محبتیں نفرت میں تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ زلفی! مجھے بہت قریب سے جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ جبکہ اس کے والد صاحب سے بھی شرف ملاقات حاصل ہوا۔ اس لئے مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہنا۔ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں زلفی بالکل نہیں جانتا کہ تم اس وقت کہاں اور کس حال میں ہو اور نہ ہی میں اسے بتانا چاہتی ہوں۔ اس طرح کام بننے کی بجائے بگڑ سکتا ہے۔“ وہ بڑے جذباتی لہجے میں بتانے لگا۔ ”تم نے مجھے خون دیا تھا اور زلفی میرا بھائی بنا ہوا ہے، ہر دو ناطے سے تم میری بہن ہو۔ میں تمہیں بہن کہتے ہوئے قطعی شرمندہ نہیں ہوں۔ تم نے اور میں نے اس سے قبل جو کچھ بھی کیا یا ہو بھی ہوا اس میں ہماری کسی کمزوری یا مجبوری کا دخل تو ہو سکتا ہے، ہماری عقل یا نیت کا نہیں۔ ہم سے زبردستی کی گئی۔ ہمارا یہ فعل اختیاری نہیں، مجبوری تھا۔۔۔“

”۔۔۔ اور تمہارا یہ فعل۔۔۔؟“ وہ اس کے چلنے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھے لگی۔

شایان اس طنز کو سمجھتے ہوئے مسکرایا۔ ”پیاری بہنا!۔۔۔ یہ میرا فعل اختیاری ہے اور مجبوری بھی۔۔۔ فی الحال اس موضوع پہ بات نہیں ہوگی، پھر کبھی سہی۔۔۔ ہاں تو میں کہہ۔۔۔“

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میں یہ بات شدت سے محسوس کر رہی ہوں کہ تم نے جو حلیہ اپنایا ہوا ہے، یہ تمہارا اور بیچل نہیں۔ یہ زنانوں والے کپڑے، میک اپ مجھے کچھ مصنوعی سا لگتا ہے۔ تمہارے خیالات، افکار اور سلجھا ہوا، مہذب پڑھے لکھوں کا انداز محسوس ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ تمہارے باوقار مرد ہونے کی چٹلی کھاتے ہیں۔۔۔“

”تم سے کہا ہے، یہ وقت اس موضوع پہ بات کرنے کے لئے موزوں نہیں۔ بات کر رہا تھا کہ یہ لوگ بڑے خطرناک ہیں۔ شاید تم نہیں جانتی کہ ان لوگوں کے ہاتھ

ان ہماری ویڈیو فلمیں اور فوٹو ہیں۔ یہ بلیک میلر اور پردہ فروش ہیں۔ افسوس! ان کا اصل اپ اس وقت میرے سامنے آیا جب چڑیاں کھیت چک چکی تھیں۔ یہ تم نے بڑی عقل بڑی کاہوت دیا جو ابھی تک یادداشت کے گم ہونے کا اظہار کرتی رہیں ورنہ بڑی مشکل پڑتی۔ میں نے بھی انہیں محسوس ہونے نہیں دیا کہ میں ان کے اصل چہرے پہچان چکا ہوں، رابہ حلیہ اور یہ انداز بھی اسی سلسلے کی ایک وجہ ہے۔ ہم ابھی انہیں بے نقاب کرنے کی رہنمائی میں نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ قدرت انہیں خود ہی واصل جہنم کر دے گی جس کی ان کی بیماری کی صورت میں ہو چکی ہے۔“

وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے، آہستہ اور قدرے متفکر ہوتے ہوئے کہنے لگا۔

”میری اس وقت پریشانی کی بڑی وجہ تمہاری یہ تکلیف بھی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا ہے کہ تم بھی اسی مرض کا شکار ہو چکی ہو جس میں وہ ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ تم سے یہ تمام بات بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ تم حالات کی نزاکت اور اپنی خطرناک بیماری کے انجام بھراور غور کرو۔۔۔ میری تم سے التجا ہے کہ مایوسی چھوڑو اور یہاں سے نکلنے کی فکر کرو۔ ل زلفی سے اختلاف بھول جاؤ، یہ بعد کے قضیے ہیں۔۔۔“

ٹھیک اسی وقت نواب بی بی ہاتھ پونچھتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

”اُٹیں، لڑکیو! تم ابھی تنگ بیسیں بیٹھی ہو؟۔۔۔ خیر سے روزے کا وقت ہے، اس کی بھی فکر کرو۔۔۔“ شمس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”میری بچی تو روزہ رکھ نہیں سکتی، ما جو کھاتی ہے۔۔۔“ وہ واپس پلٹا۔ ”اچھا! میں تمہارے کھانے کا بندوبست کرتی۔۔۔“

نواب بی بی کے جانے کے بعد شمس بولی۔

”شانی! میں نے تمہاری ساری کہانی سنی ہے، تمہارا جذبہ اور خلوص قابل قدر ہے مگر ہانا انجام نظر آرہا ہے۔ میرے ساتھ جو بھی ہو، سو ہو لیکن میں انہیں مزید رسوائیوں اور ہتھکڑیوں سے تو بچا سکتی ہوں۔ میری معصوم بہنوں کا میری وجہ سے مستقبل خطرے میں پڑ سکتا ہے پھر جس بری طرح سے میری ناپائیداری اور میری انا مجروح ہو چکی ہے اور جس بڑے طریقے میری عزت نفس کھلی جا چکی ہے اسے دیکھتے ہوئے اب میں عورت تو کیا، ایک انسان بھی اپنے کی مستحق نہیں۔ میں ان درندوں سے ایسا انتقام لوں گی کہ یہ مجھ سے التجائیں کر کر کے شام گھٹیں گے مگر انہیں موت نصیب نہیں ہوگی۔۔۔ اگر تم میری مدد کرنا چاہتے ہو، میرے ہاتھ مجھے بہن کہتے ہو تو وعدہ کرو کہ میرے یا میری اس زندگی کے بارے میں یا میرے اس

”مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ سب کچھ دینا یونہی نہیں تھا۔ ان کی تحریر میں کوئی پوشیدہ اشارہ ہمارے لئے کوئی پیغام ہے۔ سگریٹ کا بند پیکٹ اور لائیسٹر کوئی نہ کوئی معنی اور مقصد رکھتے جنہیں فل الحال میں سمجھ نہیں پائی۔ تم سگریٹ یا لائیسٹروں میں کوئی ایک چیز اپنے پاس لو مجھے یقین ہے کہ کہیں نہ کہیں یہ چیزیں تمہارے کام آئیں گی۔“

وہ جھنجھلا کر بولی۔ ”اوہو، شانی! میں نہیں سمجھتی تھی کہ تم ایسے ضعیف العقیدہ اور توہم و واقع ہوئے ہو کہ کسی بوڑھے کی دی ہوئی ان عام اور فضول سی چیزوں سے کوئی مطلب بھی نکال لو گے۔ تم انہیں اپنے پاس ہی رکھو۔۔۔“

”یہ موقع اس موضوع پر بحث کرنے کا نہیں۔۔۔ تحریر اور لائیسٹر میرے پاس رہنے دو، ٹکٹ کا پیکٹ تم اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔۔۔ وہ اسے تاکید کرتے ہوئے کہنے لگا۔“ یاد یقین اور اعتدال میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ تم اس پیکٹ کو یونہی بند رہنے دینا، کھولنا۔۔۔“

وہ جان چھڑاتے ہوئے پیکٹ کو پرس میں رکھتے ہوئے بولی۔  
”اچھا بابا وعدہ۔۔۔“

☆☆☆

ننان جہاں اشرف المخلوقات ہے وہیں عجیب العجائبات بھی واقع ہوا ہے۔ اس نے شاید مجھے مرنے، خوشی غمی، آسودگی، نا آسودگی، بلندی پستی، دوستی، دشمنی، عزت غیرت، بت، اچھائی برائی اور اخلاقی جرات کا کوئی معیار مقرر نہیں کیا۔ جو چیز، حرکت، عمل اس اسوج اور ضرورت کے کھانچے میں فٹ بیٹھ جاتی ہے، وہی اس کے لئے جائز اور اس کا جاتی ہے اور پھر اس کو جائز اور صحیح ثابت کرنے کے لئے اس کے پاس بے شمار دلائل ملتے بھی ہوتے ہیں۔۔۔ شایان کی زندگی اور سوچ و عمل بھی ایسے کئی تضادات کا نمونہ لباپ جنہوں نے اسے ناز و نعم سے پال پوس، لکھا پڑھا کر جوان کیا وہ انہیں یکسر کر دینے پر مجبور تھا۔ سگی، ہمیش کئی ہفتوں سے اکلوتے بھائی کی صورت دیکھنے کے لئے ہی تھیں مگر اس نے ایک ایسی لڑکی کو بہن بنا لیا جس کی ایک ایک رات کی سیاہ ل کا وہ شاہد تھا۔ جس نے اسے کئی بار بے لباس ہی نہیں بلکہ خود کو بھی اس کے پہلو لباس دکھا۔ جو منشیات کی عادی، خطرناک مریضہ تھی اور جس کی ذہنی حالت بھی غمی۔ ادھر نین تاراب۔۔۔ جس کے دل کے تار ٹوٹ کر، اب نئے سرے سے پھر لٹک دو کرنے والا جو خود خود کشی کی ناکام کوشش کر چکا تھا وہی اب دوسروں کو ہر

ٹھکانے کے متعلق زلفی یا اور کسی کو کبھی کچھ نہیں بتاؤ گے اور اگر ہو سکے تو میری ڈیکھائی ملو۔  
جنہوں کا خیال رکھو گے۔۔۔“ وہ زبانی ان کا پتہ ٹھکانا بتاتے ہوئے مزید کہنے لگی۔ ”اگر تم اپنا وعدہ نبھایا تو میں سمجھوں گی کہ تم نے بھائی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ اور ہاں، تم میری چھوڑ دو۔ میں اپنا راستہ خود ہی نکالوں گی۔ میں تمہیں اور زلفی کو کسی صورت بھی اپنے سولہ میں ملوث نہیں کرنا چاہتی، خصوصاً تم تو بالکل لا تعلق رہو ورنہ تم بھی کسی مصیبت میں پھر جاؤ گے جو میں کبھی بھی نہ چاہوں گی۔“

نواب بی بی کچھ کھانے پینے کا سامان اور دوائیں لے کر اندر داخل ہوا۔

”لو، پھینچو! کھاؤ، پیو۔۔۔“ پھر شانی سے مخاطب ہوا۔ ”کھانے کے بعد یہ دوا لے دینا، میں ذرا آرام کر لوں۔۔۔“  
”تکلیف۔۔۔“

شانہ نے کچھ کتنا چاہا تو شمس فوراً اس کے لبوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”یہی غلط کبھی نہ کرنا۔۔۔ میرا نام شمس ہے۔“

”سوری، شمس!۔۔۔ میں جانوں کہ میری کسی التجا کا کوئی اثر تم پہ نہیں ہوا اور تم۔۔۔“  
”تم اب چلے جاؤ شانی۔ میں اپنے بارے میں تم سے بہتر سمجھتی ہوں۔ تم پہلے کی طرح لا تعلق سے رہو۔۔۔ مجھے شدت سے محسوس ہو رہا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے اور جو کچھ ہونا ہونے والا ہے اس میں تمہارا نام نہیں آنا چاہئے اسی میں تمہاری اور میری بہتری ہے۔“  
وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہنے لگی۔ ”۔۔۔ جانے سے پہلے وعدہ کرو کہ تم میری التجا پر عمل کرو گے، کسی بھی صورت کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے ورنہ تم اپنی مری ہوئی بہن کا نہ دیکھو۔۔۔“

وہ ہکا بکا سا اس کا منہ دیکھنے لگا جس پہ ایک نئے عزم کی روشنی صاف نظر آرہی تھی۔  
”وعدہ کرو، شانی! وعدہ۔۔۔“

”ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتی ہوں لیکن تم سے بھی ایک وعدہ چاہوں گی کہ تم بھی اپنی زندگی کی حفاظت کرو گی اور اپنے ہر حال سے مجھے مطلع رکھو گی۔۔۔“  
”وعدہ۔۔۔“

اچانک شانی کو یاد آیا۔۔۔ ”شمس! تم کو وہ بابا جی یاد ہیں جنہوں نے ڈن بل کا ٹکٹ لے کر سرخ لائیسٹر دیا تھا اور ایک تحریر بھی۔۔۔“

”ہاں، یاد ہیں۔۔۔“ شمس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

حال میں جینے کا درس دے رہا ہے۔ وہ دوسروں کے سامنے زندگی کے متعلق بڑے بڑے اور فلسفے بیان کرتا مگر خود اپنی زندگی کی محرومیوں نا آسودگیوں کو کھلی میں کھلی ڈنڈا کھیلے والا لونڈوں کی طرح ٹٹے مار مار کر اڑا دیتا۔ بہشتی دروازے سے گزرنے والا، بزرگوں اور مجتہدوں پاؤں کی قدر کرنے والا، ان کے قدموں میں باؤب بیٹھ کر فیض یاب ہونے والا زمانوں، زخموں کے جھر مٹ میں گھٹکھرو باندھ کر ناچتا بھی ہے۔ جمال و جذبات کی کیفیتوں، ہیکاروں خوشبوؤں کی لطافتوں، شعروادب کی نزاکتوں، نفاست سلیقے اور قرینے کی قدروں کا دلدادہ۔ فحاشی و خباثت اور ناؤ نوش کی محفلوں میں سرمست بھی رہتا ہے۔ انسان جب اندر سے لڑ پھوٹ جاتا ہے، زندہ رہنے کا جب کوئی واضح مقصد اور سامنے کوئی نشان منزل نہیں پاتا تو شاید یوں ہی سوچتا ہے یا وہ یوں ہی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ دیوانوں کی طرح جہاں طبیعت بھی بگم گئے۔ جہاں سے اٹھے پھر اٹھ ہی گئے اور جدھر چلے، ادھر چل ہی دیئے۔

افطاری کے بعد، کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ منشی کرم الہی صاف ستھرے کپڑے، سر سفید ٹوپی پہنے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”شایان پتار رمضان شریف کا بابرکت مہینہ ہے اور آج جمعرات بھی ہے۔ بڑی برکتوں و رحمتوں والی۔۔۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ موت کو کبھی بھولنا نہیں چاہئے، ہر وقت توبہ و تقاضا کرنی چاہئے۔ اگر دل مانے تو تم بھی میرے ساتھ چلو۔ تراویح وہیں پڑھیں گے۔۔۔ اللہ پاک سے رو رو کر اپنے لئے ہدایت مانگو، اللہ بڑا غفور الرحیم ہے۔“

”چاچا! میں کیسے جاسکتی ہوں، میرا حلیہ اور کروت دیکھے ہیں؟۔۔۔ تم چلے جاؤ، وہ پاکیزہ جگہ مجھ جیسے بدکاروں کے لئے نہیں۔“ شایان نے جواب دیا۔

”نہیں، بیٹا! ایسا نہ کہو۔۔۔ داتا سرکار تو اتنی دور سے یہاں آئے ہی اس لئے تھے کہ بھٹکے ہوؤں اور گنہگاروں کی ہدایت کا وسیلہ بنیں اور پھر اللہ پاک تو گنہگاروں اور بدکاروں کی خوب منتاہے، بڑے دھیان اور کریمی سے توجہ دیتا ہے۔ کوئی مانگے، بخشش چاہے، کوئی آنسو بہانے والا ہو، کوئی ہو جو اپنے گناہوں پہ شرمندہ ہو، آئندہ کے لئے توبہ کرے تو وہ ضرور معاف کر دیتا ہے۔ بیٹا! توبہ کا دروازہ ابھی تک کھلا ہوا ہے۔ اٹھو چلو۔۔۔“

”چھا، چاچا!۔۔۔ آج وہاں سے بھی کچھ مانگ کر دیکھ لیتے ہیں۔۔۔“

منشی اس کے بھوپسن پہ قربان ہوتے ہوئے مسکرایا، بولا۔ ”بیٹا! آزمائش اور شرط لے کر بنائے تو بے شک نہ جاؤ۔۔۔ عاجزی اور شرمندگی کے آنسو لے کر جاؤ۔ داتا سرکار کے وسیلے سے مانگو، رو رو کر فریاد کرو۔ راضی برضا ہو جاؤ، مجھے یقین ہے کہ تم پابوس نہیں لوٹو گے۔۔۔“

پندرہ منٹ میں شایان نہادھو، وضو سے فارغ ہو کر مردانہ سفید شلوار قیض میں تیار کھڑا لہذاک کلن کے زیور اتار دیئے تھے۔ سر کے بال سمیٹ کر سر پہ انگو چھا باندھ لیا۔ اس سادہ عذاب میں بھی وہ بہت ہی پیارا لگا۔ منشی کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو چھٹک آئے، سر پہ

سے راز دل کیوں نہ کہوں سامنے دیوانوں کے یہ تو وہ لوگ ہیں، اپنوں کے نہ بیگانوں کے وہ بھی کیا دور تھے ساتی تیرے مستانوں کے راستے راہ نکا کرتے تھے سے خانوں کے راستے بند کئے دیتے ہو دیوانوں کے ڈھیر لگ جائیں گے بستی میں گریبانوں کے آپ دن رات سنوارا کریں گیسو تو کیا کہیں حالات بدلتے ہیں پریشانوں کے کیا زمانہ تھا، ادھر شام ادھر ہاتھ میں جام صبح تک دور چلا کرتے تھے پیانوں کے ہاتھ خالی ہیں مگر ملک عدم کا ہے سفر حوصلے دیکھئے ان بے سرو سامانوں کے سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہیں جو کعبہ میں ایسے ہوتے ہیں نکالے ہوئے بت خانوں کے

بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا، دعا کی۔ پھر آنکھوں کے بھیجے ہوئے کونوں کو چادر سے پونچھتا ہوا اسے ساتھ لے کر نیچے اتر آیا۔

\*\*\*

داتا دربار رونق تو چوبیس گھنٹے رہتی ہے۔ بھائی چوک سے دربار تک انسانوں کا ٹھاٹھ مارتا ہوا سمندر تھا۔ داتاؒ کے عاشق والمانہ انداز میں جوق در جوق اسی بحرِ وجود و سخا کی جانب رہے تھے جہاں پہنچ کر سوکھاتا کابھی ہری بھری مُرادوں بھری شاخسار شرمیلار میں بدل جاتا ہے بڑی تنگ و دو سے چوکھٹ تک پہنچے، چوکھٹ کو ہاتھ لگا کر بوسہ دیا اور اندر داخل ہوئے تو بے باغ ارم میں پہنچ گئے ہوں، نور اور تجلیات میں بھیگتے ہوئے مزار شریف پہ حاضری دی۔ ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی، دعا مانگی۔ سبیل سے پانی پیا اور پھر پاس ہی قرآن کھول کر بیٹھ گئے۔ عشاء اذان پہ وہ مسجد میں آگئے۔ نماز اور تراویح کے بعد سلام پڑھنے کے لئے سب کھڑے ہو گئے۔ داتا سرکار مسجد میں سلام پڑھنے کا بھی ایک عجیب سا سواہ ہے۔ جو خوش قسمت نماز باقاعدگی سے شامل ہوتے ہیں، وہی جانتے ہیں کہ سلام پڑھتے ہوئے وہ کیسی کیسی وجدانی اور روحانی کیفیات و تجلیات سے سرشار و مستفیض ہوتے ہیں۔ جھکی آنکھوں میں دُور عقیدہ سے چمکتے ہوئے آنسو، بارِ ندامت سے جھکے ہوئے سر، غلاموں کے بندھے ہوئے ہاتھ سڑ۔ گلستانِ مدینہ سے آتی ہوئی نسیم رحمت باری کی مستی سے جھومتے ہوئے جسم، استغراقِ حضور اکبرؐ خضرؑ اور جالی روضہ رسولؐ کا تصور تصویر بن کر سامنے ٹھہر جاتا ہے۔ ان خوش نصیبوں کا داتا سرکارؑ کے وسیلہ پاک سے بیس کھڑے کھڑے حاضری ہو جاتی ہے۔ شایان بھی مجسمہ معجز و نیاز بنا شاید ایسی ہی سرشاری اور حضوری کی کیفیت سے دوچار تھا۔ سلام کے بعد سوز گداز میں ڈوبی ہوئی دعا بھی اپنا ایک الگ ہی تاثر رکھتی ہے۔ دعا ختم ہوئی، لوگ آنکھیں پونچھتے ہوئے مسجد سے باہر نکل رہے تھے لیکن وہ مجسمہ معجز و نیاز بنا وہیں پہ کھڑا تھا۔ ہاتھ لے ہوئے تھے جیسے ابھی مراد نہ ملی ہو، ادھر سے کوئی جواب نہ آیا ہو۔ آنکھیں ابھی نم تھیں پہ کپڑے میں کچھ نچوڑ باقی رہ گیا ہو۔ فشی کرم الہی پاس کھڑے دیکھ رہے تھے۔ وہ زبردست ہوئے سرخاب کی نوائے آہ و فغاں میں مغل ہونا نہیں چاہتے تھے۔ پیچھے داتاؒ آگے داتا کا ابا، درمیان میں درد میں ڈوبی ہوئی دعا۔ دیکھنے والا دیکھ رہا تھا، مانگنے والا مانگ رہا تھا اور شاید ہم دینے والا نے کچھ دے دیا۔ اس نے چہرے پہ ہاتھ پھیرے، واپس پلٹا تو سامنے داتا سرکارؑ جھلک جھلک کرتا ہوا روضہ تھا۔ سبز گنبد، انوار کی ضیا باریاں، بھینی بھینی خوشبو، روح کو سرشار کرتی ہوئی نرم نرم خنکی، جیسے باغ بہشت کی جانب سے کوئی جھروکہ کھل گیا ہو۔

اچانک اسے پان والی دکان کے بابا جی نظر آئے۔ دس قدم آگے مسجد کے بڑے دروازے کے باہر بیٹھے وہ اسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ وہ بے اختیار ادھر لپکا، پاس بیٹھ کر سلام کیا۔ دھیمی میسکرانٹ کے ساتھ انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے ہٹھالیا اور مزاج پوچھا۔

”جی، آپ کی دعا سے ٹھیک ہوں۔۔۔ آپ یہاں آتے رہتے ہیں؟“ بغیر سوچے سمجھے شایان سوال کر بیٹھا۔

”ہاں، بیٹا! داتا دینے والے کو کہتے ہیں اور ہم منگتوں کو داتا دربارے آنا ہی پڑتا ہے۔ یہاں نہ آئیں تو کہاں جائیں؟۔۔۔ اچھا ہوا جو آج تم بھی اس در پہ آگئے۔ یہ کرم الہی ہے، داتا کی دیا ہے۔“

فشی کرم الہی بھی پاس بیٹھ گیا۔

”بابا جی! آپ مجھے جانتے ہیں۔۔۔؟“ ڈرتے ڈرتے شایان نے پوچھا۔

مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ سب کچھ جانتا ہے، سب کو جانتا ہے۔ صرف ہم ہی ہیں جو کچھ نہیں جانتے اور اگر کچھ جانتے ہیں تو مانتے نہیں لیکن جانا جو کھم ہے جبکہ ماننا بڑی مہانتا ہے۔۔۔ ماننا، ماں سے شروع ہوتا ہے۔ ماں چچی ہوتی ہے۔ جو گھر کی چکی کا ماں جان لے اس کا داتا گھر میں موجود۔۔۔ گھر کی چکی کا پسا کھاؤ، پُن کھاؤ۔۔۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں، بابا جی۔۔۔؟“

وہ کہہ رہے تھے۔ ”اس ماں کا ماں تو ڈوبا۔ ماں ٹوٹ گیا، بازار اٹھ گیا۔۔۔ جاؤ، اسے فوراً نکالو۔ کہیں لے جاؤ، چھپاؤ دو۔ سرخ پیکٹ کا تمباکو ابالو۔ سولہ پہر خوب پانی پلاؤ۔ پانچ سیر پختہ برگ نیم، سر کا پورا مونڈن بال کچے گھڑے میں سوختہ کرو اگر خشک استنجا استعمال کراؤ۔۔۔ فوراً اسے نکالو، ابھی۔۔۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھے اور ایک طرف چل دیئے۔

\*\*\*

محرمی کے وقت، نیچے پولیس کی گاڑی رکی اور چار آدمی عامل ظہوری شاہ کے دفتر آئے۔ اس کا ملازم موجود تھا، اندر آتے ہی انہوں نے اسے دبوچ لیا اور شاہ صاحب کے متعلق پوچھا۔ اس نے حیل و حجت سے انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔ وہ خفیہ ایجنسی کے کارندے تھے، دچار لائے ہاتھ کی جنائیں تو جھٹ سوڈوال ظہوری شاہ کے ڈیرے کا پتہ بتادیا۔ اسے ساتھ لے کر پولیس وہاں پہنچی۔ یہ سارے ابھی تک سوئے پڑے تھے۔ بغیر کسی مزاحمت یا زحمت کے یہ سارے غلیظ چوہے پولیس کی گاڑی کے چوہے دان میں بند تھے۔۔۔

اس کے شاہی محلے کے چند اوباش اور مشتبہ دوست پکڑے گئے، یہیں سے موتیا جان بھی کھینچے  
میں آئی تھی۔ اس کو پرائیویٹ کلینک سے قابو کیا گیا تھا۔ اس کی بیماری کے ریکارڈ اور اسی کی  
مات سے یہ خدشہ بھی درست نکلا کہ یہ بیمار آگے بڑھ چکی ہے۔ دائرہ بڑھتے بڑھتے مس نوشی  
کے دفتر تک آپہنچا، یہ سب کچھ اتنی سرعت اور رازداری سے ہوا کہ اس بے چاری کو سنبھلنے  
کا موقع تک نہ مل سکا۔

شایان اور فشی کے داماد صاحب سے واپس پہنچنے سے پیشتر ہی یہاں کا گند صاف ہو چکا تھا۔  
لازم لے ساری تفصیلات بتائیں۔ نواب بی بی اور دونوں زنانے بھگدڑ مچتے ہی شمسہ کو شایان  
کے لٹک میں پھینک کر بھاگ گئے تھے۔ شمسہ ابھی تک بظاہر ساری صورت حال سے بے خبر  
اپنے خیالوں میں مگن تھی۔ شایان کے دماغ میں شہد کی مکھیاں جیسی جھنجھٹ سی ہو رہی  
تھی۔ بابابی کے الفاظ، اشارے ایک ایک کر کے یاد آرہے تھے۔ ”بازار اٹھ گیا۔۔۔ جاؤ“  
اسے فوراً نکالو۔ کہیں لے جاؤ، چھاپو۔ سرخ تمباکو بالو، سولہ پہر خوب پانی پلاؤ۔۔۔ فوراً“  
اسے نکالو، ابھی۔۔۔ اس نے فشی کرم الٹی کی جانب دیکھا۔ وہ پہلے ہی اسی کی طرف دیکھ  
رہے تھے، شاید دونوں کے دماغ بیک وقت بابابی کے الفاظ پر غور کر رہے تھے۔

”چاچا! اب کیا کریں۔۔۔؟“

”وہی کرو جو بابابی نے کہا تھا۔“

”سگریٹ کا پیکٹ کہاں ہے۔۔۔؟“ اس نے شمسہ سے پوچھا۔

”یہ میرے پاس۔۔۔“ وہ پیکٹ دکھاتے ہوئے بولی۔

شایان نے پیکٹ لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ شمسہ کہنے لگی۔

”چاچا! کچھ مجھے بھی بتاؤ، یہ کیا افرا تفری ہے۔۔۔ نواب بی بی مجھے یہاں چھوڑ کر کہاں  
نکب ہو گئی ہے، آپ لوگ پریشان کیوں ہیں؟“

”اس وقت صرف یہی جان لو کہ پولیس نے چھلپا مارا ہے، سب گرفتار ہو گئے ہیں۔ شاہ  
مناہب کے دفتر پر پولیس کا سپرہ ہے، سوڈو وال والے بھی سب پکڑے گئے ہیں اور کسی وقت  
کو بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ فوراً“ یہاں سے نکلنے کی کرو۔ خاموشی سے، ”چپ چاپ۔۔۔“

پھر وہ اپنے ملازم حیرے سے مخاطب ہوا۔

”تم فوراً“ اس کے بل موندھ کر ایک شاہر میں جمع کر لو۔ اسے میری شلوار قبضہ پہنا  
لا۔۔۔ فوراً“ دو منٹ میں۔۔۔“

کچھ دیر بعد وہ اسے لے کر سڑک پر آگیا۔ ذرا ہٹ کر اسے رکشہ مل گیا۔ بند روڈ سے

شہزاد اور سکندر بخت کا پراسرار قتل، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، اسپیشل پولیس کے لئے  
اجھا خاصا مسئلہ بن گیا تھا۔ ان کے پاسپورٹوں کی روشنی میں جب دائرہ تفتیش پھیلا تو پولیس کی  
بھی آنکھیں پھیل گئیں۔ امریکن ایجنسیاں بھی درمیان میں آگئیں، معلوم ہوا کہ یہ دونوں  
ادھر امریکہ میں بھی پولیس کو مطلوب تھے لیکن دونوں کسی نہ کسی طور پولیس کو جل دے کر  
پاکستان آگئے تھے۔ امریکن ایجنسیوں کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق یہ دونوں میکسیکو کی  
ڈی، انتہائی خطرناک قسم کے سوزاک میں مبتلا تھے جو رسوائے زمانہ لعنتی مرض ایڈز سے بھی  
چار ہاتھ آگے خطرناک بیماری ہے۔ ایڈز میں مبتلا مریض کسی نہ کسی طرح ایک لمبا عرصہ زندہ  
بھی رہ سکتا ہے اور اسے تھوڑا بہت کنٹرول بھی کیا جاسکتا ہے مگر یہ عفریت، انسان کے فشی  
غدد اور اعضا کو شور کے تیزاب کی مانند گھلا کر شور باندیتا ہے اور اس کا اگر ایک قطرہ کسی  
دوسرے انسان کے لعاب یا خون میں شامل ہو جائے تو وہ بھی اسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔  
شہزاد اور سکندر بخت کی لاشیں اپنی تحویل میں لے کر تفتیش کا دائرہ پھیلا دیا گیا۔ سندھ پولیس،  
پنجاب پولیس، امریکن امیگریشن، اور کئی دوسری حساس ایجنسیاں، کھٹکے شامل تھے۔ ابتدائی  
تفتیش سے یہ حقیقت ثابت ہو چکی تھی کہ شہزاد لاہور کا رہائشی ہے، اس کے احباب دوست  
اور رشتہ دار لاہور میں ہی مقیم ہیں اور پاکستان آنے کے بعد اس نے زیادہ عرصہ لاہور میں  
عیش و عشرت میں گزارا۔ ظہوری شاہ اینڈ پارٹی اور موتیا جان بھی منظر عام پہ آکر پولیس کی  
تحویل میں آچکے تھے۔ لاہور پولیس پر بڑا پریشر تھا کہ جتنی بھی جلدی ہو سکے، ان تمام لوگوں کو  
پکڑا جائے جن سے شہزاد ملا۔ کن کن لوگوں سے واسطہ رہا، کہاں کہاں وہ ٹھہرا۔ اس کی  
سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں اور سب سے بڑی بات کہ یہ منشیات کس کس نے استعمال  
کیں؟ جب تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں اس نشہ کو پاکستان میں تیار کرنا چاہتے تھے اور  
کسی حد تک تیار کر بھی لی تھی تو سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں۔ شہزاد کے سابقہ ریکارڈ کی مدد سے

ہوتا ہوا پرانے ساندے، واپڈا والوں کے دفتر سے ذرا آگے مسجد کے ساتھ والی گلی میں داخل ہو کر اس نے ایک دکاندار سے ٹھیکیدار محمد یوسف کے مکان کا پتہ پوچھا۔  
 ”تم مجھے گھر لے جا رہے ہو۔۔۔؟“ شمس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔  
 ”۔۔۔ صرف خاموش رہو، اس وقت کوئی سوال یا حرکت مت کرو۔“ شایان نے اسے جھڑک دیا۔

دکان دار نے گلی کے آخر میں کونے والے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”وہ جہاں لوگ جمع ہیں، وہی مکان ہے۔۔۔“

”خیریت ہے، وہاں لوگ کیوں جمع ہیں؟“  
 ”جی، حاجی صاحب کے مکان میں ایک کرائے دار بوڑھی عورت رہتی تھی۔ ایک مگر پہلے وہ انتقال کر گئی ہے۔۔۔“ دوکاندار نے بتایا۔

وہ آگے بڑھا۔ لوگوں، محلّہ داروں کا ہجوم تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے؟ کوئی واضح بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ یہ روح فرسا خبر سن کر وہ خود دہل گیا تھا۔ شمس ماٹھ تھی، دل پکا کر کے خاموش رہا۔ شمس کی جانب دیکھا تو وہ گم سم سی تھی۔ پاس سے ایک بوڑھی عورت گزر رہی تھی۔

”مال جی! یہاں کون فوت ہو گیا ہے۔۔۔؟“  
 ”پڑا ایک بے سہارا بیمار عورت تھی۔ خاوند کا پتہ نہیں تھا بھی یا نہیں، بیٹا کوئی نہیں تھا۔ ایک جوان بیٹی عرصہ ہوا کہیں بھاگ گئی، نشہ کرتی تھی۔ بس، پڑا اسی کا غم لے کر رہ گئی۔۔۔“

ابھی اس کی بات ختم نہیں ہوئی تھی مگر وہ رکشہ والے کو واپسی چلنے کو کہہ چکا تھا۔ اس کے لئے اب بڑی گنبد صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔ کیا کرے، کدھر جائے؟۔۔۔ رکشہ بند رہا۔ پہلے بھاگا جا رہا تھا مگر دماغ جیسے ٹھس۔۔۔ پہلے ہی پریشانی کیا کم تھی جو یہ نئی افتاد بھی آ رہی۔ شمس اس کی شانے پر ڈھے چکی تھی۔ ایک ہوٹل کے قریب اس نے رکشہ رکھوایا، پانی منگوا کر شمس کے منہ پر چھیننے ڈالے تو آنکھیں کھلیں۔

”ہوش کرو، بہن! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ صبر اور تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو سنبھالو! یہاں رکشے میں تماشہ لگانا۔۔۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ تمہیں پولیس سے بچانا ہے۔ پولیس چھاپے مار رہی ہے، خوش قسمتی سے ہم ان کی نظر میں نہیں آئے اور نہ ہی کسی نے ہماری نشاندہی کی ہے ورنہ ہم اس وقت یہاں نہیں، کسی پولیس تھانے میں ہوتے لیکن۔۔۔“

ی جلد پکڑے جانے والے ہماری نشاندہی کرنے پہ مجبور کر دیئے جائیں گے۔ جب انسان کی اپنی جان پہ بنی ہوتی ہے تو اسے کسی سے بھی ہمدردی نہیں ہوتی، پھنسا ہوا دوسروں کو بھی پھنسا رہا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ پولیس تمہیں کیسے چھوڑ گئی ہے۔۔۔ شاید یہ باباجی کی نظر کرم تھی کہ انہوں نے مجھے ان حالات سے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔۔۔“

سرخ پیکٹ کو تھپتھپاتے ہوئے وہ رکشے والے کو فیروز پور روڈ کی جانب چلنے کو کہہ چکا تھا۔ شمس نے بڑی دقت سے پوچھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم جو کچھ بھی کر رہے ہو، اپنے باباجی کی ہدایت پر کر رہے ہو اور آج ان سے ملے بھی ہو۔۔۔؟“ شمس نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ رات میں چاچا کرم الہی کے ساتھ داتا سرکارؒ سلام کرنے اور تراویح پڑھنے گیا تھا، وہیں ان سے ملائت ہوئی۔ انہوں نے خود ہی ان خطرات کا اظہار کرتے ہوئے تمہیں فوراً کسی محفوظ جگہ پر منتقل کرنے کی ہدایت کی تھی۔ تمہاری بیماری کے لئے انہوں نے سرخ پیکٹ کا تمباکو بہت سے پانی میں ابال کر سولہ گھنٹہ پیٹ بھر کر وقفے وقفے سے پینے کو کہا۔ پانچ میرٹیم کے پتے اور تمہارے سر سے اترے ہوئے بال کسی کورے ٹکے میں جلا کر ان کی راکھ کو بطور خشک استنجا استعمال کرنے کی تاکید کی۔۔۔ یقین اور اعتماد میں بڑی طاقت ہوتی ہے، مانو تو ٹھاکر اور نہ مانو تو پتھر۔۔۔ ان دو لفظوں سے بڑے بڑے گڑے کام سنور جاتے ہیں۔ تمہیں یقین ہونا چاہئے کہ باباجی کے ارشاد کے مطابق عمل کرنے تم بالکل تندرست ہو جاؤ گی اور مجھ پہ بھی اعتماد ہونا چاہئے کہ میں تمہارا اپنا بھائی ہوں۔۔۔“

☆☆☆

نین تارا کے گھر سے چند قدم آگے رکشہ رکوا کر اس نے زلفی کی بیٹھک کے دروازے پر ٹکی کی دستک دی، دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی۔

”تم۔۔۔؟“ زلفی اسے شلوار قمیض میں ملبوس دیکھ کر حیران رہ گیا، بہت خوش ہوا۔ ”آؤ، آؤ، اندر آؤ۔۔۔ تم آج میرے گھر پہلی دفعہ اس لباس میں آئے ہو۔“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔ ”زلفی! میرے بال دقت نہیں، نہ ہی اس وقت میں تفصیل سے بات کر سکتا ہوں۔ صرف چند لفظ کہنے کے ہیں، امید ہے کہ تم صبر و تحمل سے سونگے اور جو میں کہوں، بغیر سوال اور انکار، اس پر من و عن عمل کرو گے۔“

”بھائی پہلے بیٹھو۔ کیا کھڑے کھڑے بات کرو گے؟“ زلفی پریشان سا ہو گیا۔

زمین نفل مٹی تھی یا آسمان کھا گیا۔ اسے نہ ملنا تھا نہ ملی۔ پسینے سے شرابور، ہانپتے کانپتے پریشانی کے عالم میں واپس آئے۔ رکشے والے کو برا بھلا کہتے ہوئے کرایہ تمہا کر فارغ کر دیا۔

☆☆☆

بینک میں سب گھروالے جمع تھے، اندر داخل ہوتے ہی جیسے زلفی کی آنکھوں کے بند کھل گئے، دھاڑیں مارتے ہوئے رونے لگا۔ اس کے اس طرح رونے کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ قاسم، اس کی والدہ اور نین بھی پہنچ گئے۔ اسے بری طرح روتے دیکھ کر اس کی بہنیں اور والدہ بھی آبدیدہ ہو گئیں، سب تسلیاں دلا سے دیتے ہوئے رونے کا سبب دریافت کرنے لگے مگر اسے اک چپ لگی ہوئی تھی۔ شایان سے وجہ دریافت کی تو وہ بھی خاموش رہا۔ آخر اس کے والد نے بیزار ہو کر انتہائی سخت لہجے میں اسے ڈانٹا۔

”میں مر گیا ہوں، تمہاری ماں مر گئی ہے جو اس بُری طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہو۔“

زلفی آستین سے اپنی آنکھیں اور ناک پونچھتے ہوئے بولا۔ ”ہاں ہاں، میری ماں مر گئی ہے۔ میری اپنی ماں مر گئی ہے۔“ وہ میز پر ٹکریں مارنے لگا، وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ پھر باپ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پاگلوں کی طرح چیخ کر کہنے لگا۔ ”اچھا ہوا، وہ مر گئی۔ اسے مر ہی جانا چاہئے تھا، اسے جی کر کیا لیتا تھا۔ آپ نے اسے کیا دیا۔ دکھ تکلیفیں اور درد کی ٹوکریں۔ تین بیٹیاں۔ اور بیٹانہ پیدا کرنے کی پاداش میں طلاق۔ کیا کسی عورت نے بیٹانہ ہونے کی وجہ سے اپنے خاوند سے طلاق طلب کی ہے، دو سر شادی کی ہے۔۔۔ وہ مر کر مٹی پاک کر گئی اور آپ ہمیشہ اپنے ضمیر کی عدالت میں مجرم بن کر کھڑے رہیں گے۔۔۔ میں جا رہا ہوں اپنی مظلوم ماں کی میت کو مٹی دینے، اس سے معافی مانگنے، اپنی بہنوں کو کیچے سے لگانے، ان معصوموں کو دلاسا دینے۔۔۔“

طوفان گزر چکا تھا مگر اس کے طوفانی جھکڑوں نے اس بوڑھے درخت کو جڑوں سے اکھاڑ پھینک دیا تھا۔

☆☆☆

شایان، قاسم اور زلفی وہاں پہنچے تو دوپہر گزر چکی تھی۔ عورتیں چارپائی کے گرد بیٹھی بڑبڑاتے پڑھانے میں مشغول تھیں، باہر گلی میں دریاؤں پہ محلے دار بیٹھے کفن دفن کے لئے رقم اکٹھی کر رہے تھے۔ یہ بھی وہیں بیٹھ گئے، انہیں شاید یہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔۔۔ قاسم بولا۔

”بھائیو! مائی جی کے ہم وارث ہیں، سارا انتظام ہم خود کریں گے۔۔۔“

”میں بیٹھ نہیں سکتا، میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔“ شایان نے باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”کون ہے؟ اسے بھی اندر لے آؤ۔“ زلفی دروازے سے باہر جھانک کر رہ کر جانب دیکھنے لگا۔

”اس کے سامنے بات نہیں ہو سکتی لہذا تم یہیں میری بات سنو۔“

”تم جب تک بیٹھو گے نہیں، میں قطعی تمہاری بات نہیں سنوں گا؟“ زلفی بولا۔

”اچھا، ذرا ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں، ایک گلاس پانی منگو آؤ۔“

پھر باہر آکر پانی کا گلاس شمسہ کو دیتے ہوئے بولا۔ ”لو پانی پیو، اور سگریٹ کا پیکٹ بن کر رکھنا۔ میں دو منٹ میں آتا ہوں۔“

واپس آنے کے بعد دروازہ بھیڑ کر وہ زلفی کو بتانے لگا۔

”زلفی! تمہید اور لمبی بات کا وقت نہیں۔۔۔ تمہاری بڑی امی کا دو گھنٹے قبل انتقال ہو رہا ہے، مناسب سمجھو تو گھر والوں کو بھی بتا سکتے ہو لیکن تم فوراً وہاں پہنچو۔ تمہاری وہاں ضرورت ہے۔۔۔ دوسری بات، مجھے ابھی ایک گاڑی ڈرائیور کے ساتھ چاہئے اور تیسری بات یہ کہ باہر رکشے میں گھپٹ بیٹھی ہے لیکن تم ابھی اس سے مل نہیں سکتے۔ آخری بات یا ناکا ہے کہ میری غیر موجودگی میں تم کسی سے بھی ہم دونوں کے متعلق کوئی بات نہیں کرو گے ہی یہاں ہماری آمد کی خبر کسی کو ہونے دو گے۔ کچھ بھی معلومات نہیں دو گے، پولیس تفتیش کے لئے کسی وقت بھی یہاں آ سکتی ہے۔۔۔“

زلفی پاگلوں کی مانند منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں: آنسو، لبوں پہ چپ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ شایان اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے مزید بولا۔ ”میرے بھائی! میں تمہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں لیکن حالات ایسے ہیں کہ تفصیلات بیان نہیں کر سکتا، مجھ پہ بھروسہ رکھنا اور میری ان باتوں پر عمل کرنا۔“ وہ کھڑا گیا۔ ”میں خود ہی تم سے رابطہ کروں گا۔ جلدی گاڑی منگو آؤ۔“

زلفی ٹیلی فون کی جانب بڑھ گیا تو شایان باہر نکل کر رکشہ کے پاس آیا مگر گھٹت، یعنی شمسہ غائب تھی۔ وہ ہڑبڑا کر رکشے والے سے پوچھنے لگا تو اس نے بتایا کہ سواری نکل کر سامنے میں مسجد کی طرف گئی ہے۔ شایان نے زلفی کو آواز دے کر بلایا۔ وہ دونوں گلی کی جانب دوڑے، رکشے والا کرائے کی گلیز میں پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ادھر ادھر سب طرف دیکھا، کو سراغ نہ ملا۔ رکشے میں بیٹھ کر قریب، نزدیک کی سب سڑکیں، گلیاں کھجالیں ڈالیں مگر اسے

”برخودار! آپ کون ہیں۔۔۔؟“ ایک ہمسائے نے پوچھا۔

”جی، یہ ان کے سوتیلے بیٹے ہیں۔“ قاسم نے زلفی کی جانب اشارہ کیا۔ ”ہم دونوں کے دوست ہیں۔ کچھ خانگی غلط فہمیوں اور رنجشوں کی وجہ سے مائی جی علیحدہ رہتی تھیں۔ بہر حال، ہم اپنی کوتاہیوں پہ شرمندہ ہیں۔ آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔“

ٹھیکیدار حاجی نذیر نے مائی صاحبہ کی زبانی وصیت کے تحت ان کی اس پیش کش کو نہایت نرمی سے مسترد کر دیا۔ میت، غسل اور کفن لانے کے بعد دفنانے کے لئے تیار تھی۔ عورتیں سورۃ یٰسین تلاوت کر رہی تھیں۔

عورتوں میں ایک عورت منہ جسم ڈھانچے، چارپائی کی پٹی سے لگی خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ شاید وہ خاموشی کی زبان سے یہ شکوہ کر رہی تھی کہ ماں! میرا چند منٹ تو انتظار کر لیا ہوتا۔ اتنے میں مرنے والی کے بھائی رشتہ دار، روتے بیٹے پہنچ گئے۔ ان کے آتے ہی وہ عورت، معصوم بلکتی بچیوں کے سر پہ ہاتھ پھیر کر باہر نکل آئی۔

شام سے پہلے دفنا کر لوگ فارغ ہو چکے تھے۔ رمضان کا مبارک مہینہ، تھکے ماندے روزہ دار رسم دنیا بھرا اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ آس پاس، پڑوس والے دریوں پہ بیٹھے مرنے والی کی محرومیوں کا ذکر کرنے بیٹھ گئے۔ موت بھی کیا چیز ہے اور موت والا گھر اس سے بھی عجیب تر جگہ بن کر رہ جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دفنانے تک شاید کوئی خوف یا تکلیف کی گنجائش رہتی ہو اور اس کے بعد تو موت والے گھر میں کبھی ہوئی درمی بخت مباحث، چغلیوں، سیاسی موشگافیوں، کاروباری نفع و نقصان اور حالات حاضرہ کا اکھاڑا بن کر رہ جاتی ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے دنیا بھر کے موضوعات پہ کوئی سینار منعقد ہے۔ مرنے والی کے سب دور نزدیک کے رشتہ دار جمع تھے جو شاید اس کی زندگی میں کبھی اس کے نزدیک نہیں آئے تھے اور نہ ہی کسی نے کبھی اس کے مرنے جینے کی خبر لی تھی۔ اب سب چروں پہ منافقت کی ہمدردی اور افسوس سجائے دنیا داری کر رہے تھے۔ ان کے درمیان زلفی، قاسم اور اس کے گھر والوں کے ساتھ شایان اور ششی کرم الٹی وغیرہ بھی بیٹھے ہوئے تھے چپ چپ خاموش۔ رشتہ داروں کی کٹھی میٹھی باتیں سن رہے تھے۔ مرنے والی کے بھائی، رشتہ داروں نے ان کی آمد اور موجودگی پہ ناک منہ چڑھایا اور کچھ تلخی کی باتیں بھی شروع کی تھیں مگر ادھر سارے خواہ چپ شاہ کا روزہ رکھے بیٹھے تھے۔ اسی صبر اصراری اور ذہنی دباؤ میں پرے کی درمی لپٹ ل گئی۔ نگہت کے ماموں، اس کی دونوں بہنوں اور گھر کا سالان لاد کر واپس چلے گئے، مکان خالی کر دیا گیا۔ زلفی کا باپ اس دن سے چپ چپ تھا، زلفی نے شاید کچھ دے کر اس کے منہ کو

زخمی کر دیا تھا۔

ادھر سے جیسے تیسے فرصت ملی، ہوش درست ہوئے تو پھر نگہت کی پریشانی لاحق ہوئی۔ چارپانچ روز سے شایان مکمل طور پہ ارد گرد کے حالات سے بے خبر تھا، صرف ششی کرم الٹی سے رابطہ تھا۔ ظہوری شاہ کے دفتر کے باہر ابھی تک پولیس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ مس عاشی، عملے سمیت پولیس کی حراست میں ہے۔ حاجی رجب بیگم اپنے چلوں چانٹوں کے ساتھ کہیں روپوش ہو گئے ہیں، سوڈیوال کا ڈیرا بھی پولیس کے قبضے میں ہے اور بلا ہنگامائی کے مزار پر جھاڑو پھری ہوئی ہے۔ ان لوگوں کے دفتروں اور ڈیروں سے پولیس کوئی ایسی کام کی چیز برآمد نہ کر سکی تھی جو اس کیس کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوئی۔ پولیس ابھی تک ہوا میں تیر چلا رہی تھی۔ سخت پہرے میں ان سب کو دالٹن کی ایک فوجی ہڈک میں جسے ہنگامی طور پر ہسپتال وارڈ میں تبدیل کیا گیا، منتقل کر دیا گیا تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹر ان کے خون، پیشاب، لعاب اور غلاظتوں کے مختلف تجزیے کر رہے تھے۔ پولیس کو ابھی تک ہمارا بی ادرازی استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اس لئے ابھی تک کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی سوائے اس کے کہ شہزاد ان کے پاس ایک آدھ دن ٹھہرا تھا، پرانے دوستوں سے مل کر وہ کراچی چلا گیا۔ کوئی نشہ آور دوا وہ ضرور ساتھ لایا تھا اور یہ بیماری اسی کا نتیجہ ہے۔ دیتال جان کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔

شایان اور شمسہ کا نام ابھی تک درمیان میں نہیں آیا تھا۔ پولیس گرفتار ہونے والے لے سے مزید اور کچھ اگلوں کے لئے تھڑ ڈگری آزمایا جا رہی تھی مگر ڈاکٹر ان کی خطرناک حالت کے پیش نظر اجازت نہیں دے رہے تھے البتہ پولیس کی خفیہ طور پہ تفتیشی سرگرمیاں کی تھیں۔ پولیس کی مجبوری ہوتی ہے کہ اگر کوئی کیس ایک نقطے پہ آکر ٹھہر جائے یا آگے بڑھ کر کوئی رخ اختیار نہ کرے تو وہ تھسی پٹی لکیروں کو پھر سے پینٹا شروع کر دیتی ہے اور یہ ان کی حقیقت ہے کہ اس طرح وہ کچھ نہ کچھ نکلنے میں ضرور کامیاب ہو جاتی ہے۔ اسی سولے کے تحت پولیس نے ایک بار پھر ظہوری شاہ، حکیم جمالی اور مس عاشی کے دفتروں، ڈیروں کو کھنگالنا شروع کر دیا۔ اس بار الماریوں، میزوں کے ڈبل تہہ دار پینڈوں اور دیگر خانوں سے بہت سی تصویریں، بلیو پرنٹ اور ویڈیو فلمیں مل گئیں جن میں بے شمار مرد اور عورتیں ناقابل بیان حالتوں میں دکھائے گئے تھے۔ فلموں اور تصویروں میں ایک لڑکی جو مختلف لہ لکھائی گئی، وہ یقیناً ”شمسہ“ تھی۔ ایک قلم میں شمسہ کے ساتھ شایان بھی تھا۔ کئی اور لہ لکھائی کے ہتھ چڑھ گئے تھے، زنانے جھوٹے بھی۔ پولیس بھی جانچی تھی کہ یہ بلیک

والہ کا نہیں، ایک جوان لڑکی ہے۔ وہ سامنے گلی میں مسجد کی جانب تیز تیز قدموں سے چلی گئی، گریٹ کا پکٹ اور سر کے مونڈھے ہوئے بال ہاتھ میں ہی تھے۔ مسجد کے ساتھ والی پتلی سی گلی سے نکل کر وہ سڑک پہ آگئی، وہاں سے رکشہ پکڑا۔ وہ مغل پورہ اپنی ایک سیٹیلی پروڈین گڈو پر اس جارہی تھی۔

اس کرچن لڑکی گڈو سے اس کی دوستی ایک گارمنٹ فیکٹری میں چند ہفتوں کی ملازمت کے دوران ہوئی تھی۔ جیکھے نین نقش، سانولی سی رنگت، چھریے سے سراپے والی یہ آزاد لڑکی بھی منشیات، سگریٹ، شراب اور عیش و عشرت کی دلدادہ تھی۔ ان دونوں میں بس آج کا ہی فرق تھا۔ نگہت عزت وقار اور محنت سے روزی کمانا چاہتی تھی جبکہ گڈو کی نظر عزت و عصمت کسی چیز یا کام تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ جب عورت بازار میں کمانے کے لئے جاتی ہے تو پھر اسے شرم و حیا، عزت و عصمت کی چادروں کو لپیٹ کر گھر ہی چھوڑ آتا ہے۔ ناک سیدھے سیدھے یا بازو گھما کر پکڑو، پکڑنی تو ناک ہی ہوتی ہے۔ وہ چند دنوں یا اس سے زیادہ کہیں نہیں نکلتی تھی۔ ایک دو ہفتے شرافت محنت سے کام کرتی، پاک دامنی کا رنگ رہا کرتی۔ پھر آہستہ آہستہ مالک، منیجر یا سپروائزر، جو بھی اس کے مطلب کا ہوتا اس سے بات بڑھاتی اور کھانپتی، چوس چاٹ کر پھر کسی نئی جگہ نکل جاتی۔ کوئی کاٹھ کاٹو ل جاتا تو بلیک بھی کر لیتی۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اس میں کچھ نمایاں خوبیاں اور اچھائیاں بھی ہوتی تھیں۔ اتوار کے دن وہ باقاعدہ سر ڈھانپ کر چرچ جاتی۔ انڈیا کی سسکل شدہ و سکی، بھنے ہوئے اور آلو کے کریس ٹونگتی رہتی۔

گڈو کا بوڑھا ریشٹرو باپ جو ریلوے میں لوکو موٹور ایئر تھا، دسی ریم کی ہلکی چسکیاں، افرنچ مو سیکار کلیرن گوز کی دھنیں گنگنا تا رہتا۔ ماں مرچلی تھی، شادی شدہ بھائی، ریلوے بڈیں ملینک تھا۔ ریلوے کا دو کمروں والا یہ کوارٹران کے باپ کی ملازمت کے زمانے کی تحویل میں تھا، چند کوارٹر آگے اس کا بھائی بھی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ایک ریس مقیم تھا۔ گڈو دل کی بڑی کھری اور نرم تھی، جس کو دوست کہہ دیتی اس کی خاطر نابازی لگانے سے دریغ نہ کرتی۔ درمیانہ، پریشان حال، اپنوں بیگانوں کی ٹھکرائی اور ستائی لڑکیوں کے لئے وہ ایک میساجے کم نہ تھی۔ داسے، درے، قدے، سنخے، ہر لحاظ سے ان سے دودھ کرتی۔۔۔ نگہت کی کہانی اور پتاسن کر اس کی دوست بن گئی تھی بلکہ اسے نئے اس نے لگایا تھا۔ تعلقات اور قربت میں اضافہ ہوا تو گڈو نے اسے بھی اس ڈگر پہ چلانا ماہر وہ خود چل رہی تھی مگر نگہت اس کے ہتھے نہ چڑھی، اس کے باوجود کہ وہ کئی بار اس

میل کی ضرورت کی فلمیں ہیں مگر یہ ایک، علیحدہ کیس تھا، موجودہ کیس کو اس برآمدگی سے کہ تقویت نہیں ملی تھی۔ پولیس نے پٹ کر پٹی ہوئی لکیر کو پھر ایک بار پیٹا۔ جس طرح پیارہ صرافہ بازار کی موریوں نالیوں کا گلبہ اس وقت تک چھانٹتے اور نتھارتے رہتے ہیں جب با اس کا وجود ختم نہیں ہو جاتا، اسی طرح پولیس بھی کیس کو اس وقت تک نہیں چھوڑتی جب تک کہ مکایا مر مرانہ ہو جائے۔ ملزم موجود، فلمیں اور تصویریں حاضر، وہ کیسے چھوڑتی تفتیشی ماہرین نے فلموں کے ایک ایک فریم کو ایکسپوز کر لیا، ایک ایک چہرے کو واضح اٹار کیا۔ ان تصویروں کو سامنے رکھ کر ان لوگوں کی تلاش شروع کر دی۔ پولیس کے اپنے تجربہ غیر سرکاری ٹاؤٹ بھی میدان عمل میں آ گئے۔ ایک مخبر جوان کی اکثر رنگ ریلوں میں شام واجب ہوتا تھا، انعام کے لالچ میں اس نے کئی چہروں کو پکڑا دیا۔ مارکیٹ کا سابق چوکیدار اور خاکروب بھی بکنا شروع ہوئے۔ اسی شام منشی کرم الہی اور تینوں ملازموں کو بھی پولیس۔ تفتیش کے لئے حراست میں لے لیا۔ پولیس نے ان سے شایان اور شمسہ کے متعلق پوچھا پہلے تو وہ لاعلمی کا اظہار کرتے رہے مگر جب پولیس نے اس کے والد کو پکڑنے کی دھمکی دی انہوں نے اس کے ماموں کا پتہ بتا دیا۔ پھر صبح صبح شایان بھی ان کی حراست میں تھا۔ زلفی اور قاسم اب ایک اور نئی افتاد میں پھنس گئے۔ شیخوپورہ خبر پہنچی تو اس کے والدین بھی بھاگے بھاگے لاہور پہنچ گئے۔ شایان تو پہلے ہی ذہنی طور پہ اس گرفتاری کے لئے تیار تھا، زلفی اور شایان کو اصل فکر تو نگہت کی تھی جس کے بارے وہ کچھ نہیں جانتے تھے کہ وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہے، زندہ بھی ہے یا کہیں خودکشی کر چکی ہے؟ حالات ایسا رخ اختیار کر چکے تھے، کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔۔۔ زلفی نے بہت کوشش کی کہ وہ شایان کو گرفتاری کی وجہ جان سکے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ اس کو تفتیش کے لئے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ چند روز چکر کاٹنے گزر گئے۔ وکیلوں کے ذریعے کافی دھڑ دھڑ اور مخصوص ذرائع استعمال کرنے کے بعد صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ معاملہ سنگین نوعیت کا ہے۔ اصل مجرم مارے گئے ہیں، گرفتار شدگان صرف تفتیش کی غرض سے پابند ہیں اور ان کا گرفتاری ناقابل ضمانت ہے۔ اخباروں میں بھی کچھ اس طرح کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔

\*\*\*

اس دن جب وہ نگہت کو رکشہ میں چھوڑ کر زلفی سے باتیں کر رہا تھا، نگہت بھی بغیر سوجھے بھاگنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اپنی ظاہری باطنی حالت، اچانک پولیس کی ریڈ اور ماں کی باہلی موت نے اسے کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ رکشہ ڈرائیور کو کیا خبر کہ بیچے

کی مالی مدد کر چکی تھی۔ ایک دن وہ نگہت کے طلب کرنے پر رقم دیتے ہوئے مشورہ دیتے مگر

”اگر تم بچی رہو تو معجزہ ہو گا مگر میرا تجربہ اور مشاہدہ کہتا ہے کہ جن حالات اور جرم معاشرے میں تم باعزت زندہ رہنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو، بہت جلد تم تھک لوٹ کر پڑو گی۔ اس صورت میں اگر تم اٹھنا بھی چاہو گی تو جو ہاتھ تمہیں سہارا دے کر اٹھائیں گے، وہ ہاتھ تمہیں تمہاری ہی نظروں میں ذلیل بھی کر دیں گے۔ بے بی! وقت ضائع مت کرو، ہذا ازمنی۔ بیمار مایں اور معصوم بہنوں کو مصائب کی صلیب سے اتارنے کے لئے اپنی نام نہان فلولہ و حیا کا فرسودہ لبادہ اتار دو۔ ضرورت، مجبوری اور زندہ رہنے کے مقصد کے سامنے یہ کچھ بے الفاظ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس طرح تم بوڑھی ماں کی زندگی، بہنوں کا مستقبل اور اپنا وقت بچا سکو گی۔ تم نہ چاہو تو میں تمہیں مجبور بھی نہیں کروں گی اور اگر میرا مشورہ مان لو تو عیش و عشرت اور زندگی کے سارے سامان تمہارے قدموں میں ڈھیر ہوں گے۔ دیے تم شاید جانتی تو ہو گی کہ یہ کرارے کرارے نوٹ اور وہ سارے روپے جو تم ”وقتاً فوقتاً“ مجھ سے لے چکی ہو اور لے رہی ہو، یہ سب کہاں سے آتے ہیں۔ کسی فیکٹری میں مشین چلا کر پرائڈے، آزار بند بنا کر؟ نہیں، یہ ساری میری کمائی ہے، ہتھ محنت سے تولہ اور شہر میں دیکھنوں کا کرایہ بھی پورا نہیں پڑتا۔ یہ گھر کا خرچہ، پلایا کے سگار اور رم، بھابی بچوں کے لئے تحائف، کپڑے، جیولری، پرفیوم۔ مری اور بھورین۔ بنو! سمجھدار بنو۔“

اس لمحہ نگہت اس کے دیئے ہوئے کڑکڑاتے ہوئے نوٹ واپس کر آئی تھی مگر آج کے عرصے کے بعد وہ پھر اسی دروازے پر رکشہ روکے، بیٹھی سوچ رہی تھی۔ بہت عرصہ پہلے گڈو کی کہی ہوئی باتیں یاد آرہی تھیں۔ سرکاری یا نیم سرکاری ملازموں کے حلیوں کی طرح ان کی سرکاری رہائش گاہوں کی حالتیں بھی کبھی نہیں بدلتیں۔ تادقتیکہ وہ ملازمتوں سے ریٹائرڈ یا معطل نہ کر دیئے جائیں۔ لو کو مکینک کی زنگ آلود نیم پلیٹ، شکستہ سے دروازے پر لگی تھی۔

”آپ نے یہاں اتنا بے یار کتنا ہے؟“ رکشہ ڈرائیور پوچھنے لگا۔

”ہاں، ڈرائیور کو۔“

نگہت نے بمشکل اترتے ہوئے جواب دیا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر گڈو ہی دروازے پر نمودار ہوئی۔ نگہت تو مردانہ شلوار قمیض پہنے، منڈھے ہوئے سر پہ چادر اوڑھے ہوئے کھانے دیکھے ملے بھی ایک زمانہ گزر چکا تھا چنانچہ نہ پہنچاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کس سے ملنا ہے؟“

”گڈو! میں نگہت ہوں۔۔۔ رکشے والے کو فارغ کرو، پھر بتاتی ہوں کہ مجھے کس سے ملنا ہے۔“

وہ چھامارتے ہوئے وہیں اسے انگریزی میں گالیاں دینے لگی اور بولی۔

”تم اس وقت۔۔۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔؟“

وہ اسے گھسنیتی ہوئی اندر لے آئی۔ بوڑھا قیصر جیسے بجھا ہوا سگار انگلیوں میں دبائے صحن میں ایک جھولنے والی کرسی پر خراٹے لے رہا تھا۔ رکشہ والے کو فارغ کرنے کے بعد اسٹیشن گلی کے دو بڑے مگ اور بسکٹ سامنے دھر کر دونوں دکھڑوں کی کتاب کھول کر بیٹھ گئیں۔ گڈو انہیں پھاڑے ہوئے سنتی جا رہی تھی اور وقفے وقفے سے ”او، مائی گاڈ!“ بھی کرتی جا رہی تھی۔ ساری رات سناتے سناتے زبان، سنتے سنتے کان، جاگتے روتے روتے آنکھیں اور بیٹھے بیٹھے کمر، سب کا برا حال ہو گیا۔ صبح ہوئی تو یہ دونوں ناشتہ کر کے، منہ سرپیٹے ساندے آگئیں۔ علوم ہوا کہ اس کی بہنوں کو اس کاموں لے گیا ہے۔ کھڑے کھڑے درد و یار پہ حسرت کی غرغالی۔ گڈو نے اسے دلاسا دیا کہ چلو اچھا ہوا، ہمیں محفوظ جگہ پہ چلی گئیں۔۔۔ اداس اداس دلوں واپس کو اڑ چلی آئیں۔

☆☆☆

رفضان المبارک، رحمتوں کا مہینہ! شیطان پابہ زنجیر، بلکہ اس دنیا میں ہی جہنم کے شعلوں کا جھلس رہے تھے۔ والٹن میں فوجی بارک کا جہنم، ارد گرد پولیس کا زبردست پہرہ، مختلف رنگاری، نیم سرکاری حساس اداروں کے ذمہ دار افراد، ڈاکٹر، ایسپولینس گاڑیوں کی خفیہ آمد و رفت، ارد گرد دور دور تک جراثیم کش ادویات اور چونے کا چھڑکاؤ جیسے یہ آفت زدہ علاقہ۔۔۔ اندھے شیشوں کی ایک گاڑی اس ایریا میں نہایت خاموشی سے داخل ہوئی۔ ڈیلاس ۷ ڈاکٹروں کا ایک چھ رکنی وفد آیا تھا، ان کے ساتھ کچھ مخصوص آلات اور مشینیں تھیں۔ با اور بیرک کو مقامی انتظامیہ کی مدد سے ایک اچھے خاصے آپریشن تھیٹر میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان کے پہنچنے کے ایک گھنٹہ بعد ایک متروک ایڑی پہ ایک ٹرانسپورٹ طیارہ لینڈ ہوا، بالکل فریز یونٹ میں دو محفوظ لاشیں اتار کر آپریشن تھیٹر میں پہنچادی گئیں جہاں پہلے ہی لاش موتیاں جان کی پڑی ہوئی تھی جو آج صبح ہی چھ بجے ایڑیاں رگڑتے ہوئے اصل ل ہوئی تھی۔ باقی مریض بھی قریب قریب جان کنی کے عالم میں زندگی کی آخری سانسیں بیٹھ رہے تھے۔ نشہ نہ خوراک، مختلف میڈیکل معائنوں کے عذاب نے انہیں بے حال کر

کا تھا۔ ہسپتال، دماغی شفاخانے، رنای اوارے، ادھر ادھر ساری جگہیں جہاں کہیں اس کی ہرجوگی کا شبہ ہو سکتا تھا وہ سب چھان مارے مگر وہ کہیں بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ پولیس کے لئے اس کو قابو کرنا بہت ضروری تھا۔ بیانات اور واقعات کی روشنی میں یہ بات تو پولیس جان چکی تھی کہ عامل ظہوری شاہ کے دفتر چھاپے کے وقت شمسہ اوپر فلیٹ میں اپنے تین نگران کمروں کے ساتھ موجود تھی، چھاپے کی ہڑبونگ کے بعد اسے وہاں سے نکالا گیا۔ مارکیٹ میں عین سپاہیوں کے بیان کے مطابق دو تین کھسرے ضرور یا ہر گئے تھے مگر ان میں لڑکی کوئی نہیں تھی۔ اب سوال یہ اٹھتا تھا کہ شمسہ کہاں گئی، وہ تو ذہنی طور پر معذور تھی، اپنی مدد آپ نہیں کر سکتی۔ وہ کون ہے جس نے اسے وہاں سے نکالا اور وہ اس وقت کہاں ہے؟ اس معرکہ کو حل کرنے کے لئے پولیس ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

شلیان کے والدین اپنی تین بیٹیوں کے ہمراہ نین تارا کے گھر بڑے ہوئے تھے، بار بار ام اور زلفی کو لے بیٹھ جاتے کہ کسی بڑے سے بڑے وکیل سے مشورہ کرو۔ اکلوتا بیٹا تھا، بڑی ماں کو کسی کل چھین نہیں آتا تھا۔ یہ بچارے پریشان حال، جو بس اور اختیار میں تھا، کر رہے تھے۔ ادھر زلفی خود بڑے عذاب میں مبتلا تھا۔ گھر میں والد صاحب کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ کھانا پینا برائے نام رہ گیا۔ کسی سے بات نہیں کرتے تھے، ہر وقت خلاؤں میں گھومتے رہتے۔ مصیبت پہ مصیبت۔۔۔ بڑی امی مر گئیں، ادھر نگہت ہاتھ میں آئی ہوئی نکل گئی۔ اب پتہ نہیں کہاں اور کس حال میں ہو۔ جان سے پیارا بھائی دوست شلیان بھی لڑتا۔۔۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اوپر سے رمضان کا مہینہ۔ پیلا بلک رنگ، جیسے کسی نے جسم کا سارا لونچوڑ لیا ہو۔۔۔

اگلے روز شام کی نماز کے بعد اچانک زلفی کے دماغ میں جیسے بجلی کا ایک کوند اپکا، باباجی کا بل آیا۔ شلیان کے والد صاحب کو لے کر وہ پان والی دوکان پہ آیا۔ باباجی کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ مسجد میں ہیں۔ مسجد میں پہنچے تو وہ سامنے ہی بیٹھے ہوئے نظر آ گئے۔ سلام کر کے دونوں لٹ بیٹھ گئے۔

”فرمائیے، کیسے آنا ہوا۔۔۔؟“ انہوں نے بڑی شفقت اور اپنائیت سے پوچھا۔  
 ”باباجی! میرا نام ذوالفقار ہے۔ یہ میرے پھوپھا ہیں، شلیان صاحب کے والد۔ وہ آپ سے دو بار مل چکا ہے۔۔۔ بس! آپ کی زیارت اور دعا کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ ہم بہت شکر مند ہیں۔۔۔“

”آپ ممبر سے کام لیں، اللہ بہتر کرنے والا ہے۔۔۔ تراویح کے بعد آپ سے بات ہو

دیا ہوا تھا۔ ان کے جسموں کے نازک حصے گھنا سڑنا شروع ہو چکے تھے۔ زبانوں پہ چھلے، ہونٹ سرخ ہوئی بن کر سوج گئے تھے۔ بات کرنا تو درکنار، ہلنے چلنے سے بھی معذور تھے۔ پولیس ابھی تک ان سے کوئی قابل رفت بیان نہیں لے سکی تھی۔ ان لوگوں میں حساس اور خطرناک قسم کے مریض جن میں حکیم جمالی، ظہوری شاہ، استاد قربان، استاد شفو، رفیق ڈوگر اور مس عاشی بھی شامل تھی، انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں تھے۔ اس یونٹ سے ہٹ کر ایک بیرک جو کسی زمانے میں شہری دفاع کے رضا کاروں کی ٹریننگ اور عارضی رہائشی کے کام آتی تھی اور جس میں ہوٹل کی طرح علیحدہ علیحدہ کمرے تھے ان میں شلیان، منشی کرم الہی، دو ملازم ظہوری شاہ اور حکیم جمالی کے ملازم، استاد شفو کے چیلے چائے، گنئی چوک اور شاہی محلے کے چند بد معاش، موتیاں جان کی دو جوان، ہمیش اور بھائی، حاجی راجی بیگم کے چند شاگرد کھسرے اور چند ادھر ادھر کے لوگ کبوتروں کی طرح الگ الگ کمروں میں دیکے بڑے تھے۔ ہر دروازے پہ پرہہ تھا، بات چیت کی ممانعت تھی۔ پولیس باری باری سب سے تفتیش کر رہی تھی، میڈیکل یونٹ والے ان کے مختلف ٹسٹ لے رہے تھے۔ ابھی تک کی رپورٹوں سے ان لوگوں میں کوئی خطرناک علامت نہیں پائی گئی تھی۔ پولیس کی ابھی تک کی تفتیش سے بھی اس خیال کو تقویت پہنچتی تھی کہ یہ سارے لوگ ”شمال بابا“ ہیں جو مختلف وجوہ کی بنا پر ان کے ساتھ تھے، اصل مہرے وہی ہیں جو مکافات عمل کی بساط پہ لٹے بڑے ہیں۔ یہ سب کچھ اتنا خفیہ تھا کہ گرفتار شدگان کے لواحقین، پریس، یہاں تک ٹیلی سطح کے پولیس افسران کو بھی خبر نہیں تھی۔ کچھ اخبار والے اپنے خاص ذرائع سے چھوٹی موٹی خبر لے اڑے تھے لیکن اصل معاملے سے عوام اور پولیس دونوں بے خبر تھے۔

پولیس شمسہ کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ مس عاشی اور ظہوری شاہ کے دفاتر سے برآمدہ ریکارڈ، ویڈیو فلموں اور تصویروں کے البموں میں شمسہ کا وجود موجود تھا۔ شمال تفتیش سبھی افراد نے شمسہ کی نشاندہی کی تھی۔ پولیس کی نظر میں وہ سب سے زیادہ خطرناک مریضہ تھی جو ریکارڈ کے مطابق ہر رات مختلف لوگوں کے لئے بدکاری کا سبب بنتی تھی۔ منشی کرم الہی نے بھی نشاندہی کر دی تھی، یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ یہ مرض شمسہ سے انتہائی زیادتی کی وجہ سے سب لوگوں تک پہنچا ہے۔ اس سارے کھیل میں کئی مردوں کے مقتل صرف تین ہی عورتیں سامنے آتی تھیں۔ موتیاں جان تو جان سے چھوٹ گئی، وہ صرف شہزادہ تک محدود رہی۔ مس عاشی بھی شہزاد کی حد تک رہی اور باقی بچی شمسہ! تو اس بیماری کے ساتھ غریب کی جو رو والا حساب تھا۔ اس کا دماغی طور پہ ایثار مل اور منشیات کا عادی ہونا بھی منظر آ

گی۔

نماز ختم ہوئی تو وہ انہیں ایک کونے میں لے کر بیٹھ گئے۔ شایان کے والد بسکیر سے رونے لگے۔ وہ ان کے کندھے پہ شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے فرماتے لگے۔

”شکم بندی، فکر مندی، شب بیداری اور آہ دزاری۔۔۔ چاند کی دید پہ ہی عید ہوتا ہے۔ سینوں سے سینے ملتے ہیں، خوشیوں کے پھول کھلتے ہیں۔۔۔ جائے اللہ بہتر کرے گا۔“ زلفی نے مزید کچھ کہنا چاہا۔

”بس، آپ تشریف لے جائیں۔۔۔“ انہوں نے جیسے قطعیت سے کہا۔

☆☆☆

گڈو نے نگہت کے آتے ہی اپنی تمام مصروفیات وقتی طور پر ختم کر دی تھیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بنیادی تعلیم ہی یہی تھی کہ دکھیوں، بیماروں، لاچاروں اور مجبوروں کی داری کی جائے۔ اپنی زندگی میں وہ انہی بے کس، ٹھکرائے ہوئے، دھنکارے ہوئے لوگوں کے درمیان رہے اور بلا تکلف و تردد، امتیاز و احتیاط ان کے رستے ہوئے ناسوروں پر دست مبارک رکھتے رہے اور انہی کی خاطر مصلوب ہو گئے۔ آج بھی دنیا میں دکھی انسانیت کی خدمت کے لئے جتنے شفاخانے، انسانی بہبود کے ادارے مسیحی قوم نے بنائے ہیں اتنے تمام اقوام عالم کے ہر مسیحی مذاہب نے نہیں بنائے۔ دنیا کے نقشے پہ ایسی کوئی جگہ آپ کو دکھائی نہیں دے گی جہاں ان کے بے لوث خدمت گار، بلا تخصیص و امتیاز مذہب و نسل، رنگ و زبان انسانیت کی خدمت میں جڑے ہوئے نظر نہ آئیں۔ یہ یسوع مسیح کی تعلیمات کا ہی اثر ہے کہ انسانوں کے علاوہ اللہ کی باقی مخلوق چاہے وہ بظاہر حقیر سے حقیر جانور ہی کیوں نہ ہو، اہم جاندار جان کر ان کے دل و جان سے خدمت اور حفاظت کرتے ہیں۔ ان کی بہبود کے لئے بڑے بڑے ادارے ٹرسٹ، ہسپتال اور ہسپتال بنا رکھے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کام جنہیں دوسرے لوگ حقیر سمجھتے اور جنس خیال کرتے ہوئے اپنے ہاتھ سے کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں، ان کے لئے یا بھی انسانیت کی خدمت کا ایک حصہ ہیں جنہیں بلا جھجک و خفت سرانجام دینے میں ان مانتے ہیں۔ بل تک نہیں آتا۔

نگہت کے مرض کی سنگینی کا گڈو کو اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کی زبانی اور اخبارات کی وسائل سے اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پولیس اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اسی احساس کے نظر اس نے اس کی حفاظت اور علاج کا پروگرام بڑی احتیاط اور انتہا رازداری سے ترتیب دیا تھا۔ گو اس میں بڑا رسک تھا، وہ خود بھی پھنس سکتی تھی مگر کیا جائے کہ ایسے چیلنج تھم۔

نہات میں اس کی کھوپڑی الٹی ہو جاتی تھی۔ وہ کسی کو مصیبت میں دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ عجب تواس کی جان، اس کی دوست، اس کی ہواز تھی۔ رازداری اور احتیاط کے پیش نظر کسی اور کو تو کیا، اپنے ڈیڑی اور بھائی بھالی تک کو اس نے ہوا نہ لگنے دی، خود ہی جی جان سے اس کی رازداری اور علاج پہ جٹ گئی۔ باباجی کے سمجھ میں نہ آنے والے عجیب و غریب علاج پہ اسے ہل تو ضرور تھا مگر نگہت کے یقین اور اصرار کو دیکھتے ہوئے بادل خواستہ تیار ہو گئی۔ تمباکو کی آمیزش سے دس سیر پانی پکایا گیا، ہدایت کے مطابق وقفے وقفے سے پلانا شروع کر دیا۔ ادھر نیم کے پتے اور اس کے مونڈے ہوئے بال جلا کر راکھ کئے، روٹی کے چھاپے پہ چھڑک کر اسے استعمال کراتی رہی۔ ہر آدھ گھنٹے بعد بدبو، سرائند، پیپ۔۔۔ نگہت کڑوا عجیب سی بدبو والا بد مزہ پانی پی لے کر پیلی پچھک ہو رہی تھی البتہ راکھ کا استعمال قدرے سکون پیدا کرتا۔ سولہ پہر، سولہ صدیوں پہ پھیل گئے تھے۔ نیند نہ آرام، جھولنے والی کرسی پہ نیم دراز نگہت بے سدھ پڑی تھی اور وہ کسی سبب کرتی ہوئی گڈو اسٹول پہ اکڑوں بیٹھی، پاؤں سے اس کی کرسی کو جھولادے رہی تھی۔

چوتھے روز کے چمکتے ہوئے سورج نے گڈو کے آنگن میں اجالا کیا تو نگہت کسی معصوم بچے کی مانند بڑے سکون سے کرسی کے بیک پہ ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ گڈو جو اڑتالیس گھنٹوں سے جاگ رہی تھی، اسے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ راکھ باقی تھی، پانی ختم ہو چکا تھا۔ گڈو آہستہ سے اٹھی۔ پتلی سی ادنی چادر اس کے گھٹنوں پہ پھیلا کر ماتھا چوما اور صوفے پہ راز ہو گئی۔۔۔ دوپہر سے ذرا پہلے نگہت بیدار ہوئی، سامنے صوفے پہ گڈو سو رہی تھی لبوں پہ میٹھی سی نرم مسکراہٹ لئے جیسے کوئی سہانا خواب دیکھ رہی ہو۔ کرسی کی بیک پہ سر ٹکائے وہ کلن دیر تک اپنی مسیحا کو دیکھتی رہی۔ اسے محسوس ہوا کہ اب اس کی تکلیف میں وہ شدت نہیں رہی جو پہلے تھی، کمزوری اور نقاہت ابھی تک باقی تھی لیکن قدرے سکون اور آرام محسوس کرتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھی۔ آہستہ آہستہ سرک کر وہ ہاتھ روم میں چلی گئی تبھی باہر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ہڑبڑا کر گڈو اٹھی۔ ادھر ادھر دیکھا، نگہت کی کرسی خالی تھی۔ ہاتھ روم میں لپکی کے چھپا کپوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

”نگہت! طبیعت ٹھیک ہے نا۔۔۔؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، میں آ رہی ہوں۔۔۔“ نگہت نے جواب دیا۔

دروازے پہ اس کا ڈیڑی تھا، کھانے پینے کا سامان اور اخبار لے کر آیا تھا۔ یہ چیزیں گڈو کو ہانک کر دیں سے چلا گیا۔ اخبار میں آج پہلی بار نمایاں طور پر اس کیس کے بارے میں تفصیلات

لکھی تھیں۔ گڈو اخبار لے کر بیٹھ گئی۔ پھر اچانک اٹھ کر کھڑی ہو گئی جیسے صوفے پہ لگے کسی طاقتور اسپرنگ نے اسے اچھال دیا ہو مگر وہ اسپرنگ نہیں تھا بلکہ نگہت کی تصویر تھی۔ یہ تصویر پولیس نے شاید ظہوری شاہ یا حکیم جمالی کی کسی الہم سے حاصل کی تھی، قدے دھندلی لیکن واضح۔ پولیس نے عوام کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر اس لڑکی کو تلاش کرنے یا اس کے بارے میں کسی قسم کی کوئی اطلاع فراہم کرنے کے لئے اپیل کی تھی۔ اطلاع بہم پہنچانے والوں کے لئے انعام، رازداری اور تعاون کے علاوہ مکمل حفاظت کی ضمانت دی گئی تھی۔ خبردار تصویر دیکھ کر گڈو بھی حیرت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اتنے میں نگہت بھی غسل خانے سے فارغ ہو کر اس کے سر پہ آکھڑی ہوئی، گڈو نے اخبار پلیٹ کر گود میں رکھ لیا۔

”اخبار پڑھ رہی ہو۔۔۔ کوئی خاص خبر؟“

”پہلے یہ بتاؤ، تمہاری صحت کیسی ہے۔۔۔؟“ وہ اسے آرام کرسی پہ بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”بہت بہتر۔۔۔“

”یہ تو بہت بڑی خوشخبری ہے، ٹھیکس گاڈ!“

”زبردست بھوک لگی ہے، فوراً کچھ کھلاؤ۔۔۔“

وہ اخبار سمیت باورچی خانے میں جانے لگی تو نگہت نے کہا۔

”یہ اخبار تو مجھے دیتی جاؤ۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ پہلے کچھ کھانی لو، پھر۔۔۔“

کھانے کے بعد گڈو کہنے لگی۔

”دیکھو، نگہت؟ گاڈ نے تمہیں صحت دی اور تمہارے یقین نے تمہیں نئی زندگی دی۔۔۔“

نگہت مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ ”اللہ کالا کھ لاکھ شکر ہے اور گڈو! تمہارا احسان۔۔۔!“

”میں سچ میں کدھر سے آگئی۔۔۔؟“ گڈو بولی۔

نگہت اس کے گلے میں بانیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”تم بہت ہی گریٹ ہو گڈو! بہت ہی گریٹ۔۔۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔ کافی کام سامنے رکھ کر گڈو نے اخبار اس کی جھول میں پھینک دیا۔ اپنی تصویر دیکھ کر حیرت اور خوف سے نگہت کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”لرزنے لگی، مہینے کی آواز میں پوچھنے لگی۔

”اب کیا ہو گا گڈو۔۔۔؟“

گڈو اخبار پر بے ہمتی ہوئی تسلی دینے لگی۔ ”ڈونٹ وری، بے بی! کچھ بھی نہیں ہو گا بلکہ مارے لئے اور ایزی ہو گیا ہے۔۔۔“

”۔۔۔ ایزی ہو گیا ہے یا قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟۔۔۔ یہ اخبار صرف ایک ہی نہیں چھپا، لوں لوگ یہ سب کچھ پڑھ چکے ہوں گے۔ ان میں میرا باپ، ماموں، بہنیں، بھائی اور شاید بیان بھی ہو گا۔ لوگ نفرت سے میرا ذکر کر رہے ہوں گے، مجھ پہ لعنیں بھیج رہے ہوں گے، یہ تلاش کر رہے ہوں گے۔“ وہ رونے لگی۔

گڈو غصے سے کانپتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ ”دیکھو، نگہت! اگر تم نے اس موقع پہ یہی کچھ رہا ہے اور بے وقوفی سے بنانا یا کام بگاڑنا ہے تو تمہارا میرا راستہ الگ ہے کیونکہ تم اس طرح دل اور بے وقوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ساتھ مجھے بھی مرواؤ گی۔۔۔ سنو! اگر قسمت مایہ زلت اور مرنا لکھا ہے تو میں تمہارے ساتھ مروں گی لیکن مجھے تمہاری کسی حماقت کی بات سے ایسا ہوتا ہوا نظر آیا تو میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارا گلا دبا دوں گی۔۔۔“

نگہت آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میرا گلا دبا ہی دو تو بہتر ہے لیکن ایک بات کا جواب۔ جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ کیا غلط ہے۔۔۔ اگر کسی کو پتہ چل جائے کہ میں تمہارے پاس لے تو۔۔۔ تو تمہارا یا میرا حشر کیا ہو گا؟“

گڈو نے گھوم کر ایک بھر پور تھپڑ اس کے دائیں گل پہ جڑ دیا، زنائے کی بازگشت دیر تک دئے سے کمرے اور نگہت کے کانوں میں گونجی رہی۔ وہ دانت پیستے ہوئے اسے سمجھانے لگا۔ ”۔۔۔ نہ تم یہاں موجود ہو، نہ تمہارا نام نگہت یا شمس ہے اور نہ ہی تم وہ مریضہ ہو جس کا تلاش میں پولیس نے یہ اپیل شائع کروائی ہے۔۔۔ سمجھیں؟“

گڈو سر تھام کر صوفے پہ ڈھیر ہو گئی، نگہت گل پہ ہاتھ رکھے ماضی میں اتر گئی۔۔۔ پہلا بڑا اس کی ماں نے ٹھیک اسی جگہ جڑا تھا۔ ایک روز نشے میں دھت وہ گھر آئی تھی، شاید اسی دھنشنے کی ایسی کیفیت اور ضرورت سے آشنا ہوئی تھی۔ ماں نے دو ہتھ پڑیتے ہوئے اسے مانگی دی تھیں۔ اپنی بے چارگی، حالات، بڑھاپے اور بیماری کا رونا رویا تھا۔ ماں کے دکھ، ات کی درماندگی اور تھپڑ کی چوٹ کو سہلاتے ہوئے وہ باہر نکل گئی تھی اور یہ سب کچھ لسنے کے لئے اسے پھر نشے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اسی دن وہ ایک بار پھر ایک دو راکٹس اکٹھی نکل گئی تھی۔ دکھ، درد، چوٹ، سب کچھ بھول گئی اور ایسا بھولی کہ اپنا آپ ہی لگتی۔ کچھ بھی تو یاد نہ رہا۔ ذہن کی سوئی پھر آگے بڑھی، دو سرا تھپڑ بھی یاد آ گیا جو ریس

کورس پارک میں جھیل کنارے ٹیلے پہ شوکت نے مارا تھا۔ عجیب سا مرد تھا یا مرد تھا ہی نہیں پرس پھینک گیا، بدن کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور تھپڑ لگا کر چلا گیا۔ تیسرا تھپڑ اوپر بھٹا، اچانک منہ سے بھائی جان نکل جانے پہ شایان نے لگایا تھا اور آج چوتھا تھپڑ گڈو نے جھیل پر ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ پھیل گئی۔

”آئی ایم سوری، گھٹ! مجھے معاف کر دو، مجھے ایسے نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

گڈو اپنے ہاتھ کو زور سے کرسی کی ہتھی پہ مارتے ہوئے گڈو معذرت کرنے لگی تو گڈو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چومنا شروع کر دیا۔

”نہیں، گڈو! معذرت کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ایسا کرنے کا پورا پورا حق ہے، معاف مجھے مانگنی چاہئے۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ میری زبان سے کبھی کوئی ایسا بات نہیں نکلے گی جس سے تمہاری دل شکنی ہو۔“ وعدہ!

گڈو بڑے گنبد لہجے میں کہنے لگی۔ ”سنو! جب گھٹ گھر سے نکلی تھی، آدمی مرچکی تو اور جب آدمی گھٹ، شمس کے روپ میں وہاں سے نکلی تو پوری مرچکی تھی۔ اب تم نام نہانی شخصیت، نئی زندگی اور نیا مقصد لے کر جیو گی۔ ماضی ختم ہو چکا، تمہیں اب کوئی سہرا جانتا۔ آج سے تم جان ہو، جان پیڑ، تم عیسائی ہو۔۔۔ بال ہمیشہ موٹھ کر رکھو، کریم چھو کر دلوں کی طرح جین جیکٹ اور گٹلے میں صلیب پہنو۔ سگریٹ اور بیر پیو، روزانہ چہرے لا بازوؤں کی شیو کرو۔ کرائے اور موٹر بائیک سیکھو۔۔۔“

”مگر میرا جسم۔۔۔ شکل۔۔۔ آواز؟“ گھٹ نے پریشان ہوا تھی۔

”یہ سب کچھ بدل جائے گا گڈو سرگوشی کے انداز میں کہنے لگی۔۔۔ میں تمہیں آواز لے کر کراچی جا رہی ہوں۔ وہاں میری ایک دوست ہے۔ تم اسے دیکھ کر یقین نہیں کرو گی کہ وہ بھی کبھی ایک لڑکی تھی مگر حالات، طبیعت اور مجبوری نے اسے لڑکا بننے پہ مجبور کر دیا۔ لڑکوں کی طرح ورزش کرتی ہے، لڑائیاں اور جھگڑے اس کا روزمرہ کا معمول ہیں۔ اونچے ہوٹلوں میں کل گر لڑ سپلاز ہے۔ وہ تمہیں چند دنوں میں ایک خونخوار لڑکے میں تبدیل کر دے گی، ایسا کہ تم خود بھی اپنے آپ کو پہچان نہ پاؤ گی۔ یوں بھی اب تمہارا یہاں مزید رہنا فائدہ سے خالی نہیں۔۔۔ کراچی بہت بڑا شہر ہے، اس کے دامن میں بڑی وسعت اور گنجائش ہے۔ وہاں ہمیں کوئی نہیں پہچان پائے گا اور نہ ہی کوئی تکلیف پریشانی ہو گی۔

”آج میری تصویر چھپی ہے، ممکن ہے کہ ریلوے اسٹیشن اور ہوائی اڈے پہ میری عمر لا ہو رہی ہو؟“ گھٹ نے اپنا خدشہ بیان کیا۔

”تم اس کی فکر نہ کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔ وہ تمہاری پرانی تصویر ہے۔“ وہ انبار کھول کر اسے اس کی تصویر دکھانے لگی۔ ”دیکھو، شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر اس تصویر اور اپنی موجودہ شکل کا موازنہ کرو۔ بیمار رہنے سے تمہاری صورت بہت بدل گئی ہے۔ ہمارے سر کے موٹے ہوئے بال۔۔۔ اور جب تم جین جیکٹ پہن کر چشمہ لگا کر چوگم جباؤ کی توکن تمہیں پہچانے گا؟“ گڈو نے اسے تسلی دی۔

گڈو کے بھائی کی پینٹ شرٹ اور لیڈر جیکٹ اسے بالکل فٹ آئی تھی۔ لانگ شو، گلے میں لاکٹ۔ چہرے پہ آنکھوں کے نیچے ہلکے سے براؤن شیڈ لگائے، ہاتھ میں سگریٹ لئے اسی رات، آخری فلائٹ سے وہ دونوں کراچی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

عروس ابلاؤ، کراچی! مصنوعی روشنیوں اور حقیقی اندھیروں کا شہر۔ جس کا ایک رنگی موسم ب موسموں کا منافقانہ رنگ ہے۔ برق رفتار، خود غرض، بے مروت! دس آدمی اکٹھے کرو تو بس مختلف زبانیں اور لہجہ، دس مختلف لباس، زرگی کو فتنے ہوں یا چکن کری، سب میں مچھلی کی مانند، گاڑ زبان کی بوئیاں نکال دو تو خشکا، نہ نکالو تو بریانی۔ چنے، ماش کی ربڑی میں او جڑی ال دو تو حلیم اور نہ ڈالو تو بگھاری دال تڑکا۔ مختلف مذاہب، زبانوں، ثقافتوں اور کثافتوں کا لہجہ۔ سیاسی، سماجی، لسانی اور انسانی مسائل کی دلیل اور دہشت، وحشت افراتفری، بے چینی کی آماجگاہ!

ایئر پورٹ پہ ماڈرن سے دو لڑکے اور ایک خوبصورت مگر ادھیڑ عمر کی عورت ان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ گلے ملے، پیاری پیاری گالیوں کے تبادلے ہوئے اور وہیں کھڑے لڑے تعارف ہوا۔

”یہ ٹینا ٹو، میری پیاری سہیلی۔۔۔ یہ جوزف، پاپ سنگر اور میوزیشن۔۔۔ اور یہ ریڈ لائز۔۔۔“ پھر وہ گھٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتانے لگی۔ ”یہ میرا فرینڈ، جان۔۔۔ پیٹر بان!“

ہائے ہائے کی باؤ، ہو کے بعد وہ لوگ ٹاپ فلور پر ریستوران میں آ گئے۔ کافی سامنے رکھ کر شکایت کی پٹاری کھول کر بیٹھ گئے۔ قہقہوں، گالیوں اور جی بھر کر باتوں کے بعد وہ دل اٹھے اور چند منٹوں کے بعد ٹینا ٹو کی پرانی فوکی پیر الٹی بخش کالونی کی جانب اڑی جا رہی تھی۔ اترے ہوئے شیشوں سے غم دار ہوا کے جھونکوں سے محفوظ ہوتے ہوئے گڈو کہنے لگا۔

”نوٹو! یہ تیری اولڈ فوکی تو ابھی تک خوب چل رہی ہے۔“

”ہاں! یار! کبھی کبھی آڑی کرتی ہے مگر پھر خود ہی ٹھیک ہو جاتی ہے، بڑی موڈی ہے۔ وہ سرکےٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے مزید بتانے لگی۔ ”پرانی کار اور پرانی عورت وقتواری نہیں! کاٹھی کی بھی مضبوط ہوتی ہے۔۔۔ دیکھ لو! بیس سال پرانی ہے مگر کاٹھی اک دم مضبوط۔“

”تیری طرح۔۔۔“ ریڈ روز بولا۔

”روز! پوشٹ اپ۔۔۔“ نوٹو نے اسے پیار سے جھاڑ پلائی۔

جان، یعنی نگہت نے پہلی بار غور سے ریڈ روز کی جانب دیکھا جو نوٹو کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ سائڈ کی مانند موٹی سی گردن، چوڑی چھاتی جس پہ ڈائمنڈ جڑی سونے کی صلیب جھول رہی تھی۔ پھر کتنی پھیلیوں والے مضبوط بازو، کلو بوائے کٹ بل۔۔۔ اچھا! تو یہ وہ چیزیں جن کا تعارف گڈو نے لاہور کروایا تھا! اس نے سوچا۔

☆☆☆

یہ ہٹا کٹا غنڈہ دکھائی دینے والا کبھی ایک معصوم سی اینگلو انڈین لڑکی روزی تھی جس کا باپ بھی کسی زمانے میں این ڈیلیو ریلوے، لاہور ریجن کا انجن ڈرائیور تھا۔ بچپن میں گڈو اور روزی ایک سکول اور کلاس میں پڑھتی تھیں۔ روزی کا باپ ریلوے کے ایک حلوے میں مارا گیا۔ ریلوے سے ایک موٹی رقم اور پنشن حاصل کرنے کے بعد اس کی نو عمر بیوہ کچھ عرصہ تو لاہور میں ہی رہی اور پھر ایک شیر بڑو کر کے عشق میں مبتلا ہو کر کراچی شفٹ ہو گئی۔ روزی نے نین نش اور قد کاٹھ نکال لیا تھا۔ یہاں بھی وہ ایک مشن اسکول میں داخل کرادی گئی۔ ماں کی ڈھلتی اور روزی کی کڑی دھوپ کی مانند چڑھتی ہوئی جوانی نے سوتیلے شرابی اور عیاش باپ کی آنکھوں میں چکا چوند سی پیدا کردی۔ وہ اب اپنی بیوی سے زیادہ اس کی بیٹی پہ ہریان رہنے لگا۔ کپڑے، گفت، سیر سپاٹے، سینما، ہر وقت اسے خوش رکھنے کی کوشش میں رہتا۔ روزی کی ماں خوش اور مطمئن تھی کہ یتیم بچی کو باپ کا پیار مل گیا ہے۔۔۔ وقت دھیرے دھیرے آگے کی طرف سرکتا رہا۔ کلی کے غنچے بننے کے انتظار میں اس نے بڑا لمبا عرصہ مہر کیا تھا۔ اس سے پیشتر کہ آتش ہو اس کو جلا کر راکھ کر دیتی، اس نے ایک رات اس پر گرفت کر لی۔

☆☆☆

وہ کرمس کی رات تھی۔ ہاگس بے کے ساحل پہ جشن ہا ہو رہا تھا۔ سینکڑوں لڑکیاں لڑکے، بڑے جوان پینے پلانے اور ناچنے گانے میں مگن تھے۔ کسی کو کسی کا ہوش، کسی رشتے ناٹے کا احساس، یا کسی چھوٹے بڑے کا امتیاز نہ تھا لیکن وہ اتنا بھی بے ہوش نہیں تھا کہ قیمتی لمحوں کو وقتی بدستی میں ضائع کر دیتا۔ موقع پاتے ہی وہ روزی کو دو بچ کر سمندر کنارے ایک ٹیلے کی اوٹ میں لے گیا۔ روزی بھی اتنی مدہوش اور معصوم نہ تھی کہ وہ اس کے ارادے کو نہ سمجھ سکتی۔ چینی چلائی، چلی تڑپی مگر اس خرابہ ہنگام میں اس معصوم چڑیا کی چوٹیوں جھنجھکی کے فرصت تھی جبکہ چڑیا کی ماں بھی چند قدم پرے ایک فائیسو شار ہوٹل کے ہیڈ بلٹر کے ساتھ داد

عیش دے رہی تھی۔ پاپ میوزک کے شور میں نو عمر روزی کی ایک ایک کر کے ساری سسکیں دم توڑ کر رہ گئیں۔ شیر برز کرنے سنبھال کر رکھے ہوئے اس چھوٹے سے شیر سرٹیفکیٹ کو اچھے خاصے منافع پر کیش کر لیا تھا۔ سمندر کنارے جوار بھانا اترنا۔ الا ٹھنڈے، بوتلیں ختم اور سرور ٹوٹنے لگے تو روزی کے غصے میں بھی تبدیلی آئی، سوچ اور انداز فکر بھی بدل گیا۔ اس نئی منہج وہ جیسے ایک نئے انسان میں تبدیل ہو چکی تھی۔ رشتوں، نااطوں، پیار، محبت، شفقت پر سے اس کا ایمان اُٹھ گیا۔ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کی مصروفیات، خصل شوق بھی دیکھتی رہتی اور سوتیلے باپ کو بھی جان چکی تھی۔ کچا پکا ذہن، کلیاں کتابیں لکھنے پڑھنے کی عمر۔ ماں باپ سمجھتے ہیں کہ ان کے بچے ابھی معصوم، نا سمجھ ہیں مگر نہیں۔ ہر بچہ جو آنکھ، کان اور دماغ رکھتا ہے وہ ہر اچھی بری بات کو مکمل سمجھتا ہے مگر وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتا، ضرورت محسوس نہیں کرتا یا وہ کرنا نہیں چاہتا پھر وہ اپنی ذات کو برت نہیں سکتا۔ بچہ جتنا تو اپنے پاؤں پر ہے مگر پھر بھی وہ کسی کی انگلی پکڑ کر چلنا زیادہ محفوظ تصور کرتا ہے۔ روزی نے اس حادثے کے بعد ان دونوں کی انگلیاں چھوڑ دی تھیں، خود اپنے قدموں پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ گھر میں رمی، برج، فلاش، بیئر، دسکی تو روزمرہ کے معمولات تھے۔ اتوار کو چرچ، ریس کلب، آؤٹنگ جس میں وہ خود شامل نہیں ہوتی تھی۔

چند دنوں بعد نئے سال کے روز وہ سرور میں مبتلا تھی۔ والی ایم سی اے کلب میں پیس نیو ایر کا ہنگامہ تھا۔ سرور کی وجہ سے پاس پڑوس کی سیلیوں کے ساتھ گھر پہنچے ہی تھی۔ رات ٹھیک ساڑھے بارہ اس کا سوتیلے باپ، پیمین کی بوتل اور کھانے پینے کا سامان لے کر گھر آیا، آتے ہی ”بیسی نیو ایر روزی“ کہتے ہوئے بتایا کہ تمہاری ممی اپنے فریڈز کے ساتھ ڈرنک کر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ چلو، بے بی کے ساتھ نیو ایر سیلیریٹ کرتے ہیں۔ اس کی سیلیوں کو بھی ایک ایک جام پلایا، برگر کھلائے، کچھ دیر بعد وہ چلی گئیں تو اس نے میوزک آن کر دیا، جیب سے کوارٹر سکاچ نکالی۔ ایک ڈبل نیٹ پیگ روزی کے لبوں سے لگا دیا۔ دوسرے پیگ کے بعد روزی خود ہی ہمک لگی۔

\*\*\*

آدھی رات کہیں اس کی ممی، ایک نوجوان چھو کرے کی ہانپوں میں جھولتی، لڑکھاتی اندر داخل ہوئی۔ یہ دونوں بے خبر، نیشے میں ڈوبے ہوئے غالیچے پر بڑے ہوئے تھے۔ فے کی غلاظت، ابلے سیدھے گلاس، برگرڈوں کے ٹکڑے، غبارے، آرائشی جھنڈیاں جا بجا بکھری پڑی تھیں۔ ممی ایک عجیب سی بے نیازی سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے بیڈ روم میں ٹھس جی۔

جب، ضرورت، خوف اور صبر بہت بڑے اعزاز یا آزار ہیں۔ ان کے توازن یا عدم توازن سے انسان ولی اللہ ہو سکتا ہے یا شیطان الرجیم۔ دونوں حالتوں میں پاؤں تلے تنی تار، ہاتھوں میں تارے بڑا سالٹ، توازن پہ قابو، دھیان اور اعتماد کا عمل دخل ہوتا ہے۔ کسی ایک وجہ سے غیر موازن ہو کر کوئی نیچے گر جائے تو ہر چیز اس کے لئے بیکار اور غیر اہم ہو جاتی ہے۔ اس حادثے کے بعد روزی بھی جیسے سیدھی تار سے پھسل کر نیچے جال میں گر چکی تھی۔ شیر برز کو سوتیلے باپ کے حساب سے اب اس کی بیوی یلو یعنی زرد شیر سرٹیفکیٹ بن کر رہ گئی جس کا بھادون یہ دن گرنا چلا جا رہا تھا، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے کانڈے کا بے کار ٹکڑا بن کر رہ جاتا ہے۔ جسے تجربہ کار برو کر اوانے پونے نکال دیتے ہیں۔ اصل چیز تو روزی تھی، فریش ریڈ روزا! جس کا بھادو ہر آنے والے دن اوپر ہی اوپر جا رہا تھا۔ ایک دوسرے کے کانے لوگ، اندھے بن جاتے ہیں۔ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھتے، ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے۔

اب ریڈ روز کھل کھلا کر گھر سے باہر اونچی سوسائٹی، ہوٹلوں اور کلبوں میں اپنے شباب کی فٹبو سے ضرورت مندوں کو مسحور کرنے لگی۔ نام نہاد ممی ڈیڈی پرانا گھر چھوڑ کر طارق روڈ کے کشادہ آراستہ فلیٹ میں اٹھ آئے تھے، پرانی گاڑی کی جگہ نئی گاڑی آگئی۔ انہی دنوں گڈو، ٹی ان کے بلائے پر کراچی آگئی تھی۔ یہاں ان کے ٹھٹ اور عیش و عشرت کی زندگی دیکھ کر س کی آنکھیں کھل گئیں۔ لاہور کی عشرت زدہ زندگی اور ٹھٹن کے مقابلے میں کراچی اس کے لئے ایک جنت سے کم نہیں تھا۔ کہاں بوسیدہ، تنگ، سیلن مارا پرانا ریلوے کا کوارٹر، دقیقہ نویں نا پڑھ غریب لوگ، ہزار بارہ سو کی نوکری پہ بھی سو سو کیڑے، دق کا مارا مدقوق باپ اور کہاں یہ لڑاچی کے لاکھوں کروڑوں پتی لوگ، بڑے بڑے بنگلے، کاریں، کلب، عیش و عشرت، آزاد بال دوست، رومان پرور کھلی فضا تیں۔ پہلی زندگی پہ چار حرف بھیج کر وہ روزی کے ساتھ مل روزی کمانے پہ جٹ گئی مگر براہ وقت کا کہ روزی کے شیر برز کو ڈیڈی نے ایک خاصی ٹی رقم دیس میں ہار دی، ساتھ ہی ٹے میں ایک اوچھا ہاتھ جو پڑا، نتیجے میں وہ چند ہی دنوں میں لموں کے نیچے لگ گیا۔ ریس، ٹے، شیر برز کے برنس میں تو ایسا لگا ہی رہتا ہے۔ ریڈ روز اور نو کو آگے بڑھا کر ایک عیاش سیٹھ سے ایک موٹی رقم حاصل کر کے پھر کاروباری سنبھالا لینا اگر وہ جو کہتے ہیں کہ ڈھلوان سے لڑ جھکے والا لڑھکتا ہی چلا جاتا ہے، یہ رقم بھی وہ ٹے کے ہی جھکے میں خاک کر بیٹھا۔ اسی روز، رات کے کسی پہر سوتے میں ہی اس کا ہارٹ فیل ہو بلے کم خن جہاں پاک۔۔۔ کرائے کا فلیٹ خالی کر کے ماں بیٹی دونوں روپوش ہو گئیں، گڈو

لاہور بھاگ آئی۔ جمع پونجی ٹھکانے لگی تو ماں بیٹی نے پھر ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے۔ ماں نے اس عمر میں کیا ہاتھ پاؤں مارنے تھے، روزی ہی دال دلیا چلا رہی تھی مگر جن کے منہ اٹھیں بیڑا اور چانیز چکن ڈرم سنگ لگ چکے ہوں وہ باسی سڑی حلیم کھانے سے رہے۔ انہی دنوں ایک بلڈنگ کنسٹرکشن کمپنی کا مالک ریڈ روز کی آندھی جیسی جوانی کے جنگل میں اپنا سیدھا راستہ کھو بیٹھا، گھر کی نیک بی بی کو طلاق تھا کر اس چنڈال سے شادی کر کے گھر ڈال لیا۔ کچھ عرصہ تو وہ اس کی خزانہ ماں کو برداشت کرتا رہا اور آخر ایک دن دھکے مار باہر کر دیا۔ روزی چنچلی چلائی رہی کچھ پیش نہ گئی۔ وہ آدمی ذرا ہتھ چھٹ بھی واقع ہوا تھا۔ یہ جیسے تیسے اس سے گزارہ کرتی رہی۔ جس دن اس کے ہاں پہلی بچی پیدا ہوئی اسی دن اس کی مٹی، ناظم آباد کی ایک تنگ و تاریک کھولی میں ایزیاں رگڑتی ہوئی مر گئی۔ اس ظالم نے اسے ماں کی آخری رسومت میں بھی شریک ہونے نہ دیا اور اسی دن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بہت جلد اس پنجرے سے رہائی حاصل کرے گی، ویسے بھی بازار میں منہ ماری کرنے کا عادی تنگ کر گھر کی ہانڈی نہیں کھاسک۔ ایک قیامت یہ ٹوٹی کہ بچی کی پیدائش کے بعد اس کا جسم اور پیٹ پھول کر کیا ہو گئے، چرے پہ چھائیاں اور سیاہیاں کھنڈ نکلیں۔ بہتر علاج معالجہ ہوا لیکن کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ساری جاذبیت اور جسمانی کشش آہستہ آہستہ غارت ہوتی جا رہی تھی۔ روزی نے پھر بھی اسے پریشان کرنے اور اس سے پیچھا چھڑانے کی خاطر جان بوجھ کر اپنے پرانے لچھن بھرے چالاک دیئے۔ ٹیلی فون بھی کھڑکنے لگے، مشکوک لوگ بھی آس پاس دکھائی دینے لگے۔ وہ تنگ آکر آئے دن اس کی دھلائی کرنے لگا۔ اچانک ایک دن اسے آفس میں ایک گمنام ٹیلی فون آیا، خدا جانے کسی نے کیا کہا کہ غصے کے عالم میں مکا کر ٹیبل کا شیشہ چکنا چور کر دیا۔ اسی غصے کے عالم میں گھر آیا اور کھڑے کھڑے بچی سمیت گھر سے نکال دیا۔ بعد میں روزی نے ہی انکشاف کیا کہ یہ ٹیلی فون اسی نے کھرایا تھا کہ یہ بچی اس کی نہیں ہے، اس کا باپ کوئی کریمچین ہے جو رہیں کورس میں جو کی ہے۔

وہ بچی سمیت اپنے جیسی ایک دوست کے ہاں اٹھ آئی جو ایک بہت بڑے نیم سرکاری کلب میں پبلک ریلیشن آفیسر تھی۔ یہاں آکر اس نے نئے سرے سے حالات کا جائزہ لیا، اس کے صلاح مشورے سے ایک ہیلتھ سنٹر میں جسم درست کرنے کے لئے داخل ہو گئی۔ چوبیس کی مشقت کے بعد وزن قدرے کم ہوا مگر جسمانی حالت اور بھدے پن میں کوئی نمایاں فرق ظاہر نہ ہوا۔ اسی دوران اس نے اپنے بال بھی بوائے کٹ کروائے تھے، ایکسر سائیز یونیفارم میں وہ لڑکی کی بجائے ایک سینڈو نظر آتی۔ جو لوگ کبھی اس کے دیوانے تھے، اب نظر اٹھا کر بھی

نہیں دیکھتے تھے۔ عورت کی اس سے زیادہ توہین اور کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی مرد اسے نظر بھر کر دیکھنے کے قابل بھی نہ سمجھے۔ یہ احساس اسے دن رات کٹتا رہتا۔ ہیلتھ سنٹر میں وہ فاسٹ اوکٹ میں دو سری لڑکیوں کو ایکسر سائیز بھی کروا دیا کرتی تھی، کافی عرصہ یہاں گزارنے کے بعد وہ اچھی تجربہ کار ہو چکی تھی۔ ایک دن سنٹر کی پارسی مالکہ نے اسے آفر دی کہ تم اگر چاہو تو یہاں کوچ کی حیثیت سے ملازمت کر سکتی ہو، تنخواہ اور دیگر مراعات بھی پرکشش تھیں۔ اس نے حالات کی یہ ستم ظریفی بھی خنداں پیشانی سے قبول کر لی، وہیں اسے اوپر رہائش کے علاوہ موٹر بائیک بھی مل گئی۔ ورزش کراتے کراتے اس کے اندر کی عورت جانے کہاں غائب ہو گئی۔ مسل ٹیپے، گردن شانے فولاد کی مانند تن گئے۔ غصے اور ذہنی تناؤ کی حالت میں خود پہروں ورزش کیا کرتی، پسینے کی ندیاں کھل جاتیں اور دیکھنے والیاں عیش عیش کراٹھتیں۔ اس کے کرتی بنے ہوئے جسم کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتیں۔ یہ تو اس کی ایک اضطرابی کیفیت تھی اور اس حقیقت کے خلاف ایک اضطراری رد عمل تھا کہ اب وہ سنہری چڑیا اڑ چکی جس کے پیچھے کئی شکاری حرص و چاہت اور مال و زر کے رو پہلی جل لئے تعاقب میں رہتے تھے۔ اب تو یہ وہ شکار بن چکی تھی جو خود ہی اگر کسی جل میں پھنسا چاہے تو شکاری جل چھوڑ کر بھاگ لے۔ اس نے اپنے تئیں تہیہ کر لیا کہ اب وہ ایک خونخوار مرد کے روپ میں ان مردوں سے تقاب لے گی جنہوں نے اسے اس حال تک پہنچایا تھا۔ اسے اس حال تک لانے والا اس کا سوتیلا باپ تو اصل جنم ہو چکا تھا مگر اس جیسے تو کئی اس کے ارد گرد موجود تھے مگر عورت چاہے لاکھ لوشن کرے، جو بھی بھیس بدلے، اپنی نسایت اور عورت پن کی فطری خواہش کا گلا نہیں دبا لیتی۔ اسے یہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، دو ایک دھانسو قسم کے معقول سے دوستوں سے روزی نے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی۔ انہیں مالی اعانت کا اشارہ بھی دیا مگر وہ ایسے بد کے لہو دیکھتے ہی راستہ کاٹ جاتے۔ اس تلخ تجربے کے بعد اس نے مردوں پر لعنت بھیج کر اپنے ن کو مار لیا۔ بچی بھی اب بڑی ہو رہی تھی۔ ہٹی، ایرانی ملی جیسی نیلی نیلی آنکھیں اور نرم روئی کی لٹام جلد لئے بالکل کنسٹرکشن کمپنی کے مالک پہ گئی تھی۔

دو سال اسی ہیلتھ سنٹر میں پلک جھپکتے گزر گئے۔

تنخواہ کے علاوہ دیگر مراعات میں اضافہ ہو چکا تھا۔ پارسن مالکہ نے اس کی کارکردگی اور تہذیبی نمائندگی محسوس کرتے ہوئے اسے مکمل ذمہ داری سونپ دی تھی مگر یہ تو اپنا ہیلتھ سنٹر دے کے کارواہ کر چکی تھی۔ اگلے تین مہینے اس نے جان توڑ محنت کی۔

نہی اور دونوں ہی خلاف فطرت زندگی کی راہوں پہ گمزن تھیں۔ چنانچہ اپنے مرض سے چھٹکارا مل گیا تھا۔ پھر بھی روزے اپنے ایک ڈاکٹر سے اس کا مکمل چیک اپ کروایا جس نے اس کے کلیئر ہونے کی رپورٹ دی۔

☆☆☆

ملک بھر میں نگہت کی تصویر اور تلاش کی اپیل مسلسل شائع ہو رہی تھی۔ حساس اداروں نے ریپڈز اور کنوؤں کے علاوہ کوئی ایسی جگہ نہ چھوڑی جہاں اسے تلاش نہ کیا ہو۔ انہی دنوں سیلاب کی آفت ٹوٹ پڑی۔ ہزاروں انسان اور موٹھی ہلاک ہو گئے، ملک میں ایمرضی نافذ کر دی گئی تھی اور انہی دنوں ایک خبر اور تصویر چھپی۔ پولیس کو خبر وال کے قریب ایک جوان لڑکی کی مسخ حالت میں لاش ملی۔ نیلی رنگت، پھولی ہوئی، کئی روز سیلاب کے پانی میں کسی بھاڑی میں ابھی رہی۔ کئی جگہ جسم سے گوشت جدا ہو گیا تھا، چہرے کا بہت سادہ سلامت تھا مگر ناقابل شناخت تھا۔ چہرے کے بگڑے ہوئے خدوخال، کپڑوں اور پچی کچھی دیگر اشیاء سے بھر کر لیا گیا کہ یہ وہی لڑکی شمشہ ہے۔ دراصل پولیس اس کیس میں اپنی ناکامی کو کسی طرح سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آدھی ادھوری تصویروں اور دیگر جسمانی اعضاء کے ذریعے ٹی کرم الٹی، نواب بی بی، مس عاشری اور دوسرے گرفتار شدگان سے رسمی شناخت کروائی گئی۔ ہڈیاں چھڑانے کی غرض سے سب ہی نے اس کے شمشہ ہونے کی تصدیق کر دی۔ اس طرح پولیس نے اپنی جان چھڑوائی، اپیل شائع ہونا بند ہو گئی۔

کراچی والی پرانی لاشوں کے دو پوسٹ مارٹم اور ہوئے۔ اب لاشیں چہرے کے علاوہ کسی ہڈی پرانی بوریوں کی مانند تھیں۔ موتیاں جان کی لاش کا بھی قریب قریب یہی حشر تھا۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ حکیم جمالی اور استاد شتو اکیدھی والا بھی یکے بعد دیگرے لڑھک گئے۔ کون اے کہ واقعی اس بیماری سے مرے ہیں، دہشت یا پھر "ات خدا دادیر" کا نتیجہ تھا۔ گویا اب یہ نکلتا عمل کا سلسلہ چل نکلا تھا، باقی ماندہ بھی لائین میں لگے ہوئے تھے۔ پولیس اور طبی ہرکن کا خیال تھا کہ اب یہ باقی ماندہ بستر بھی جلد خالی ہونے والے ہیں۔ امریکن طبی ماہرین اور ٹی ڈاکٹروں نے دوا ڈھائی ہفتوں میں مختلف نتائج اخذ کرنے کے بعد جو رپورٹ تیار کی اور اس اداروں کی تفتیشی کارروائیوں کے مطابق بھی اس خطرناک بیماری کو کنٹرول کر لیا گیا۔ سترہویں موجود تھے اور اپنے انجام کو پہنچ رہے تھے، باقی لوگ یا جو شے میں حراست میں لگے تھے ان میں اس بیماری کے کوئی آثار نہیں تھے۔ مزید چند روز گزرنے میں رہنے کے بعد سے تین روز قبل تمام لوگ چھوڑ دیئے گئے جن میں حاجی رنجی بیگم اور اس کے شاگرد

مینا جیے ٹوٹو کا نام بھی اسی نے دیا تھا، اس کی شاگرد تھی۔ کراچی کی ایک ممتاز صنعت کار فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ پڑھی لکھی، بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈگری ہوڈر، روشن خیال اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کی شوقین۔ دوستیاں پالنا، سیر پانے، میوزک پارٹیوں کا جنون۔ پارہ صفت، صاف گو اور خطرناک حد تک بیباک تھی۔ والدین سے تو شروع سے ہی نہیں غنی تھی۔ بڑے جتنوں سے ایک شریف کاروباری خاندان میں بیاہی گئی۔ خاوند کینڈا میں سیٹل تھا۔ شادی کے بعد بڑی مشکل سے ایک سال خاوند کے ساتھ گزارا۔ وہ بے چارہ سیدھا سارا کاروباری آدمی تھا، ٹوٹو کے الفاظ میں مٹی کا مادھو اور یہ تو پارے کی بنی ہوئی تھی۔ ہر وقت مضطرب دہے قرار، تھل اور ایڈونچر کی متلاشی اور حد یہ کہ ماں بننے کا رسک تک نہ لیا۔ وہ کہتی کہ "اوتی کانی ہے، آکو کا چٹھا کہاں سنبھالوں گی۔ پھر اس آتو سے جان چھڑا کر واپس بھاگ آئی۔ اب یہ طلاق کا مطالبہ کرتی، نہ وہ ضرورت محسوس کرتا۔ کبھی کبھی دونوں ایک دوسرے کو ٹیلی فون کھڑکا لیتے۔ جو مانگتی، وہ اس کے بینک اکاؤنٹ میں ڈال دیتا۔ اس کے عیش ہی عیش تھے۔ سجا سجایا آراستہ تین کمروں کا ویٹ اوپن فلیٹ ملا ہوا تھا، مختلف جیلوں بہانوں سے می ڈیڈی سے بھی روپیہ پیسہ بھاڑ لیتی، اس طرح کانی لمبا بینک بیلنس اکٹھا کر لیا ہوا تھا۔ اسی ٹوٹو نے ریڈ روز کو شراکت میں اپنا اہلیتہ سفر کھولنے کا مشورہ دیا تھا۔ سرمایہ اس نے فراہم کیا، سارا بزنس اور انتظام روزی نے سنبھالا اور دونوں نفٹی نفٹی کی پارٹنر بن گئیں۔ خوب کاروبار جمایا۔ ماڈرن اپ ٹو ڈیٹ قسم کے آلات لگائے۔ سونا ہاتھ، ہاٹ روم، مساج روم، ہنڈی شعاعوں کا غسل، کانی روم، اسٹیک بار۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اچھے اچھے گھرانوں سے خوبصورت لڑکیاں، عورتیں اپنی اعضائی ورزش اور باڈی شپ کے لئے آنے لگیں۔ کاروباری نقطہ نظر سے یہ ایک منفعت بخش بزنس تھا جس سے ان دونوں کے دن پھر گئے لیکن پس پردہ ان کا اصل کاروبار تو بڑے بڑے ہوٹلوں، مولوں، کلبوں، پرائیویٹ گیٹ ہاؤسز کو ان کی پسند اور ضرورت کے مطابق کل گر لڑھکاتا تھا۔ لڑائی جھگڑے بھی ہوتے۔ ریڈ روز کا اپنا گینگ بھی تھا جس میں بڑے بڑے ماڈرن بد معاش، گمشدے اور ایجنٹ تھے جو کل گر لڑکی نگہداشت اور حفاظت کرتے تھے۔

یہ سب کچھ معلوم ہونے کے بعد نگہت یعنی جان کی آنکھیں کھل گئیں۔ گڈو نے تفصیل کے ساتھ نگہت کی ساری کہانی سنائی تو ریڈ روز نے اسے گلے سے لگا لیا۔ دونوں ایک کٹھالی کے ڈھلے ہوئے کھوٹے سکے تھے۔ دونوں ہی زمانے اور اپنوں کی ستائی ہوئی تھیں، دونوں نے ہی دنیا اور عیاش مردوں لئے اپنے اپنے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑکائی ہوئی

نے آج پھوپھی جی کا کہاں کران کا مان بڑھا دیا ہے، جی بڑا خوش ہوا۔ تم نے دیکھا، سب ہی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ شایان! جو ماں کو خوش رکھتا ہے اسے کبھی کوئی دکھ نہیں چھوٹا، وہ سدا سکھی رہتا ہے۔ آج کے مبارک دن مجھ سے وعدہ کرو کہ تم کبھی اپنی ماں سے دور نہیں رہو گے، کبھی ان کا دل نہیں دکھاؤ گے اور کبھی ان کا کہا نہیں ٹالو گے۔“

وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اچھا، منظور۔ غیر مشروط طور پر منظور۔ مگر اس موضوع سے ہٹ کر تم بھی میری وہ بات مانو گی جس کا کئی بار میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔“ وہ اس کے اشارے کو سمجھتے ہوئے پٹنگ کی پٹی پہ بیٹھ گئی، تھوڑی دیر بعد بڑے اعتماد سے پوچھنے لگی۔

”تم ایسا کیوں چاہتے ہو، کس حیثیت سے مجھے مجبور کرتے ہو۔۔۔ پھوپھی زاد بھائی کی حیثیت سے“ ایک انسان ہونے کے ناطے یا کوئی اور وجہ۔۔۔؟“

”میں ایک بھائی اور ادنیٰ سا انسان ہونے کی حیثیت سے تمہاری بھلائی اور بہتری کے لئے لیا چاہتا ہوں۔۔۔“

”نہیں اسے گھورتی ہوئی بولی۔ یہ وقت اس موضوع پہ کھل کر بات چیت کرنے کا نہیں لیکن ایک بات ضرور کہنا چاہوں گی۔ تمہارے پاس کیا گارنٹی ہے کہ تمہاری بات مان لینے میں میری بہتری اور بھلائی ہے؟۔۔۔ یقیناً“ تمہارے پاس کوئی گارنٹی نہیں، تم صرف ایسا سوچ سکتے ہو یا گمان کر سکتے ہو۔۔۔ ویسے میں بھی اپنی بھلائی بہتری کے بارے میں اپنی ایک رائے رکھتی دل کوئی فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہوں۔ تم عورت کی نفیات اور اس کی الٹی کھوپڑی کے رے میں شاید کچھ زیادہ نہیں جانتے، عورت صرف جسم، جاذبیت اور خواہشات کو پورا کرنے کی مشین کا نام نہیں۔ وہ چاہت، عزم اور صبر و حیا کا نام ہے۔ اسی طرح مرد بھی طاقت، بہت، دولت اور اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھنے والے کسی کمپیوٹر کو نہیں کہتے۔ مرد وہ بوجہ مخلص، خیر، تائب، زرق حلال کمانے والا، صاحب الرائے اور غیرت مند ہوئے۔ شایان! رتی چاہت تم ہو، میں ہر حال میں تمہارے ساتھ مرنے جینے کا عزم کر چکی ہوں۔ میں بے وفا نہیں، بے حیا نہیں ہوں کہ تمہیں چھوڑ کر کسی اور کے متعلق سوچوں۔ میں بڑی ثابت قدم مگر کرنے والی ہوں۔“

”نہیں۔۔۔! شایان نے بات پکڑنا چاہی۔“

”صرف چند الفاظ اور، پیٹنگی معذرت کے ساتھ میں تارا اسی ٹپو میں کہنے لگی۔“

”تم صرف تھوڑی سی غیرت پیدا کر لو۔ میں ان سخت الفاظ کے لئے پھر معافی چاہتی ہوں،“

استاد شنو کی اکیڈمی کے ملازم، بلڈنگ کے چوکیدار، خاکروب، شایان کے تینوں ملازم جن میں فشی کرم الٹی بھی شامل تھا۔ شایان کو بھی انہوں نے بلائے پر حاضر ہونے کی شرط پر چھوڑ دیا۔ مرنے والوں کی نعشیں درخت کے حوالے نہیں کی تھیں۔ جھکے نے اپنے مخصوص اور خفیہ طریقے سے انہیں ٹھکانے لگایا۔ جس جگہ اور ایمر جنسی میں یہ کارروائی ہوئی، اسی انداز سے یہ سارا سلسلہ بھی ختم ہو گیا کیونکہ دیکھا دیکھی یہ خبیث جنم واصل ہوتے گئے، ایک بھی باقی نہ بچا۔ حکیم جملی کے دفتر دیرے کے علاوہ عامل ظہوری شاہ کے آستانے اور فلیٹ کا سارا سامان فرنیچر وغیرہ پولیس لے گئی۔ فلیٹ اور دفتر کا قبضہ فشی کرم الٹی نے لے لیا۔ حاجی رجب بیگم اپنے شاگرد پیشہ یبجروں اور بھائی شمشاد اونس ماسٹر کے ساتھ کہیں روپوش ہو گئے۔ بلوا میاں ہنگامی کے مزار پہ گدھار یڑھی والوں نے گدھے باندھنا شروع کر دیئے۔ خس کم جہاں پاک۔

☆☆☆

شایان گھر آیا تو سب کی جان میں جان آئی۔ صدقے کے بکرے ذبح کئے گئے، اللہ کا شکر ادا کیا گیا۔ اتنی مصیبت اور پریشانی دیکھنے کے بعد بھی وہ مردانہ لباس میں بڑا پر عزم اور پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے آتے ہی ماں کے پاؤں پکڑ لئے۔ حجام کو گھر بلا کر سر کے بل کٹوا دیئے گئے۔ وہ خاموشی سے ماں کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو دیکھ رہا تھا۔ ماں جی، بابائی، ماں جی۔۔۔ جیسے دونوں چہرے ایک دوسرے میں گنڈھ ہو رہے تھے۔ کانوں میں بابائی کی دھیمی سی آواز رس گھول رہی تھی، ایک ایک لفظ صاف سنائی دے رہا تھا۔

”ماننا بڑی ممانتا ہے۔ ماننا، ماں سے شروع ہوتا ہے۔ ماں چکی ہوتی ہے۔ جو گھر کی چکی کا مان جان لے، اس کا دانا گھر میں موجود۔۔۔ گھر کی چکی کا کھاؤ، پُن کھاؤ۔۔۔“

اچانک اس کے منہ سے نکلا۔ ”ماں۔۔۔“

”میں صدقے، میں واری۔۔۔“ ماں کے منہ سے بیساختہ نکلا۔

دونوں ماں بیٹا، اک دوجے کے سینے سے لگے آنسو بہا رہے تھے۔ نین تارا، قاسم، ولٹی، سب گھر والوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ ماموں اور والد شکرانے کے نفل پڑھنے مسجد کی طرف نکل گئے۔ کچھ دیر بعد موقع پاتے ہی وہ نین کے کمرے میں آیا۔ نین تارا بڑی خوش تھی، چہنچہنہ ہوئے کہنے لگی۔

”تمہیں دونوں گھروں میں آنا مبارک۔۔۔؟“

”میں کچھ سمجھا نہیں۔۔۔“ وہ دماغ پہ زودیتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”بھئی، سیدھی بات ہے۔ اس گھر میں اور اپنی ماں جی کے گھر میں، یعنی دل میں۔۔۔ تم

ازیت اور پریشانی سے ہم نے گزارے ہیں، ہم ہی جانتے ہیں۔۔۔ اوپر سے تمہاری پریشانی اور بھاگ دوڑ، تمہارے والدین اور ماموں ممائی، نینی کی حالت۔ منہ روزہ۔۔۔

”اب والد صاحب کی طبیعت کیسی ہے۔۔۔؟“

”والدہ کی موت کے بعد انہیں چپ تو لگ ہی گئی تھی، نگہت کی موت اور بدنامی نے انہیں بالکل ہی نڈھال کر دیا ہے۔ کھانا پینا ختم ہو گیا ہے، ایک آدھ ہلکا سا دورہ بھی پڑ چکا ہے۔ ڈاکٹروں نے کسی گہرے صدمے کا اثر بتایا ہے۔۔۔ میری تو منت ماری گئی ہے، خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔۔۔“

”گھبراؤ نہیں، دوست! اللہ بہتر کرے گا۔ میں اب تمہارے قدموں میں واپس آ گیا ہوں۔ جو سر پڑے گی، اکٹھے جھیلیں گے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمت مرداں مدد خدا۔۔۔“

زلفی اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا: بولا۔ ”سچ پوچھو، شایان! تم یہ کہتے ہوئے مجھے بہت ہی بھلے لگے ہو۔ میں تم میں ایک خوشگوار سی تبدیلی محسوس کر رہا ہوں، یوں لگتا ہے جیسے تمہارے اندر سے ایک حوصلہ مند اور حوصلہ بڑھانے والا مرد باہر نکل آیا ہے۔ مجھے اسی مرد کی ضرورت ہے، تم میرے ساتھ ہو تو میں بڑے سے بڑے طوفان سے بھی ٹکرا جاؤں گا۔۔۔“

”پولیس کا دعویٰ ہے کہ سیلاب میں مرنے والی نگہت ہے، یہ دیکھو لاش کی تصویر۔۔۔ لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ نگہت نہیں۔ پولیس نے اپنی جان چھڑائی ہے اور کیس داخل دفتر کر دیا ہے۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”یقین نہ کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ بھی تو نہیں، ہم محض قیاس اڑائی ہی کر سکتے ہیں۔۔۔“

دوسرے کمرے سے زلفی کے والد کے چیخنے اور رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ دونوں ماگے بھاگے اندر گئے۔ انہیں پھر دورہ پڑ چکا تھا۔ شایان ان کی حالت دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ بڑوں کا ڈھانچہ، پیلی رنگت، آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے، بجھا بجھا سا چہرہ، لرزیدہ آواز فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ انجکشن لے کر سو رہے تھے۔

☆☆☆

اخبارات کا پلندہ اٹھائے شایان، ماموں کے گھر آ گیا۔ اظہاری کے بعد وہ نین تارا کے کمرے میں اخبار کھول کر بیٹھ گیا، پڑھتا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ دماغ سن ہو رہا تھا۔ حکیم جمالی،

باقی کسی چیز کی کمی نہیں اور نہ ہی مجھے تمہارے سوا کچھ اور چاہئے۔ لاکھوں میاں بیوی ایسے موجود ہیں جو صحت مند ہونے کے باوجود اولاد جیسی نعمت سے محروم ہیں، کچھ بیماریاں اور حلوئے بھی ایسے ہو گزرتے ہیں کہ میاں بیوی دونوں میں سے کوئی ایک ناٹل ہو جاتا ہے تو کیا وہ بیویاں اپنے مردوں کو چھوڑ دیتی ہیں یا مرد اپنی بیویوں کی کہیں اور شادی کرانے کے متعلق سوچتے ہیں؟۔۔۔ وفا، حیا، مہر اور راضی بہ مشیت بھی اجلاچ ہیں۔۔۔ جاؤ، واپس اپنے گھر اور ماں باپ کو خوش رکھو۔ تم مرد پیدا ہوئے تھے، اپنی اس تکلیف کے باوجود بھی تم مرد ہو۔ اپنی بیمار سوچ سے پیچھا چھڑاؤ اور صرف یہی بات لے کر ماں باپ، خاندان، خود کو اور مجھے ذلیل و رسوا نہ کرو۔ جو کچھ تم پہ اور ہم سب پہ بیت چکا ہے، مجھے یقین ہے کہ تمہاری آنکھیں کھولنے کے لئے کئی ہو گا۔۔۔ میں یہاں تمہاری امانت ہوں۔ جب بھی اپنی امانت لینے آؤ گے، مجھے تیار پاؤ گے۔۔۔“

وہ اسے گھورتے ہوئے مزید کہنے لگی۔

”زلفی اچھا لڑکا ہے، تمہارا پیارا دوست اور میرا پیارا بھائی ہے۔۔۔ جاؤ، ان کے گھر بھی آؤ۔ اس نے تمہاری خاطر بڑی تنگ و دو کی ہے، شکریہ بھی ادا کرو اور اسے تسلی دلا سنا بھی دو۔ وہ سارے گھروالے بہت پریشان ہیں۔۔۔“

وہاں سے نکل کر شایان بڑے کمرے میں آیا۔ زلفی اور قاسم بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ زلفی شاید اسی کی راہ دیکھ رہا تھا، کچھ لمحوں بعد وہ اسے لے کر اپنے گھر بیٹھک میں آ بیٹھا اور اخباروں کا پلندہ اس کے سامنے دھرتے ہوئے کہنے لگا۔

”یہ دیکھو۔۔۔“ وہ نگہت کی تصویریں دکھانے لگا۔ تصویروں میں اس کی گلی سڑی اور عوری لاش کی تصویریں بھی تھیں جسے نگہت سمجھ لیا گیا تھا۔ ”شایان! ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ گھر گھر، گلی گلی لوگ تصویر دکھا کر اور ایک دوسرے کو اخباروں کی خبریں پڑھ کر سنار ہے ہیں، اسی وجہ سے محلے میں ہم اچھوت بن کر رہ گئے۔ پاس پڑوس والوں نے بھی آنا جانا، علیک سلیک چھوڑ دی ہے۔ جب پہلے دن اخبار میں تصویر چھپی تھی تو میں نے نگہت پہچان لیا تھا، والد صاحب اور گھر والوں سے چھپاتا رہا لیکن دوسرے روز ہی نگہت کے بہن ممائی، چند رشتہ دار خواتین کے ساتھ یہاں پہنچ گئے۔ پہلے تو گلی محلے میں ہمارے خلاف باتنا کرتے رہے، پھر ہمارے گھر آ کر دوا دلا کرنے لگے۔ اس کی بربادی اور والدہ کی موت کا زہر وہ والد صاحب کو ٹھہرانے لگا۔ والد صاحب کی طبیعت پہلے ہی خراب تھی، اس نئی اطلاع انہیں دورے پڑنے لگے۔ بڑی مشکل سے ان لوگوں سے جان چھڑائی۔ یہ نین پختے جا

ظہوری شاہ، استاد شفو، استاد قربان، حاجی رجب بیگم، مس عاشری، ایک ایک چہرہ سامنے تھا۔ بچے نے لوگ! آج جن کی خاک کی بھی خبر نہیں کہ کہیں ہے بھی یا اڑادی گئی۔ قہقہے اڑاتے، مہرے میلہ کرتے، وقت کے سینے پر مونگ دلتے لوگ! وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب کچھ اپنی جلدی ہو جائے گا۔ اسے جھرجھری سی آگئی۔ اسی تردد و ملال میں تراویح کا وقت آن لگا۔ آج ستائیسویں شب تھی۔ رحمتوں برکتوں کے نزول کی رات، بخشے بخشائے کی رات، درود کر اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کی رات۔۔۔ وہ جلدی جلدی کپڑے تبدیل کر کے زلفی کے ہاں آگیا، وہ باہر ہی نکل رہا تھا۔

”میں تمہاری طرف ہی آ رہا تھا۔۔۔“ زلفی بولا۔

”۔۔۔ اور میں تمہارے پاس، تمہارے قدموں میں پہنچ گیا۔۔۔“ شایان نے جواب دیا۔ گاڑی سٹارٹ کر کے گلی کے موڑ پہ پہنچنے تو سامنے خراماں خراماں فٹنی کرم الہی آئے دکھائی دیئے، شایان کے لبوں پہ مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ گاڑی روکی، پاس بٹھایا۔

”چاچا! بتاؤ بھلا، ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”پڑاویں، جہاں تمہیں اس وقت جانا چاہئے۔۔۔“ اس نے جواب دیا۔

☆☆☆

داتا دربار!۔۔۔ عام طور پر یہی یہاں اتار رش ہوتا ہے کہ زائرین اور عقیدت مند ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رہتے ہیں تاکہ کہیں ایک دوسرے سے پھٹ نہ جائیں اور رمضان شریف کے بابرکت مہینے میں تو یہ عالم ہوتا ہے کہ قدم جمائے کے لئے پاؤں تلے زمین نہیں ملتی۔ انسانوں کا سیلاب، ریلوں کی صورت میں آہستہ آہستہ سرکنا رہتا ہے۔ عالموں، فاضلوں، صوفیوں، درویشوں، ملنگوں، عقیدت مندوں کے پرے کے پرے بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ اعتکاف میں بیٹھنے والے سینکڑوں خوش نصیب والائوں، حجروں میں گوشہ نشین ہوتے ہیں۔ انظار پر طرح طرح کے کھانے، مشروبات، پھل، مٹھائیاں، انواع اقسام کی نعمتیں موجود ہوتی ہیں۔ پہروں پہلے نمازی اپنی جگہ محفوظ کر لیتے ہیں مگر ستائیسویں شب تو خدا کی خدائی جانے کہاں سے آ جاتی ہے ساری رات محفل شبینہ، درود و صلوٰۃ، ورد قرآن کی مجلس گرم رہتی ہے۔ دعائیں، گریہ زاریاں، التجائیں، ہر شخص عجز و انکسار کی تصویر بنا اپنے گناہوں پہ غلام شرمسار آنسوؤں کے دانہ دانہ نمونی روتا ہے۔ اک عجیب سا روح کو بھگو دینے والا ماحول ہوتا ہے اور وہ غفور الرحیم ہے، اپنے گناہوں پہ نادم ہونے والوں کو معاف فرما رہا ہے۔ وہ خوش ہوتا ہے کہ میرے بندے مجھ سے رحمت مانگ رہے ہیں۔ پھر وہ سچے دل سے توبہ کرنے والوں

کو آئندہ کے لئے گناہوں سے بچنے کی توفیق بھی عطا کر دیتا ہے۔ سچ بخش کا صدقہ! جو بھی جائز طلب لے کر آتا ہے، با مراد اور مطمئن ہو کر جاتا ہے۔

یہ تینوں بھی صحن کے درمیان ہجوم میں پھنسے بیٹھے تھے۔ ایک ساتھ مگر اندر سے علیحدہ علیحدہ، کسی کو کسی کا ہوش نہیں، تینوں اپنی اپنی چکی چلانے میں مگن تھے۔ اپنی اپنی لائن پہ، اپنی اپنی کال پہ اپنی اپنی سن سنائی کر رہے تھے۔ آنسو، آہیں، سسکیاں، لرزے ہونٹ، عرق آلود پیشانیاں، لرزاں ترساں چہرے، جھکے سر۔۔۔

پاس ہی مردان کے کوئی صاحب طریقت بزرگ ایک بڑے حلقے کے درمیان بیٹھے لا الہ الا اللہ کا درود کر رہے تھے۔ عجب وارفتگی کا عالم تھا۔ ذکر میں شامل حضرات زخمی کبوتروں کی مانند پھڑک رہے تھے۔ ذکر کی لے اور تواتر و تاثر کچھ ایسا وجد انگیز تھا کہ اس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کے دل خود بخود لا الہ الا اللہ کہتے ہوئے شامل حال ہونے پہ مجبور تھے۔ گرداب کی لہروں کی مانند ملتے پھیلتے چلا جا رہا تھا۔ یہ بھی جب اس سرمستی کی زو میں آئے تو ان کے قلب اور لب بھی جاری ہو گئے۔ یہ جہری ذکر مزاج! جلالی کیفیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ ذاکر کی اپنی باطنی بالیدگی اور ظرف و زہد پہ بھی منحصر ہوتا ہے کہ استغراق اور وجد و حال کے کس مقام پہ اس کا قلب حق بماندہ و تعالیٰ کی جمالی لطافتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے، سہم کر پھڑکنے اور ترپنے لگتا ہے۔

شایان بھی زخمی کبوتر کی مانند ترپنے پھڑکنے لگا۔ کسی کو کسی کی کیا خبر، کیا ہوش؟ گریباں چاک، منہ سے کف۔۔۔ دو زانوں ہاتھ جمائے، دائیں بائیں اس والہانہ انداز میں جسم اور سر پک رہا تھا کہ بنی ہوش و حواس انسان ایسا کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ اس سے پیشتر کہ یہ حالت وارفتگی میں ریزہ ریزہ ہو کر کہیں گم ہو جاتا، دو مشفق بازوؤں نے اسے اپنے برکون حصار میں لے کر سینے سے چمٹا لیا جیسے اک مدت کے بعد دو پتھرے ہوئے ملے ہوں۔ شایان بڑے سکون سے بابا جی کی گود میں سر رکھے جیسے سو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد مجلس برخواست ہو گئی، بابا جی ان تینوں کے ساتھ برآمدے میں آگئے۔ یہاں ان کا وقتی طور پر ہی قیام تھا۔ ان سے عقیدت رکھنے والے بھی وہاں موجود تھے۔ اپنے پہلو میں ٹھاکر ٹھنڈے مشروب سے ان کی تواضع کی، مزاج پوچھے۔ پھر بابا جی نے زلفی کو ایک سفید رومال پانی سے تر کر کے لائے کو کہا۔ اپنے ہاتھ سے شایان کے چہرے، چھاتی پہ کیلے رومال سے پچائی کی۔ ہوش و حواس قدرے بحال ہوئے تو شایان نے عالم وارفتگی میں جیج ماری اور پھر بابا جی سے لپٹ گیا۔۔۔ کافی دیر تک بابا جی اس کا سینہ سہلاتے رہے، تر رومال سے چہرہ اور ہاتھ پچھتے رہے۔ پندرہ منٹ بعد شایان گود میں پڑا کسی معصوم بچے کی مانند مسکرا رہا تھا، سر پہ ہاتھ

پھرتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰلَہُ اللّٰہُ پڑھ رہے تھے۔۔۔؟“

”جی۔۔۔ سب ہی پڑھ رہے تھے۔“ اس نے بڑے معصومیت سے جواب دیا۔

”ہاں، یہ محض پڑھنا ہے۔ سمجھ کر، جان اور مان کر پڑھنا اور بات ہے۔“ وہ پھر مسکراتے ہوئے پوچھنے لگے۔ ”اچھا بتاؤ کہ اگر کوئی عربی یا اردو سیکھنا چاہے تو اسے سب سے پہلے کیا کرنا چاہئے؟“

”جی، ظاہر ہے کہ اسے پہلے سیرنا القرآن یا اردو کا قاعدہ شروع کرانیں گے۔“

”صحیح۔۔۔ یعنی الف سے شروع کرنا چاہئے، لام سے نہیں۔ تو بیٹا! تمہیں بھی پہلے الف،

اللہ ہو سے ابتدا کرنی چاہئے۔ الف صیغہ اثبات ہے۔ اسم اللہ، احد ہے۔ اکبر و اعلیٰ، اول و آخر ہے۔ انسان فرشتوں، جنوں اور تمام مخلوقات سے اسی لئے اشرف ہے کہ اسے علم الاسماء سکھایا گیا اور علم الاسماء کی ابتدا الف سے ہوئی۔۔۔ غور کرو، القرآن کے اول تا آخر کا نچوڑ الفاتحہ ہے، سورۃ الحمد بھی الف سے شروع ہوتی ہے، قرآن بھی الف سے شروع ہوتا ہے۔۔۔ الف ل م، یعنی الف سے اللہ کو مانو، پوچھو۔ پھر ”ل“ کی لیلۃ الاسرا کو جانو، پھر ”م“ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مانو۔۔۔ لاصیغہ نفی ہے، کسی مبتدی یعنی نو آموز کا اس کی جلالی کیفیت سے دو چار ہونا عین ممکن ہے۔ پھر بغیر سوچے سنبھلے کسی مجلس یا عمل و ذکر کی محفل میں شامل ہونا ابتدا میں مناسب نہیں۔ کسی الف آگاہ کو امام پکڑو، الف کا آموختہ یاد کرو اور الف سے اُم۔ یعنی ماں کے آگے انگلی اٹھانا، آگ اٹھانا ہے۔ اب افضل اور انکار ابتری ہے۔۔۔ جاؤ، وضو کرو۔“

بابا جی کی باتیں بڑی گہبیر اور تہہ دار تھیں۔ دو چار پہلی ملاقاتوں میں بھی اسی طرح کی باتیں ہوئی تھیں۔ عام باتوں سے مختلف، کچھ تو سمجھ میں آتیں اور کچھ عقل و فہم سے بالا کہیں دل اور روح کی گہرائیوں میں اتر کر بیٹھ جاتیں۔ پھر آہستہ آہستہ گھلتے ہوئے اشاروں اور معنوں کے بلبلے، رنگ اور خوشبو کی پیکاریاں چھوڑنے لگتیں، خیالات اور سوچ کا روپ دھار کر کہیں، شعور میں مستور ہو جاتیں۔ بعد میں شعور انہیں وقت اور ضرورت کے مطابق عملی طور پر ظہور میں لاتا رہتا۔۔۔ بابا جی کی باتوں میں بھیگے ہوئے وہ غسل خانے کی جانب بڑھ گئے واپس پلٹے تو تلاش بسیار کے باوجود وہ کہیں نظر نہ آئے۔

\*\*\*

عید کا دن خوشیوں، پیچیدگیوں اور اس سا گزر گیا۔ زلفی کے گھر اس دن بھی ڈھنگ سے چولہا نہ جلا۔ گھر میں اداسی، بے چینی اور کرب نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ بدنامی، رسوائی

نرمندگی کی وجہ سے نہ کہیں آنا جانا ہوا اور نہ ہی کوئی عزیز و اقارب ادھر آیا۔ کچھ بھی تھا، اتنی ہی تو اسی کا خون، باپ کی بیٹی!

ادھر بوڑھے بیمار باپ کا خون شاید جوش مار گیا۔۔۔ اپنی کوتاہیوں کا احساس اسے ڈس گیا۔ ایسی رسوائی اور بیٹی، ایسے اذیت ناک انجام کے بارے میں کبھی سوچا تک نہ تھا۔ احساسِ غفلت نے اسے بے جا رکھا تھا، چپ اور خاموشی ٹوٹی تو دھاڑیں مار کر رونے لگتا۔ اردوں سے سر ٹکراتا، چنچا چلاتا کہ میری بچیاں مجھ سے بلاؤ۔ میں ان کا مجرم ہوں، میں ان کے معافی مانگوں گا۔ میں ہی اپنی بیٹی گھت کا قاتل ہوں، میں نے ہی اس کی ماں کو مارا ہے۔ مجھے نے لے جاؤ۔ اس کی اضطرابی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ باپ کی ذہنی اور جسمانی ترقی دیکھ کر زلفی کو یقین ہو چلا تھا کہ عنقریب اس گھر میں کوئی اور قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ ان سب کچھ دیکھ اور محسوس کر رہا تھا، کسی لمحے اس نے زلفی کو اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ قاسم، گھروالے بھی ان کے دکھ درد میں دل و جان سے ان کا ساتھ دے رہے تھے، درمیان میں ان کی دیوار ضرور تھی مگر گھر دونوں ایک ہی تھے۔ شایان کی تین بہنیں بھی آئی ہوئی تھیں بن تارا کے ساتھ زلفی کے گھر کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ شایان کی بہن شگفتہ جو میٹرک بعد کالج میں داخل ہو چکی تھی، زلفی کی امی کے سر پر غنڈے پانی کی پٹیاں لگا رہی تھی۔ دو سے وہ بخار میں مبتلا، چار پائی پہ پڑی ہوئی تھی اور دو روز سے شگفتہ بھی مادھران کے ساتھ ابی سے لگی بیٹھی تھی۔ نین تارا اور شایان کی بہن فرخ، نہ گھر کے دیگر کام پکڑے ہوئے۔ زلفی، قاسم، شایان، والد کے گرد بیٹھے انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

عید کا دن، محرم کے سوئس کی طرح گزر گیا۔ شام کے وقت کچھ واقف کار، محلے دار اظہارِ دل یا تمنا لگانے کے لئے آگئے۔ شایان کے والد اور ماموں بھی پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ والد نیم بیوشی کی حالت میں بے سندھ سے پڑے تھے۔ اچانک ان کی ناک سے پتلی ان کی لکیر نمودار ہو کر ان کی مونچھوں میں جذب ہو گئی، سر زور سے جھٹکا اور آنکھیں ماریں۔ زلفی نے فوراً ان کا سر تھام کر گود میں رکھا۔ ”میاں جی، میاں جی“ کہتے ہوئے لگا۔ قاسم فوراً ٹیلی فون کی جانب لپکا۔ عید کا دن، ڈاکٹر کہاں سے ملتا۔ فوراً اٹھا کر گاڑی ٹایا مگر میاں جی، شاید راستے میں ہی اپنا راستہ تبدیل کر کے کسی لمبے سفر پہ نکل گئے۔ انسان بھی کیا چیز ہے۔ اچھے دنوں میں خون، خوشی اور دولت کی ترنگ اور زعم میں العنان اور نمود بن کر زیر دست انسانوں کی قبرستوں کے فیصلے کرتا ہے مگر اس وقت وہ بانٹا کہ اس کی قسمت کا فیصلہ قادر مطلق نے ایکہ حقیر سے پتھر کو مقرر کر کے کر دیا ہے۔

گفتہ نے اندرون خانہ اپنی بے لوث خدمت، دل جوئی اور سلیقہ مندی سے ان مصیبت زدوں کو وصلے کا سہارا دیا ہوا تھا۔

چالیسویں کے بعد شایان کے والدین اور چھوٹی بہن فرح واپس چلے گئے، شایان اور شگفتہ میں رہے۔ زلفی نے شایان کو اور شگفتہ کو زلفی کی ماں نے جانے نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

گڈو اور جان، کراچی میں خوب دعوتیں اڑا رہے تھے۔ کراچی تو ہے ہی سیرپاٹوں، ڈنگ، پکنک اور دھومیں اڑانے کا شہر!۔۔۔ جان کو ریڈ روز کی تحویل میں دے کر وہ قدرے مطمئن ہو گئی تھی اور مکمل اطمینان تو تب ہوا جب اخباروں کے مطابق پولیس نے اسے مردہ یافت کر لیا تھا۔ وہ خوب ہنسی، کسی نامعلوم مردہ لڑکی کی تصویریں دکھا دکھا کر جان کی خوب مدد کرتی رہی۔ یہ امر بھی طمانیت بخش تھا کہ شے میں حراست میں لئے گئے افراد کو بھی مکمل مائدہ اور اطمینان کے بعد کلیئر کر دیا گیا ہے۔ اس خوشی میں مس ٹوٹنے سب دوستوں کو ایک نیوٹار ہوٹل میں دعوت دی تھی۔

ریڈ روز نے چند ہفتوں میں جان کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ اپنے خاص ڈاکٹر کے پرائیویٹ بنک میں اس کی پلاسٹک سرجری کروادی تھی، ریڈ روز خود بھی اپنے اس باکمال دوست کی اہمیت کا نمونہ تھی۔ یہ ڈاکٹر امریکہ کا تربیت یافتہ تھا۔ ایک مصور کی طرح وہ خستہ حال، کئی ٹی سوختہ صورتوں، جسموں اور اعضا کو نئی تازگی، نئی صورت اور خوبصورت انداز دے کر گویا م تراشتا تھا۔ خوبصورت لڑکیوں کا شوقین بھی تھا۔ اس کی یہ ضرورتیں ریڈ روز پوری کرتی م اور وہ اس کے کام آتا تھا، جان کے سلسلے میں اس نے کمال کر دیا۔ مختلف آپریشن، سرمائیز، عجیب و غریب انداز و نوغ، سوئی ٹانگوں کی جگہ لیزر سٹیمک اسی نے یہاں متعارف دوائی تھی۔ آپریشن کے نشانات تک باقی نہیں رہتے، نہ دکھائی دیتے ہیں۔ لیزر ہینڈنگ جی سے کھال کے نیچے بالوں کی جڑوں کو تلف کرنا یا مخصوص جگہ پہ بالوں کی افزائش کرنا بھی م کا کمال تھا۔ وہ امریکہ، فرانس اور انگلینڈ میں بے شمار تھیراور اوپیرا ہاؤسز کے فنکاروں کے کامیاب آپریشن کر چکا تھا۔ یہ فنکار مرد ہوتے ہیں لیکن کھیل کی روایتی ضرورت کے مطابق وہ لڑکوں کے کردار ادا کرتے ہیں، انہیں وجوہ کی بنا پر وہ اپنے اعضا کی پلاسٹک سرجری کرواتے ہیں۔ آواز کے علاوہ انہیں پہچاننا ناممکن اگر نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ پیرس، لندن، نیویارک کے بڑے بڑے اوپیرا ہاؤس انہی فنکاروں کے دم قدم سے ہیں۔ اسٹیج پہ ناچنے گانے لیا خوبصورت نازک اندام لڑکیوں کو تماشائی دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان پہ مرمتی

کراچی کراچی ضمیر کے شیشے کی ایک چھوٹی سی کراچی دماغ کی نس پھاڑ گئی تھی، کرے ایک بجکتیں سب۔۔۔ مکانات عمل نے ایک پل کی منہلت بھی تو نہ دی۔ کچھ کہا، نہ کچھ سنا۔ پاؤں جو تپا، نہ سر پگڑی۔ دماغ میں فزور وغرور کا گندابو ناک کی نالی سے بڑا بول بولنے والے منہ۔ گزرتیں گر کر جم گیا۔

یکے بعد دیگرے تین ناگمانی اموات۔ رسوائیوں، پریشانیوں اور مصیبتوں نے ان دونوں گھرانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مسلسل بے آرائی، شب بیداریاں، ذہنی تنکدر۔ ایک دوسرے سے بیزار، چلتے پھرتے مردے۔۔۔ مرنے پہ سو درے۔

مرنے پر سے پہ سب رشتہ دار اکٹھے ہوئے۔ نگہت کے ماموں اور دونوں بہنیں ہم آئیں، باپ کی میت سے پلٹ کر دل کھول کر روئیں۔ ماں بھی گئی، باپ بھی مر گیا۔ پھر گے شکوے اور طرح طرح کی باتیں۔۔۔ رشتہ دار تو پہلے ہی طلاق کی وجہ سے مخالف اور بد نظر تھے۔ زلفی کے والد کی موت کو قدرت کا فیصلہ اور اس کے کئے کا نتیجہ قرار دے کر ان کے زخموں پہ نمک چھڑکتے رہے۔ زلفی نے ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا، وہ انہیں کسی حد تک اپنی دل کی بھڑاس نکالنے میں حق بجانب سمجھتا تھا۔ بہنوں سے بہت اچھی طرح پیش آیا، اپنے والد مرحوم کی جانب سے ان سے معافی طلب کی اور درخواست کی کہ مرنے والے کو معاف کر دیں۔ اس طرح حسن اخلاق اور موقع مصلحت سے کام لے کر کسی حد تک ان کی شکر رنجی اور تلخی کو دور کیا۔

اس ابتلا کے دوران شایان کی سوچ اور فعل و فکر میں ایک نمایاں تبدیلی ظہور پذیر ہو چکی تھی، شاید قدرت نے اسے تماشائے رستہ روکنے کی خاطر یہ سارا تماشادکھایا تھا۔ نہ وہ لوگ رہے، نہ وہ مجلس اور محفلیں رہیں۔ جمیں، شامیں اور نہ وہ رت خرابے رہے۔ جہاں انداز بدلے وہاں اطوار میں بھی خاصی تبدیلی آئی۔ تلخی، اوقات اور خرابہ حالات نے اس کی زکست کھرج کھرج کر اس کے رگ و پے سے نکال دی۔ پانچ وقت پابندی سے نماز پڑھنے لگا، سنجیدہ باوقار گفتگو سے چار آدمیوں میں بیٹھا معتبر اور ذمہ دار دکھائی دیتا تھا۔ نین تارنے، غیرت کہہ کر اسے جھنجھوڑا تو تھا مگر بابا جی کی شفقت اور بروقت رہنمائی نے اسے اندر سے بھر گرفت میں لے لیا تھا۔ اس کا قلب آپو آپ ہی ”اللہ ہو“ کے آہنگ پہ دھڑکتا رہتا۔ اتنے جوہم جھیلے اور مسلسل جان توڑ پریشانیوں کے باوجود اس کے چہرے بشرے پہ ایک پرنور طمانیت جھلکتی تھی جیسے کسی لمبے سفر کے مسافر کے چہرے پہ منزل کے قریب پہنچ کر اطمینان، احساس جھلکتا ہے۔ اس نے زلفی سے دوستی، بھائی بندی کا حق نبھادیا تھا۔ ادھر شایان کی بہن

ہیں، انہیں تجھے اور گلدستے بھیجتے ہیں، آؤ گراف لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں بہت ہی کم شاید اس حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں کہ یہ فنکار اصل میں مکمل مرد ہیں، بال بچے دار ہیں۔

گنہت یعنی جان کی پلاسٹک سرجری مکمل ہونے کے بعد ریڈ روز نے اسے اپنے ہیلتھ سنٹر میں ہی ٹریننگ پے لگا دیا۔ یہ فل ٹائم جاب تھا، خود ایک سرسائیز کرنا اور سٹوڈنٹ کو بھی کواٹا۔ ٹو بھی اس کی ٹیچر تھی۔ اس نے اس کے لیے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے کے ڈھنگ کو تبدیل کیا، انگریزی میں بات چیت کرنا سکھائی جبکہ ریڈ روز اسے ایک خوشوار نڈر فاسٹر بنا رہا تھا۔ جو ڈو کرائے سکھائی، کمانڈو ایکشن سکھائے۔ اسے منشیات کے بارے میں بتایا کہ کبھی گھٹیا نشہ مت کرو۔ دیسی شراب، بھنگ چرس، حبش، ہیروئن، یہ گھٹیا لوگوں کی دلچسپیاں ہیں۔ یہ نشے انسان کے خیالات اور اطوار میں بے دخل پن اور بزدلی پیدا کرتے ہیں، اعلیٰ سوسائٹی میں یہ پسندیدہ نہیں ہیں۔ ہمیشہ سکاچ و سکی سمپسن اور اعلیٰ امپورٹڈ سگریٹ یا سگار پیو۔ چائے گھٹیا لوگوں کا مشروب ہے، وائٹ بھی نہیں بلکہ بلیک کافی پیو وڈ آؤٹ شوگر۔ منہ میں ہمیشہ چیونگم رکھو۔ گلے میں لاکٹ، بازوؤں میں ہوسلٹ اور ہمیشہ لائٹ شو ز پہنو۔ پولیس سے بھڑامت ڈالو، مک مکا کر کے جان بچاؤ۔ بد معاشوں، غنڈوں سے کبھی مت ڈرو۔ چاقو گھونپنے اور فائر کرنے میں ہمیشہ پہل کرو ورنہ مارے جاؤ گے۔ بات پکی کرو، وعدہ خلافی اور دھوکہ مت دو۔ جو احسان کرے اسے کبھی فراموش مت کرو۔ اس کے اعتماد کو دھوکہ نہ دو۔

جان نے بھی جی جان سے سب کچھ سیکھا۔ ٹریننگ کے دوران اس نے کسی مرحلے پہ بھی اپنے محسنوں کو مایوس ہونے کا موقع نہیں دیا بلکہ وہ ان کی توقعات سے بہت آگے بڑھ کر ہونہار اور قابل بھروسہ ثابت ہوا۔

ٹوٹو کے ایک بہت ہی کلوز فرینڈ کی آڈیو البم ریلیز ہوئی تو ایک فائیو سٹار ہوٹل میں پارٹی اریج تھی، پاپ میوزک اور ڈانس کا پروگرام بھی تھا۔ کلیمر کی دنیا کی ساری کریم مدعو تھی۔ اسٹیج، تھیٹر، کیٹ واک فیشن شو، میوزیشن، سنکر، ماڈل، ہر شو بزنس کے شعبہ کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ایک سے ایک حسین سوبر الٹرا لڑکیاں، اونچی سوسائٹی کے لوگ جن کا لہجہ، لباس، سوچ، انداز، کھانا پینا، ملنا ملنا، ہر چیز عام لوگوں سے الگ تھلگ ہوتی ہے۔ ان کی تہذیب بھی ان کی ثقافت اور روایات بھی علیحدہ۔ اس ملک میں رہتے ہوئے بھی ان کی اخلاقی کتابیں الگ، ان کی سماجی قدریں علیحدہ، ان کی مذہبی سوچیں جدا گانہ۔ ان میں اور ہم عامیوں میں وہی فرق ہے جو کسی گاؤں میں چرخی والے کھلے کنویں کے پانی اور فرانس سے منگوائے ہوئے منزل وائر میں ہے۔

یہ پہلا فنکشن تھا جس میں جان کو بصد خاص اہتمام لے جایا گیا۔ بلیک ڈنر سوٹ، میچنگ ہارو، اٹالین بلیک سٹیک لیدر شوز، سپورٹس کٹ بل، کان میں بلیک اسٹون رنگ ٹاپس، انگلی میں گولڈن ڈربیس رنگ۔ استقبال کرنے والوں میں وہ بھی ریڈ روز اور ٹوٹو کے ساتھ کھڑا تھا۔ کون جانے یہ مسکرا مسکرا کر استقبال کرتا ہوا سمارٹ سائنو جوان ایک یتیم ویسیر آفٹ زدہ غلوک الحال لڑکی ہے جس کی ماں ایڑیاں رگڑتے رگڑتے اس دنیا سے چلی گئی، جس کے بہن اور بھائی اس کی تلاش میں خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔ جو چند مہینے پہلے بڑے ذلیل قسم کے دوگوں میں چوبیہا کی طرح پھنسی ہوئی تھی، جو ان گنت لوگوں کی ہوس کا نشانہ بنی اور جس کا اصلی ام گنہت تھا، نقلی نام شمسہ اور فرضی نام جان ہے۔ جو کرپشن نہیں، مسلمان ہے۔ جس کی پیدائش پہ اس کے ماں باپ نے کہا تھا کہ ہمارے گھر اللہ کی رحمت آئی ہے۔ جو اپنی نسایت کا لگا گھونٹنے پہ مجبور ہوئی، جو خلاف فطرت زندگی بسر کرنے پہ بوجہ آیا ہوئی، جس کو کچھ خبر نہیں کہ اس کائنات کہاں ہے اور یہ یاد موسم کے بھٹکرا سے کس قعر غزلت میں لے جا کر پھٹیں گے؟۔۔۔ ایسی پارٹیاں، ریڈ روز اور ٹوٹو اکثر دیا کرتے تھے، ہوتے تو یہ پرائیویٹ اور سوشل فنکشن تھے مگر در پردہ ان کا اہتمام اور سارا بندوبست ہوٹل انتظامیہ ہی کرتی تھی۔ یہ لوگ صرف سامنے رہ کر ایسے پردہ گراموں کو سوشل یا پرائیویٹ گیدر رنگ کی شکل دیتے تھے۔ اعلیٰ طبقے کے عیاش دولت مند، وہ غیر ملکی سیاح یا کاروباری لوگ جو دوسرے ملکوں کی اوباش لورتوں سے ملنا اپنے وزٹ کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں۔ مقامی لوگ، ہوٹل میں ٹھہرنے والے متمول مہمان، بڑی بڑی کمپنیوں کے ایگزیکٹو، ریپ جو محض ایک آدھ شب کے لئے مہرتے ہیں اور جنگی وزٹ نمیری سیکرٹری کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ ایسے فنکشن ہوٹل کے وٹمنگ ایریا میں کھلے لان یا موسم کے مطابق کسی بڑے ہال میں ترتیب دیئے جاتے تھے۔ بے لوگوں سے ریڈ روز اور ٹوٹو کی باقاعدہ ملازم ترتیت یافتہ لڑکیاں بڑی خوبصورت پلاننگ کے تحت متعارف کرائی جاتیں جو خود کو پڑھی لکھی، آزاد خیال، کسی مخلص دوست کی متلاشی اور بے گھرانوں کی لاڈلی بیٹیاں ظاہر کر کے مقابل کو اپنے سحر میں پھانس لیتیں۔ پھر ہوٹل کی نائدار کاروں کی سیر، قیمتی شرابوں، مہنگے کھانوں، ہزٹل گفٹ شاپس سے بھاری خریداری کو اتارتیں۔ شب ب سری کے لئے عام کمروں کی بجائے ایگزیکٹو سوسٹس کے لئے فضا ہموار کرتیں۔ اس طرح جہاں ہوٹل والوں کو فائدہ پہنچتا وہیں ان کے بھی پورا بارہ ہوتے۔ خود بھی تندی اور تحائف کی شکل میں معاوضہ لیتیں۔ ”پرندے“ کو زیادہ سے زیادہ ہوٹل میں قیام کرنے پہ اصرار کرتیں۔ پرس کے آخری ڈالر، سولنگ، روبل، مین، لیرے، روپے تک ان کے

ساتھ رکھی رہتیں۔ کریڈٹ کارڈ بھی استعمال کروا لیتیں۔

ایسی کل گرلز بڑے بڑے ہوٹلوں کی لابی، لائون، کافی شاپس، ریسٹوران، بوبیک شاپ، سوئمک پول، ٹینس لان وغیرہ میں مختلف روپ، شاکل اور گٹ اپ میں ملیں گی۔ ریڈ روز اور ٹینا ٹوٹو اس قسم ہوٹلوں میں اپنی ٹرینڈ ملازم کل گرلز سے یہی بزنس کرواتے تھے لیکن یہ کلام اتنا منظم اور نیٹ ورک کی سہولتوں سے اتنا ایکوریٹ تھا کہ اس میں نہ تو کوئی قانونی مداخلت کا خدشہ تھا اور نہ کوئی اور پرائیلم۔ یہ لڑکیاں اپنے شکار کو اتنی خوبصورتی سے گندہ کرتی تھیں کہ وہ بے چارہ خود ہی منہ چھپائے بھرتا۔

اس پارٹی فنکشن میں ریڈ روز نے جان کو عملی طور پر اپنے اس کام کے کچھ نمونے دکھائے، اپنی لڑکیوں سے ملوایا۔ ریڈ روز نے اس کے دماغ میں بٹھادیا تھا کہ مرنا بہت آسان اور جینا بہت مشکل ہے۔ بازی ہار جاؤ تو پھر یا تو مر جاؤ اور اگر یہ نہ کر سکو تو پھر ہر صورت میں بازی جیتو چاہے اس کے لئے تمہیں کچھ کرنا یا بننا پڑے۔ اچھائی برائی، نیکی بدی، گناہ ثواب، بھوت، چ، دھوکا ایمانداری، زندگی موت، عورت مرد، سب کچھ بکواس ہے۔ ان چکروں اور ہیر پھیر میں مت پھنسو۔ تم کس طرح مقصد حاصل کر سکتے ہو، ہمیشہ اس پہ دھیان دو۔ تم نے لڑکی کی حیثیت سے کیا حاصل کیا؟ مردوں نے ہمیں لڑکی ہونے کی سزا دی۔ تمہیں خارش زدہ کیا بنا کر سڑک پہ پھینک دیا۔ تم اب لڑکی نہیں، مرد ہو میری طرح اور جو ٹیڑھی بات کرے، جو آنکھیں دکھائے، انگلیاں ڈال، ڈیلے نکال اس کی ہتھیلی پہ رکھ دو۔ سگریٹ پیو، شراب پیو، عیش کرو، دولت پیدا کرو۔ بازی جیتو کہ جو جیتا وہی سکندر اور جو ہار اودہ مداری کا بندر!۔۔۔

\*\*\*

اس پارٹی کے اختتام پہ کل اٹھارہ لڑکیاں کام سے لگی تھیں۔ دس لڑکیاں بطور ٹیڑھی سیکرٹری، پانچ پارٹ ٹائم ٹیلی فون اینڈنٹ اور تین روم میٹ اسٹنٹ۔ گڈو بھی لاہور کے کسی بزنس مین کی سیکرٹری کی حیثیت سے چوبیس گھنٹوں کے لئے آن جاب تھی۔ یہ لاہور کا ایک سکرپٹ اپورٹر تھا جس کا ایک آدھ بحری جہاز ہر مہینے کراچی پورٹ پہ لنگر انداز ہوتا تھا۔ لاہور میں ایسے بزنس مین چاہے بھائی چوک میں سری پائے کا ناشتہ کرتے ہوں مگر لاہور سے باہر اپنے کاروباری اسٹیشن کے مطابق کسی فائینوٹار ہوٹل سے کم کسی جگہ قیام نہیں کرتے۔ اپنے اکثر بزنس مینوں کو پھر ایک دو دنوں کے لئے لیڈی سیکرٹری کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے ٹیلی فون سے، کانفڈنٹ مکمل کرے اور متعلقہ محکموں اداروں سے اپنی پیشہ ورانہ مہارت سے کام لیتے ہوئے جلد سے جلد کام نکال سکے، باقی مسئلہ باس کے ذوق شوق اور ضرورت کے

باقی ہوتا ہے یا پھر لڑکی کی پیشہ ورانہ مہارت اور طریقہ واردات پہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح زبند پرواز کو زیر دام لاتی ہے۔

گڈو چوبیس گھنٹوں کے لئے آن جاب تھی مگر لاہوری باس نے مکمل فیاضی سے کام لیتے ہوئے پا مجبوراً اسے آٹھ گھنٹے بعد ہی فارغ کر دیا۔ گڈو کی پکنگ کل پہ جان اکیلا ہی اسے نہ ہوٹل پہنچ گیا۔ لابی میں داخل ہوتے ہی جان نے گڈو کو دیکھ لیا۔ وہ اپنے لاہوری باس کے تھ گفٹ شاپ میں کھڑی کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی ذرا پرے ایک صوفے پہ بیٹھ کر اس کے رخ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں ایک سمارٹ سانو جوان گڈو کے باس کے پاس آیا اور بالکل تھما کر ذرا بہت کر کھڑا ہو گیا۔ جان کے دماغ میں اک دم فلڈ لائٹ کی چکا چوند سی کیفیت اہو گئی، یہ تو وہی ریس کورس پارک میں تھپڑ والا شوکت ہے۔ غور سے دیکھا تو قدرے اہوال لگا۔ بھرا بھرا سا جسم مگر پہلے سے کہیں زیادہ سمارٹ۔ بالکل وہی تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ اس لاہوری باس کا ملازم ہے۔ لاشعوری طور پر جان نے منہ دوسری جانب پھیر لیا یہ چ کر کہ وہ اسے کہیں پہچان نہ لے۔ اوپر سے بہروپ کچھ بھی ہو، تھی تو وہ ایک لڑکی!۔۔۔ جب اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا تو وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے پھر اس کی جانب دیکھنے لگا، روہ، وہاں نہیں تھا۔ گڈو ابھی تک وہیں کھڑی کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس کا لاہوری باس باہر لان، گاڈون چیر پہ بیٹھا موبائل فون پہ کسی سے لاہوری زبان اور انداز میں جھگڑ رہا تھا۔ جان نے مرادھر ہر طرف دیکھا، وہ نظر نہ آیا۔ وہ سوچنے لگا کہ چلو اچھا ہوا، مل کر بھی کیا لینا دینا تھا۔ اس نے اسے اپنے دماغ سے جھٹکنا چاہا مگر وہ تو جیسے چمٹ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ماضی کے کسی دیں میں اتر جاتی، گڈو نے اسے دیکھ لیا اور وہ اس کے پاس چلی آئی۔

”ہیلو، جان!۔۔۔“ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”آئی ایم سوری، تم شاید کافی سے یہاں بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہو۔۔۔ دراصل میرے باس کا مزید ایک رات یہاں لئے کارپوگرام بن رہا ہے۔ اسے ایک ٹیلی فون کل کا انتظار ہے اسی لئے ابھی تک کوئی فیصلہ نہ ہوا رہا۔ تم یہیں بیٹھو، وہ ٹیلی فون لائن پہ ہے۔۔۔“

”کوئی مونی مرغی ہے۔۔۔؟“ جان نے آنکھ مارتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ مگر مرغی نہیں، لڑنے والا مرغا ہے۔۔۔“

”اکیلا ہے یا۔۔۔؟“

”اس کا ایک میل سیکرٹری بھی ساتھ ہے، وہ گفٹ صدر میں ٹھہرا ہے۔۔۔“

”یہاں ساتھ کیوں نہیں، سیکرٹری کو تو ساتھ ہونا چاہئے۔۔۔؟“

”جان! بڑے لوگ جب اپنے اسٹیشن سے باہر کسی بڑے ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں تو ان کے سیکرٹری بدل جاتے ہیں، خاص طور پر میل سیکرٹری کے لئے تو قطعی ہاس کے ساتھ رہنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔“

جان واپس آگیا کیونکہ گڈو مزید ایک رات کے لئے آن جا رہا تھی۔

☆☆☆

رات نو بجے کے قریب گلف ہوٹل میں شوکت کے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

”مسٹر شوکت بول رہے ہیں۔“؟“ استفسار کیا گیا۔

جی، میں بول رہا ہوں۔۔۔ فرمائیے؟“ جواب ملا۔

”مجھے پہچانا۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔ اگر آپ اپنے تعارف کی زحمت گوارہ فرمائیں تو میرے لئے آسانی ہو جائے گی۔“

”مجھے آپ کا تھپڑ ابھی تک یاد ہے اور آپ میری آواز بھی نہیں پہچان سکے؟“

ادھر کافی دیر خاموشی رہی۔

”آپ سن رہے ہیں یا۔۔۔؟“

”تم کہاں سے بول رہی ہو اور تمہیں میری یہاں موجودگی کا علم کیسے ہوا۔۔۔؟“ لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔

”میں اپنے ذاتی منہ سے بول رہی ہوں، باقی رہی بات کہ مجھے تمہاری یہاں موجودگی کا علم کیسے ہوا تو میں نے تمہیں آج ہوٹل میں دیکھا تھا۔۔۔ ظاہر ہے، میں کراچی میں ہی ہوں۔“

”تم مجھے وہاں کیوں نہیں ملیں۔۔۔ کیا تم یہاں آ سکتی ہو یا مجھے کہو تو میں پہنچ جاتا ہوں؟۔۔۔ سنو! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ اپنی زیادتی کی معافی مانگنا چاہتا ہوں، تم سے بہت سی باتیں کرنا ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ میں تمہیں کب سے تلاش کر رہا ہوں۔۔۔ تم کہاں تھیں؟“

”رکو، رکو۔ ذرا چھری کے نیچے دم لو۔۔۔ سنو! میں اس وقت تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ تم مجھے صرف لاہور کا اپنا کنٹیکٹ نمبر اور ایڈریس لکھو اور تو مہربانی ہوگی، فوراً۔۔۔“

اس نے اپنا ٹیلی فون نمبر اور پتہ لکھوایا اور اس کے بعد ادھر سے ٹیلی فون بند ہو گیا۔

وقت کا ایک ہاتھ اگر زخم لگاتا ہے تو دوسرا دست شفا بھی ہوتا ہے۔ وقت بڑے بڑے بڑے گھاؤ دھیرے دھیرے مندمل کر دیتا ہے۔ ناقہ وقت آہستہ آہستہ بڑی مست خرامی سے، آب و محال کے بڑے بڑے لقمہ ووق صحراؤں سے سرکتا ہوا، دکھ و اندوہ کی باورسوم سے پختا نا صبر و استقامت کی حدی خوانیوں میں مست الست امیدوں، مسرتوں اور کامرائیوں کے تان کی جانب رواں دواں رہتا ہے۔۔۔ بہن کا بچھڑنا، باپ کی ناگہانی موت زلفی کے لئے نہ بڑے حادثے تھے۔ انسان جہاں کچھ گنوا تا ہے۔ یقیناً وہاں سے کچھ پاتا بھی ہے، یہی رت کا اصول ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو یہ دنیا بہت جلد انسانوں سے خالی ہو جائے۔ انسانی دماغ مچھوٹی چھوٹی جزئیات تا دیر محفوظ رکھتا ہے وہاں بڑی بڑی باتیں سرے سے ہی نکال پھینکتا ہے۔ وہ یہ خود ہی فیصلہ کرتا ہے کہ کیا نکالنا ہے، کیا سنبھالنا ہے۔ اس طرح نسیان بھی بہت بڑی ن ہے۔ کسی چیز کو بھول جانا، دماغ سے نکال دینا انسان کے لئے بڑی آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ بھول جانا، کچھ یاد کر لینا، اسی طرح ہی زندگی اپنے بہاؤ پہ کسی ندی کی طرح بہتی رہتی ہے۔ چھوڑ جانا، کچھ لے کر آگے بڑھتے رہنا۔۔۔ شایان کی رفاقت اور دوستی اس کے لئے کسی نہ غیر متوقعہ سے کم نہ تھی۔ ہولے ہولے زلفی زندگی کی چہل پہل، جدوجہد اور ہمہ سہیوں جانب واپس لوٹ رہا تھا، جاڑے کی دھوپ کی مانند روزمرہ کی زندگی کی ضرورتیں ذمہ یان، اس کی بھڑھری ہوئی سوچیں، کا پنا لگی اداسیاں اور رخ بستہ اعتماد، جیسے نرم نرم تمازت، بحال ہو رہا تھا۔ شوروم، ورکشاپ میں باقاعدگی سے جانے لگا۔ پھر جمعرات، شایان کا کچر کر بٹھ گیا۔

”بھائی مجھے کچھ کرنے بھی دو گے یا اپنی گرہ میں سونٹھ کی گانٹھ کی طرح باندھ رکھو۔۔۔؟“

”مطلب۔۔۔؟“ شایان نے بڑے بڑے دیدے نکال کر پوچھا۔

”مطلب یہ کہ گھر جاؤ۔ امی، ابو، بہنیں راہ تک رہے ہوں گے۔ شگفتہ کئی ہفتوں سے یہاں پہ ہے، اداس ہو گئی ہوگی۔“

”تو صاف صاف کہو کہ تم مجھ سے اب تنگ آ گئے ہو۔۔۔ بھائی، سیدھی طرح کہو کہ میں دفع ہو جاؤں، دوسروں کے کندھوں پہ ہندوق رکھ کر کیوں فائر کر رہے ہو۔۔۔؟“

”ہاں، ہاں۔۔۔ اور کس طرح کہوں؟۔۔۔ جاؤ بھائی! تم جاؤ گے تو میں بھی کسی جانب دھیان دے سکوں گا۔ تمہاری موجودگی میں تمہارے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔۔۔“

شایان اسے گھوڑنے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”تم یقین سے کہتے ہو کہ میرے بعد تم سب کچھ ٹھیک ٹھاک سنبھال لو گے، اداس یا پریشان نہیں ہو گے؟“

”نہیں بھائی! کہہ دو یا، نہیں۔۔۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، اٹھ کر شایان کو اپنے سے لگایا لیا۔ ”ظالم! تیرے بغیر تو میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تو نہ ہوتا تو مجھے جینے کا

حوصلہ کون دیتا، کون مجھے سنبھالتا؟۔۔۔ مصیبتوں کی اس آندھی میں تو نے ہی تو میرا ہاتھ تھام رکھا تھا ورنہ میں زندگی سے پھڑک کر کبھی کا کہیں خس و خاشاک کی مانند اڑ گیا ہوتا۔۔۔“ پھر وہ

الگ ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ”شایان! بہت دن ہو گئے۔ کتنا بڑا کلیجہ ہے تمہارے امی ابو کا، محض میری دلجوئی کی خاطر تمہاری جدائی برداشت کر رہے ہیں۔۔۔ بابا! تم اب ان کے پاس

جاؤ، ان کی خوب خدمت کرو۔۔۔ میں خود کل تمہیں چھوڑنے جاؤں گا۔“

”تمہاری خواہش اور حکم یہی ہے تو ٹھیک ہے لیکن میں باباجی سے ملے اور ان کی اجازت کے بغیر نہیں جاؤں گا۔۔۔ داماد بار والی ملاقات کے بعد ان کا کہیں سراغ ہی نہیں ملا، پان کی

دکان پہ بھی نظر نہیں آتے۔ کہاں تلاش کریں انہیں۔۔۔؟“

”چلو، آج دکان پہ چلتے ہیں۔ ممکن ہے وہیں سے ان کا کوئی اتاپتہ مل جائے۔۔۔“

وہ اسی وقت اٹھ کر پان والی دوکان پر گئے تو وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ تو ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔

جمعہ کے دن صبح صبح زلفی، اس کی والدہ، شایان، شگفتہ اور قاسم شیخوپورہ روانہ ہو گئے۔ گھر والوں کے لئے گویا عید کا چاند آج ہی نظر آیا تھا۔ ماں تو دیکھتے ہی خوشی سے بیہوش ہو گئی

بوڑھے باپ نے ہچکیاں لیتے ہوئے اپنے بیٹے کو سینے سے چمٹالیا۔ دونوں شادی شدہ بہنیں بھی اتفاق سے آئی ہوئی تھیں، بھائی کو دیکھ کر بہنوں کی آنکھوں کے بند بھی کھل گئے۔ عجیب مل

تھا۔ قاسم اور زلفی بھی منظر نہ کر سکے۔ فوری طور دو کالے بکرے صدقہ کئے گئے۔ پاس پڑوس

عزیز واقارب، جسے جسے خبر ملی وہ دوڑا چلا آیا۔ ماں باپ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ گویا شایان

ناجہم ہوا تھا۔ پھولوں سے لاد کر دوپٹے کی طرح سچایا کر بٹھایا۔ شام کو تنہا قاتیں، دریاں کرسیاں لگ گئیں۔ بالکل شادی جیسی دعوت تھی۔ زلفی اور قاسم کی پذیرائی بھی اسی طرح ہوئی۔ بہت عرصے بعد ان حراں نصیبوں کو خوشی نصیب ہوئی تھی۔ زلفی کی والدہ ان کے لئے بہت سے تحائف لے کر آئی تھیں۔ شایان اور خاص طور پر شگفتہ کی طبیعت، سکھڑپے اور اخلاق ہمدردی کی بہت تعریف کی اور اس کڑے وقت میں ساتھ دینے پر شکریہ ادا کیا۔ شایان کے گھر والوں اور خاص طور پر بہنوں نے زلفی، اس کی والدہ کی خاطر عزت میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔

دوسرے روز زلفی کاروباری مصروفیت کی وجہ سے پھر آنے کا وعدہ کر کے واپس چلا آیا مگر اس کی والدہ اور قاسم کو انہوں نے اصرار کر کے روک لیا۔ زلفی کی امی کو تو جیسے شگفتہ نے اپنی

محبت، خدمت اور اخلاق سے دیوانہ کر دیا ہوا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، میٹھی نظروں سے اسے نکتے ہوئے تعریفیں کرتے نہ رکھتیں اور وہ بھی ”خالہ جی، خالہ جی“ کہتی رہتی۔ ان کی۔۔۔ پونی

ضرورتوں کا خیال رکھتی جیسے وہ پیدا ہی ان کی خدمت اور عزت کرنے کے لئے ہوئی ہو۔ شگفتہ کی بہنیں، والدین ان کے آپس کے پیار اور گہری دلچسپی کو محسوس کر رہے تھے اور شایان سے

بھی یہ سب کچھ چھپا ہوا نہ تھا۔۔۔ یونہی ایک روز سب سے بڑی بہن نے شایان سے کہا۔

”تم کچھ محسوس کر رہے ہو۔۔۔؟“

”مثلاً۔۔۔؟“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”۔۔۔ یہی کہ لاہور والی خالہ، شگفتہ کو بہت چاہتی ہیں۔ ہر وقت اس کی تعریفیں کرتی رہتی ہیں، ایک لمحہ بھی اسے ادھر ادھر ہونے نہیں دیتیں۔ مجھے تو دال میں کچھ ”کالا“ دکھائی

دیتا ہے۔۔۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”باباجی! شگفتہ نے ان کی بڑی خدمت کی ہے۔ خالہ کی جو حالت

نما وہ تم نے نہیں دیکھی، یوں سمجھو کہ تین موتیں چند دنوں میں ہو گئیں۔ اچھا بھلا خاوند چند دن میں بیٹھے بٹھائے رخصت ہو گیا۔ یہ نین تارا اور شگفتہ ہی تھیں جنہوں نے انہیں سنبھالا

رنہ ہمیں تو ان کی جان کے لالے بڑ گئے تھے۔ ابھی ان کا زمانہ آ رہا ہے، اسی وجہ سے شگفتہ ان کی دلجوئی میں لگی رہتی ہے۔۔۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو، میرے بھولے بھائی! اور میں بھی ٹھیک کہتی ہوں۔ عورت، عورت کی

نظر کو پچھاتی ہے۔۔۔ تم دیکھنا کہ بہت جلد خالہ، شگفتہ کا رشتہ مانگیں گی۔۔۔“ وہ بڑے

منگرنے انداز میں تھیلی پہ اپنی بھاری سی ٹھوڑی نکالتے ہوئے مزید بولی۔ ”ایک بات سمجھ میں

نہیں آئی۔ پہلے تو زلفی، نین تارا کے لئے اپنی دلچسپی دکھا رہے تھے، یہاں تک ساتھ تھا کہ وہ اگر شادی کرے گا تو اس سے، ورنہ وہ ساری عمر کنوارہ رہنے کا عزم کئے ہوئے ہے مگر اب تو پانا پانا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔“

”بال کی کھل نکالنے والی، میری باجی! ممکن ہے کہ کبھی زلفی نے ایسا سوچا ہو اور ایسے کہا بھی ہو مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ وہ تو اب اسے اپنی بہن سے زیادہ مان دیتا ہے، نین تارا بھی اسے اپنا بڑا بھائی سمجھتی ہے۔ نین اگر ارادے کی کچی ہوتی تو شاید یہ کام ہو بھی جاتا مگر میرے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ اپنے فیصلے اور ارادے پہ قائم ہے۔ ذہ ہر حالت میں مجھ سے شادی کی خواہاں ہے، زلفی بھی اسے میری منگیتر سمجھتا ہے۔“

”پتھر خالہ یہاں سے شگفتہ کا ہاتھ لئے بغیر نہیں جائیں گی۔۔۔ ویسے تمہارا کیا خیال ہے، زلفی کیسا لڑکا ہے۔ اس کا گھرانا، عادت، طبیعت۔۔۔ تم تو کافی عرصے سے اس کے ساتھ ہو، ہر بات جانتے ہو گے؟“

شایان، پریشان سا ہو گیا اور بولا۔ ”یہ سب باتیں تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو، انی ابو سے کرو۔ زلفی میرا بھائی ہے۔ دوست ہے، جان سے پیارا ہے۔ اس کو شاید مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ میں ایمانداری سے محسوس کرتا ہوں کہ میں جو آج اس حالت و صورت میں یہاں موجود ہوں تو یہ سب باباجی، زلفی اور قاسم کی وجہ سے ہے۔“

”یہ باباجی کون ہیں، کچھ تھوڑا بہت میں نے بھی ان کے بارے میں سنا ہے۔۔۔ ہیں کون کہاں رہتے ہیں۔۔۔؟“

”میں خود بھی کچھ نہیں جانتا کہ وہ کون ہیں، کہاں رہتے ہیں اور کیا ہیں لیکن جو بھی ہیں، خوب ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ مجھے، مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ ان سے کچھ بھی چھا ہوا نہیں ہے مگر وہ خود چھپے ہوئے ہیں۔ ان کی شخصیت۔۔۔ ان کی باتیں اور آنکھیں۔۔۔ اب اتھا، بیکراں سمندر کی مانند ہیں جن کی گہرائی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ صرف خوشبو کی لہر کی طرح انہیں محسوس کیا جاسکتا ہے مگر کسی بھی طرح گرفت میں نہیں لایا جاسکتا۔“ وہ زندگی اور توانائی عطا کرتی ہوئی کرن کی مانند ہیں جیسے دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے، پکڑا نہیں جاسکتا۔ وہ کہاں ملیں گے۔۔۔ کب ملیں گے، کیسے ملیں گے، اس کے بارے میں بھی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“ شایان باباجی کا ذکر کرتے ہوئے کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ وہ بھول ہی گیا کہ اس کے سامنے اسی کی بڑی باجی بیٹھی ہوئی ہے۔ جو بڑی بڑی آنکھیں اس کے چہرے پہ گاڑے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

زلفی آنے والی جمعرات، دوپہر کے کھانے سے قبل ہی شیخوپورہ پہنچ چکا تھا۔ وہ اپنی امی کو لینے، شایان اور قاسم کی خیر خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔ صحت طبیعت بھی ٹھیک تھی، موڈ بھی خوشگوار تھا اور کچھ سالان بھی ساتھ تھا جو شایان کے لاہور کے فلیٹ میں پڑا ہوا تھا۔ ”کو، مالے، بڑے بڑے قد باری انار اور شایان کے لئے انبالہ سویٹ والوں سے چم چم اور برنی بھی وہ لے کر آیا تھا۔ شایان میں ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کر کے زلفی بڑا خوش ہوا۔ صحت بھی ٹھیک ہو گئی تھی۔ گھر میں ماں، باپ اور بہنوں، عزیزوں کی خوشیاں، کھانا پینا، فراغت، محبت پیار، ان چیزوں نے شایان کے اندر سے ایک نیا شایان نکال دیا تھا۔۔۔ جمعرات کا دن باتوں، ملاقاتوں، خوش گہیوں میں گزر گیا۔ جمعہ سیر و تفریح کی نذر ہوا۔ شایان کے پرانے دوستوں سے ملاقاتیں رہیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد شام کے قریب زلفی نے ڈرتے ڈرتے امی سے واپس چلنے کے لئے کہا تو شایان نے اپنی بہن کو آواز دی کہ میرا سامان بھی باندھو۔

”تم کہاں جا رہے ہو۔۔۔؟“ زلفی نے اس سے پوچھا۔

”جہاں تم جا رہے ہو، میں بھی وہیں جاؤں گا۔“ شایان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”یہ سات دن میں نے بڑے صبر سے گزارے ہیں اور کل اگر تم یہاں نہ آتے تو میں آج خود ہی تمہارے پاس لاہور پہنچ جاتا۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نہیں چاہتے، میں کچھ کام وام کروں۔۔۔ بھائی! تم یہاں اپنے گھر، والدین اور بہنوں کے پاس رہو گے جو تمہیں دیکھ دیکھ کر جیتی ہیں۔ ویسے بھی لاہور تمہیں راس نہیں آیا۔“ زلفی نے بڑی آہستگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تمہیں راس نہیں آیا ہے۔۔۔؟“ شایان نے جیسے دھکتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

”پیارے بھیا۔۔۔!“ وہ اسے بچوں کی مانند پچھارتے ہوئے سمجھانے لگا۔ ”سمجھنے کی کوشش کرو۔ جو کہتا ہوں، اس پہ عمل کرو۔ گھر میں جو انہیں ہیں، زمانہ بڑا خراب

ہے۔۔۔ یہ کہتے کہتے وہ روہا ہوا گیا۔ ”جن بیٹیوں کے باپ اور بہنوں کے بھائی اپنی ذمہ داریوں کو نہیں سمجھتے ان کا شر نگہت، میرے میاں جی یا میرے جیسا ہوتا ہے۔۔۔“ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ شایان بھی اس کے سینے سے لگا رہا تھا۔ وہ پھر بولا۔ ”دیکھو، شایان! اپنے لئے جینا بھی جینا ہوتا ہے مگر دوسروں کے لئے جینا اصل جینا ہوتا ہے۔ تم اب والدین اور اپنی بہنوں کی خوشیوں کے لئے جیو گے۔۔۔ مجھے دیکھو، مجھ بد نصیب کو دیکھو جس کا باپ محض اس لئے مر گیا کہ ان کا ضمیر زندہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ضمیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ نہیں سکے۔ اپنی مذمت، غیر ذمہ داری، بے انصافی کے احساس نے انہیں ایک ناپسندیدہ موت سے ہمکنار کر دیا۔ مرتے وقت وہ کس ذہنی اذیت میں مبتلا تھے، اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔ ان کی آنکھ ایسی جھکی کہ پھر اٹھنے کے قابل نہ رہی۔ انہوں نے مجھ سے آنکھ ملائی، نہ اپنی بیوی سے جنہوں نے میری شکل میں اولادِ نرینہ کا تحفہ دیا تھا حالانکہ زندگی میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا تھا جب میرے والد صاحب بڑے مسرور تھے کہ انہوں نے نئی شادی والا فیصلہ درست کیا تھا۔۔۔ اور میرا خیال ہے، والد صاحب نے اپنے آپ سے بھی آنکھ نہیں ملائی۔ زبان پہ چُپ کی مر لگ گئی، ایک لفظ کسی سے نہیں کہا اور مر گئے۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی موت پہ کسی کو صدمہ نہیں پہنچا ہو گا اور یہ کہنا بھی ایک تلخ سچ ہو گا کہ ان میں ہم سب لوگ بھی شامل ہیں۔۔۔ ادھر میری مرنے والی بڑی امی کے صبر کا نتیجہ دیکھو کہ ان کی موت پہ اپنے تو اپنے غیروں نے بھی آنسو بہائے۔ نگہت کے انجام پہ ہر کسی کو افسوس ہوا اور میں نگہت کے لئے آج بھی پریشان ہوں، مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہے اور ایک دن ضرور ملے گی۔ میں اس سے ضرور ملنا چاہتا ہوں تاکہ اپنے والد صاحب کی کوتاہیوں کی معافی مانگ سکوں۔ اپنی دوسری دونوں بہنوں کو اپنے پاس لانا چاہتا ہوں، وہ میرا خون ہیں اور میں ہر قیمت پہ اپنے خون کی حفاظت کروں گا۔ میں اپنے مرحوم باپ کی غلطیوں کو دہراؤں گا نہیں بلکہ ان کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

شایان! تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم کبھی اپنے والدین اور بہنوں سے دور نہیں رہو گے۔ میں تمہارا دوست ہوں، بھائی ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا اور جب بلاؤ گے، آؤں گا مگر تم اپنے والدین اور بہنوں کی آنکھوں کا اجالا بن کر اسی گھر میں رہو گے۔۔۔“

ادھر یہ برسات برس رہی تھی اور اُدھر واقعی شایان کی بڑی بہن کی پیشین گوئی درست نکلی۔ واپسی سے تھوڑی دیر پہلے زلفی کی امی نے اپنی تیسری انگلی سے ایک نازک سی طلائی

انگوٹھی اتار کر نگہت کی انگلی میں پہنادی۔ شایان کی ماں نے کچھ کہنا چاہا تو جواب دیا۔ ”بہن! اور کوئی مطلب نہ نکالنے گا۔ یہ میں نے اپنی بیٹی کو بطور نشانی پہنائی ہے، انگوٹھی دیکھا کرے گی تو اپنی غم زدہ خالہ کو یاد کر لیا کرے گی۔۔۔ ویسے انشاء اللہ ہم بہت جلد آئیں گے اور اسی کی معافی، ماموں کو بھی ساتھ لائیں گے کیونکہ میں اب اس کے بغیر رہ نہیں سکتی۔۔۔“ بڑی باجی، شایان کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

گڈو تو جان کے ساتھ کراچی گئی تھی ورنہ اس کا اپنا ارادہ وہاں جانے یا وہاں سیٹ ہونے کا نہیں تھا، وہ اپنے پیلا کو اس عمر میں تنہا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی اور ویسے بھی اسے کراچی سرے سے ہی پسند نہیں تھا۔ وہ تو خالص لاہورن، پنجابن تھی۔ لاہور کی ریتوں، رسوں، میلوں، ٹھیلوں اور ہنگاموں کی دیوانی! یہاں پنجاب میں اسے اپنے گرد سب اپنے جیسے لگتے تھے۔ ایک بولی ٹھولی، رنگ پستانوا، کھانا پینا، نہریں دریا، بالغ تھیسر اور خاص کر اوچڑی، سری پائے، بونگ اور تلوں والے نان کچلے۔۔۔ کراچی میں اسے کوئی بھی اپنے جیسا نہیں لگتا تھا۔ ایک وجہ اور بھی تھی۔ اس کا پورا خاندان یہیں تھا۔ سب انگریزوں کے زمانے کے ریلوے ملازم تھے۔ ماں مر چکی تھی۔۔۔ بوڑھا باپ معدے کے امراض کا پرانا مریض! پینے پلانے، ریس اور میوزک کا شوقین۔ اتوار کے علاوہ سارا ہفتہ گھر بند رہتا۔ درجن بھر بیڑ کی بوتلیں، دو پیکٹ سگار، آدھی بوتل رَم اس کا لگا بند ہا ہفتہ وار راشن تھا البتہ اتوار کے دن صبح ہی صبح سردی ہو یا گرمی، پرانا تھری پیس سوٹ، ہیٹ نکٹائی بڑے اہتمام سے پہنتا اور چرچ جاتا۔ چرچ میں سب سے اگلے بچوں پہ اپنی مخصوص سیٹ پہ بیٹھ کر بڑے خشوع سے عبادت میں حصہ لیتا۔ پھر وہیں سے اپنے ایک دو پرانے فریڈز کے ساتھ لارنس گارڈن کی سیر کو جاتا، ریس کورس چلا جاتا جہاں بہت سے پرانے سائیں اور جاکی اس کے منتظر ہوتے۔ موضوع خن پرانے مرے کچے مشور گھوڑے، ان کی فتوحات، نسلیں، آباؤ اجداد ہوتے۔ مشور ڈربہ ریسوں کے قصبے ہوتے۔ پھر سو پچاس کی ہار جیت کر کے موڈ ہوتا تو کسی سینما ہال میں گھس جاتا، انگلش فلم دیکھتا اور رات گئے واپس پلٹتا تو پھر گڈو کو فلم کی سنوری اور ڈیلاگ سنا کر روبرو کرتا۔ اگر وہ باہر ہوتی تو بیڑ کا سلسلہ شروع کر دیتا، اس کو کچھ غرض نہیں تھی گڈو آدھی آدھی بلکہ اکثر رات بھر کہاں رہتی ہے اور کیا کرتی ہے۔ اس کا یہ سگار، شراب کا راشن پانی کہاں سے آتا ہے۔ چشم پوشی ہی وقت کا تقاضا تھا مگر اب گڈو کی غیر حاضری میں وہ بے انتہا چڑا ہوا گیا تھا، راشن میں قحط پیدا ہو گیا تھا۔ بیٹا اپنے مسائل میں الجھا رہتا اور وہ سارا دن کوائر کے اندر یا باہر کھڑا محلے داروں کو

انگریزی میں گالیاں بکتا رہتا۔ ویک اینڈ پہ گڈو نے بھائی کو خیر خیریت معلوم کرنے کے لئے ٹیلی فون کیا تو اس نے پیلا کی کیفیت بیان کر دی اور واپس لوٹنے کو کہا۔ گڈو اب جان کی جانب سے مطمئن ہو گئی تھی۔ وہ اس کو ریڈ روز اور ٹوٹو کے حوالے کر کے پہلی فرصت میں لاہور آگئی۔

☆☆☆

جان کو کراچی نے جی جان سے گلے لگا لیا تھا۔ اس کے گرد اتنی دلچسپی، ہنگامے، مصروفیات اور محبتیں تھیں کہ وہ لاہور کو بھول ہی گیا۔ ماضی کے متعلق سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ماں کی موت، بہنیں، شایان، زلفی، سب داستان پارہ نہ بن چکے تھے۔ چوبیس گھنٹے وہ ریڈ روز اور ٹوٹو کے ہمراہ رہتا۔ اپنے ہیلتھ سنٹر میں ٹریننگ اور کوچنگ کے علاوہ اور بھی کئی کام اس کے سپرد تھے جن میں سب سے اہم اور ذمہ داری کا کام کل گرلز کو ان اور آؤٹ کرنا تھا۔ ان لڑکیوں کا کوڈورڈ ”برڈ“ تھا۔ بکنگ کے مطابق یہ ہوٹلوں، کلبوں یا جس جگہ بھی ضرورت ہو، وہاں پہنچنا تھا اور پھر وقت پہ ان کو وہاں سے اٹھانا۔ پورا ان، آؤٹ کا ذمہ داری یہی تھا۔ ریڈ روز نے اس کو پورا اثریٹ کر دیا تھا۔ ریڈ روز نے اس کا سٹ لینے کے لئے مصنوعی چھڑے بھی کرائے، جعلی پولیس والوں کو اس کے پیچھے لگوا دیا، کسی دو نمبر یا س سے اس کا پھنڈا ڈلوادیا۔ چاقو چلانا، چین، بلٹ فاسنگ، باکسنگ، جوڈو اور کرائے، بہت کم عرصے میں یہ ایک خونخوار عفریت کی شکل میں کراچی میں متعارف ہو گیا۔ بائیں آنکھ کے اوپر زخم کا نشان، ٹھوڑی پہ کٹ، آنکھوں میں نڈری اور وحشت، سگریٹ، شراب۔

ایک دوپہر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھلی جیپ میں ہوا کے دوش پہ سوار ایئر پورٹ روڈ پہ جا رہا تھا۔ ریلوے کرسنگ ہالٹ کے پاس ایک نئی ٹیوٹا الٹی ہوئی نظر آئی، منی بس نے اسے بری طرح رگید دیا تھا۔ پولیس والے بھی کھڑے تھے۔ یہ بھی قریب آکر رکا کار کے مسافر ابھی تک اندر پھنسے ہوئے تھے۔ مدد کی غرض سے یہ بھی سارے نیچے اتر آئے۔ بڑی مشکل سے گاڑی سیدھی کی۔ دروازے پچک کر جام ہو گئے تھے، فرنٹ سکرین تو ڈکرتیوں آدمیوں کو باہر نکالا۔ جان کے سامنے بیہوش حالت میں شوکت پڑا ہوا تھا۔ گاڑی پر ایسیوٹ ہائیر کمپنی کی تھی۔ ڈرائیور کے علاوہ دوسرا شخص شوکت کالاہوری ہاں تھا جسے وہ ہوٹل میں گڈو کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ ڈرائیور بری طرح زخمی تھا، شاید اس کی ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی۔ باں قدرے ہوش میں جبکہ شوکت مکمل بے ہوش تھا۔ یہ اسی دن لاہور سے کراچی آئے تھے۔ ایسیوٹس آئی تو یہ انہیں لے کر ہسپتال آگیا۔ ٹیلی فون پہ اس نے ریڈ روز کو پیغام دیا کہ میرا ایک دوست حادثے کا شکار ہو گیا ہے، میں اسے لے کر ہسپتال جا رہا ہوں۔ شوکت کو سر اور سینے پہ

چوٹیں آئی تھیں، لاہوری ہاں کے ناک اور جڑے کی حالت خراب تھی۔ ہسپتال میں اس نے سارے کام خود کرائے۔ ایکس رے میں معمولی فریکچر کا نشان تھا۔ معمول کی ڈرائیونگ اور ٹریٹ منٹ کے بعد جب شوکت کچھ ہوش و حواس میں آیا تو ایک اجنبی کو پاس بیٹھے دیکھا۔ جان نے اسے بتایا کہ ایکسیڈنٹ کے بعد وہ ہی انہیں لے کر یہاں آیا ہے۔ شوکت نے اس کی انسان دوستی اور ہمدردی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کا تعارف چاہا۔ جان کو اس ٹیلے میں وہ بالکل پہچان نہیں پایا تھا۔ جان نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

”دوست! تعارف کی ضرورت نہیں، انسان ہونے کی ٹالے یہ اس کا فرض تھا۔“

شوکت نے بے حد اصرار کیا لیکن جان نے مسکراتے ہوئے اسے ٹال دیا۔ آخر شوکت نے اپنا تعارف کرایا، لاہور کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر لکھوایا اور درخواست کی کہ کبھی لاہور آئیں تو اسے میزبانی کا شرف بخشیں۔ جان نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور لاہور آکر اسے ملے گا۔ اس کے بعد شام کو پھر آئے کا کہہ کر وہ چلا آیا، واپس پہنچ کر اس نے ساری بات ریڈ روز کو بتائی کہ وہ کس طرح شوکت کو جانتا ہے، شوکت کے تھپڑ کا بھی ذکر کیا۔ اس کے کردار، اخلاق اور ہمدردی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی بہنوں کو دس ہزار روپے شوکت کی معرفت بھیجنا چاہتا ہے۔ ریڈ روز اور ٹوٹو نے اسے روپے دے کر خوشی اجازت دی کہ وہ ضرور اپنی بہنوں سے رابطہ کرے اور روپے بھیجے بلکہ پھولوں کا دستہ اور کچھ کھانے پینے کا سامان بھی دیا کہ شام کو ہسپتال جا کر شوکت سے ملے۔ شام کو وہ ہسپتال گیا تو معلوم ہوا کہ اس کا باں شام کی فلائیٹ سے لاہور چلا گیا ہے، وہ ایک دو روز یہاں رکے گا اور کل تک وہ ہسپتال سے فارغ ہو جائے گا۔ جان نے اسے بھدا اصرار کھلایا پلایا، ہر طرح سے اسے خوش رکھنے کی کوشش کی۔ دس ہزار روپے اور ایڈریس دے کر کہا کہ یہ روپے لاہور پہنچ کر اس نام اور پتے پر بھیج دیں، ساتھ ہی تاکید کی کہ وہ اپنا پتہ وغیرہ تحریر نہ کرے۔

☆☆☆

تہمت کی والدہ کے مرنے کے بعد، اس کی دونوں بہنوں کو اس کے ماموں اپنے ساتھ لے گئے تھے، رفعت اٹھارویں برس میں تھی اور فرحت اس سے ایک برس چھوٹی تھی۔ ان کے ماموں غلہ منڈی میں آڑھتی تھے۔ معمولی پڑھے لکھے متوسط طبقے کے شریف لوگ تھے، ایسے لوگ جو اپنی ناک رکھنے کے لئے اپنی گردن کٹوانے سے دریغ نہیں کرتے۔ تہمت کے والد نے دوسری شادی کر کے گویا ان کی ناک کاٹ دی تھی۔ تہمت کا باپ، ان کا بہنوئی ہونے کے علاوہ قریبی رشتہ دار بھی تھا۔ اس کے بلوچ مرنا جینا ختم کر دیا ہوا تھا۔ تہمت کی مرنے والی ماں بھی

اپنے بھائیوں کی طرح چھوٹے ناک والی نہیں تھی۔ اس غیرت والی نے بھی طلاق کے بعد بھائیوں کے دروازے پہ پڑنے سے انکار کر دیا تھا، نہ ہی گہت کے باپ سے کسی مالی اعانت کی طلب گار ہوئی تھی اور نہ شکایت کے لئے منہ کھولا تھا بلکہ اس کا مکان خالی کر کے ہر وہ چیز جس کا تعلق اس کے خاوند سے تھا، اتار پھینک کر بچیوں کو انگلی لگائے، شریدر ہو کر کرائے کے مکان میں اٹھ آئی تھی لیکن آج وہی لڑکیاں جو ننھی ننھی یہاں سے گئی تھیں، جوان ہو کر واپس ماموں کے گھر پہ آ پڑی تھیں اور ماموں اپنی ناک کی خاطر انہیں سہارا اور آسرا دینے پر مجبور تھا۔ اس ماموں کے دو جوان بیٹے بھی گھر میں موجود تھے، میٹرک نڈل تک پڑھے ہوئے اور باپ کے ساتھ آڑھت کی دکان پہ بیٹھتے تھے۔ اپنے خون کے نالے یا جوش و محبت میں انسان وقتی مصلحت کے تحت جذباتی فیصلے تو کر لیتا ہے مگر اسی شدت اور خلوص سے انہیں بھانا بڑا مشکل پڑ جاتا ہے۔ شاید ماموں بن کر یہی سوچا ہو کہ بہن کی لڑکیاں ہیں، گھر میں ہی نبٹ جائیں گی مگر وہ یہ بھول گیا کہ گھر میں اس کی ایک بیوی بھی ہے جو اس کے بیٹوں کی ماں ہے، اس کی کوئی اپنی خواہش اور سوچ بھی ہو سکتی ہے۔ جس دن سے یہ لڑکیاں گھر میں آئی تھیں، اسی دن سے وہ ہتھ سے اکڑی ہوئی تھی۔ اشاروں کنائیوں میں کئی بار سمجھا چکی تھی کہ وہ اپنے بیٹوں کی شادیاں اپنی بہن کے گھر کرے گی۔ ان لڑکیوں کا کہیں بند دست کو، گھر میں جوان بیٹے ہیں۔ وہ بھی اس کے اشارے سمجھ رہا تھا، اسی اذہیر بن میں تھا کہ کسی دن آرام تسلی سے وہ اپنی بیوی کو سمجھائے گا۔۔۔ بیوی نے ایک دن پھر اسے خبردار کیا۔

”میں کئی دنوں سے کہہ رہی ہوں کہ ان کا کہیں بند دست کرو مگر تم اُدھر سے سن کر اُدھر نکال دیتے ہو۔۔۔ مجھے لگتا ہے، تم اس گھر میں بھی کوئی تماشا لگوانا چاہتے ہو۔ پہلے کیا کچھ نہیں ہو چکا جو اور کوئی کسرباتی رہ گئی ہے۔ بوڑھے ہونے کو آئے مگر عقل نہ آئی، یہ تک نہ سوچا کہ گھر میں جوان بیٹے ہیں۔ میں ان لڑکیوں کو کہاں لے جا کر رکھوں گا۔۔۔؟“

وہ جھنجھلا کر اسے ڈانٹنے لگا۔ ”خواتواہ کوئی مسئلہ کھڑا مت کرو۔۔۔ ہماری بھانجیاں ہیں، بے آسرا اور یتیم۔۔۔ ہم سر پہ ہاتھ نہیں رکھیں گے تو اور کون رکھے گا؟۔۔۔ گھر میں جہاں پانچ کھاتے ہیں، وہ بیچاریاں بھی اگر دولٹے کھالیں گی تو کیا ہمارے رزق میں کمی آجائے گی؟“

”بات روٹی کپڑے کی نہیں۔۔۔ برانہ ماننا، مجھے ان کے لچھن کچھ اچھے دکھائی نہیں دیتے۔۔۔“

”کیا بک رہی ہو۔۔۔؟“ وہ مزید جھنجھلا گیا۔

”بک نہیں رہی، صبح کہہ رہی ہوں۔۔۔ مجھے پہلے بھی شک تھا مگر آج تو میں نے

خود رفعت کو مسعود کے کمرے میں اشارے کرتے ہوئے دیکھا ہے۔۔۔ اور سنو! مجھے شک ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ وہ چھپ چھپ کر ہاتھ روم میں سگریٹ بھی پھونکتی ہے، دوسری بھی ہر وقت کوٹھے پہ چڑھی رہتی ہے۔ اگر غلطی کر کے انہیں یہاں لے ہی آئے ہو تو فوراً کہیں لڑکے تلاش کر کے ان کو یہاں سے رخصت کرو۔ پہلے ہی ہماری بہت ڈگڈگی بچ چکی ہے، اپنے گھر میں مزید تماشا نہیں لگوانا چاہتی۔ تم تو مرد ہو، صبح گئے تو شام کو لوٹے۔ گھر میں تو میں رہتی ہوں۔ جو کچھ میں دیکھتی ہوں، تم نہیں دیکھتے۔۔۔ اچھا برا سمجھا دیا ہے، اب تم ذمہ دار ہو۔“

وہ اپنی بیوی کی فطرت کو جانتا تھا، بات کا بنگلہ بنانا اس کے بایں ہاتھ کا مکمل تھا مگر اس کے باوجود وہ اندر سے ہل سا گیا اور خاموشی سے نظریں جھکائے باہر نکل گیا۔

دوسرے روز ڈاکیا ایک رجسٹر لفافہ لے کر آگیا۔ ماموں کے نام تھا، مسعود نے دستخط کر کے وصول کر لیا۔ کسی نامعلوم نے دس ہزار روپے کا ڈرافٹ رفعت کے نام بھیجا تھا۔ نہ کوئی واضح پتہ، نہ کوئی خط۔ مسعود کی ماں کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رات خاوند آیا تو لفافہ سامنے رکھ دیا۔

”لو، یہ بھی دیکھ لو۔۔۔ میں نہ کہتی تھی کہ ان کے طور طریقے اچھے نہیں ہیں۔ خدا جانے، کس واقف کار نے یہ ڈھیر سارے روپے بھیجے ہیں۔۔۔؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا، کچھ دیر بعد بڑبڑایا۔ ”ہو سکتا ہے، زلفی نے بھیجے ہوں۔۔۔“

وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ”زلفی بھی تو اسی مرنے والے کا بیٹا ہے جس نے جیتے جی تو کبھی دس پیسے نہ دیئے، اب قبر میں جا کر دس ہزار بھجوائے گا؟۔۔۔ شوم کا بیٹا، اتنا خلی نہیں ہو سکتا۔۔۔“

ابھی یہ دس ہزار روپوں اور بھیجنے والے کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا کہ کچھ دنوں بعد ٹوبے کا ایک معزز آدمی جو لاہور میں ایک مشہور وکیل کا منشی تھا، شام کے وقت اس کے پاس آگیا۔ اس منشی کا ایک بھائی یہاں غلہ منڈی میں آڑھتی تھا جس سے گہت کے ماموں کے بھی کاروباری تعلقات تھے، اسی حوالے سے وہ یہاں پہنچا تھا۔ بات چیت کے دوران اس نے انکشاف کیا کہ کچھ دن پہلے ذوالفقار نامی ایک نوجوان اس کے وکیل صاحب کے پاس کسی قانونی مشورے کے لئے آیا تھا۔ وہ اپنی سوتیلی دو باغ کنواری بہنوں کو ان کے ماموں سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس سے تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد وکیل صاحب نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ خون کے رشتے سے ان کا بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے انہیں حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے بشرطیکہ وہ لڑکیاں بھی ایسا چاہیں۔ پھر جب اس نوجوان نے ٹوبہ ٹیک سنگھ

اپنے کمروں میں سہمے ہوئے تھے۔ بیوی سر پہ دوپٹہ باندھے، منہ پھلائے چارپائی پہ بڑی تھی۔ اس روز وہ مسجد سے لوٹا تو یہ پاگل ہتھنی کی طرح چنگھاڑی۔

”میں کہتی ہوں، روپے تو وصول کر رہے ہو اگر کل کلاں روپے بھیجنے والا ان کو لینے کے لئے آگیا تو کیا کرو گے۔“ محلے دار، رشتے دار گلی کو بچے والے اکٹھے ہوں گے، وہ رسیدیں دکھائے گا تو کیا جواب دو گے کہ تم کس مد میں اتنے پیسے وصول کرتے رہے ہو؟۔ میں تو صبح ہی بچوں کو لے کر اپنے میکے جا رہی ہوں۔ تم یہاں اپنی لاڈلی بھانجیوں کے ساتھ رہو اور کرو وصول رقیں۔“

وہ ہاتھ لہراہرا کر اس کی مرنے والی بہن کو کوسنے لگی، تبھی رفعت سامنے آکھڑے ہوئی، ہاتھ جوڑتے ہوئے التجا کرنے لگی۔

”ماموں! خدا کے لئے ممانی کو چپ کرائیں۔ سارا دن یہی کچھ ہوتا رہا ہے، ہمسائے دیواروں سے لگے ہمارا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ آپ ہماری وجہ سے اپنے گھر کا سکون برباد نہ کریں۔“ وہ ماموں کے پاؤں پر گر گئی۔ ”ہم تو ازل سے ہی بد نصیب ہیں۔ آپ ہمیں لاہور اسی مکان میں چھوڑ آئیے جہاں سے آپ ہمیں لائے تھے۔“

”ہاں، ہاں۔ وہیں جاؤ جہاں سے اتنے بڑے بڑے ڈرافٹ آتے ہیں۔“ ممانی نے لمبے بازو پھیلا کر کہا۔

”رفعت! کیا تم جانتی ہو کہ یہ رقم تمہیں کون بھیج رہا ہے؟“ ماموں نے آہستہ سے پوچھا۔ ”نہیں، ماموں! میں نہیں جانتی۔ مجھے کچھ علم نہیں کہ یہ کون بھیج رہا ہے۔ آپ کے سوا ہمارا ہے بھی کون۔“ وہ رونے لگی۔ ”ماموں! ممانی نے آج ہمیں بہت ذلیل کیا ہے، مسعود بھائی کے متعلق بہت بُرے بُرے الزام لگائے ہیں اور یہ بھی کہا کہ میں بھی گھت آپاکی طرح نشہ کرتی ہوں، سگریٹ پیتی ہوں۔“

ممانی دھاڑی۔ ”میں نے تمہیں خود سگریٹ کی ڈبیا ہاتھ میں لئے غسل خانے سے نکلتے دیکھا ہے۔“

ممانی بھی سچ کہہ رہی تھی۔ مسعود بھی کمرے سے نکل کر سامنے آگیا اور بولا۔ ”میاں جی! آپ کے آنے سے پیشتر میں بہت کچھ سن چکا ہوں، کسی وجہ سے میں خاموش تھا لیکن اب شاید میرے لئے خاموش رہنا ممکن نہیں۔ دراصل امی جان ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں اکثر غسل خانے میں چھپ کر سگریٹ پیتا تھا۔ اس دن میں سگریٹ کی ڈبیا وہیں بھول آیا تھا۔ میرے بعد رفعت بہن غسل خانے گئی اور واپسی پہ پیکٹ اٹھالائی، اکیلے میں مجھے ڈانٹا

اور آپ کا نام لیا تو میں ٹھٹکا۔ میں آج ادھر بھائی صاحب سے ملنے آیا تو آپ کی دکان پہ نظر پڑتے ہی مجھے وہ نوجوان یاد آگیا، خیال گزرا کہ چلو آپ سے ملتا چلوں اور اس نوجوان کے ارادے سے آپ کو آگاہ بھی کر دوں۔ رات کو اس نے بیوی سے ذکر کیا تو بیوی نے مشورہ دیا۔

”اللہ کے بندے! فوراً! انہیں ان کے بھائی زلفی کے سپرد کر کے سر دردی، مزید رسوائیوں اور پریشانیوں سے بچو۔ خون تو ان کا ہی ہے۔ ہم لاکھ سینے سے لگائیں، وارث تو وہی ہیں۔ ہم یہاں رکھ بھی لیں لیکن آخر ایک ان انہیں بیاہ کر رخصت تو کرنا ہی پڑے گا۔ جب تمہاری بہن ہی نہیں رہی، نہ ہی کبھی اس نے ہماری سنی تھی تو اس کی اولاد پہ ہمارا کیا دعویٰ ہو سکتا ہے۔ میری مانو تو ان کو، ان کے حوالے کر دو۔ وہ بیاہیں، نہ بیاہیں۔ ہماری بلا سے۔“

وہ گہری سوچ میں اتر گیا۔ کہتی ٹھیک ہی ہے۔ آج کل اپنی اولاد پہ کوئی حق دعویٰ نہیں تو دوسرے کی اولاد کو کوئی کہاں تک بچھا رہا ہے؟ سبکی بہن نے اپنی مرضی کی، یہ بھی اس کی اولاد ہیں۔ کہیں ماں کی طرح یہ بھی ناک نہ کٹا دیں۔۔۔ مگر یہ سب کچھ اتنا آسان بھی نہیں تھا، خود ان کا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے کر جانے سے تو رہا کہ آخر ناک، عزت برادری بھی تو کوئی چیز ہے۔ اسی شش و پنج، سوچ بچار میں تین چار ہفتے پر لگا کر اڑ گئے۔

ایک دن پانچ ہزار کا ڈرافٹ پھر آگیا، لاہور ہی سے بھیجا گیا تھا۔ زلفی کم از کم اتنی رقم بھیجنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ پھر اور کون ہو سکتا ہے؟۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ دوسرے دن وہ دونوں ڈرافٹ پکڑے اپنے بنک منیجر کے پاس چلا گیا۔ اس بنک سے اس کا پرانا کاروباری لین دین تھا۔ قدرے متردپا کر منیجر نے پوچھا کہ خیریت تو ہے، میاں جی! کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کے کہنے پر ڈرافٹ سامنے رکھتے ہوئے ساری پریشانی کھول کر رکھ دی اور کہا۔ ”کوئی شخص دشمنی سے پیسے بھیج رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔۔۔ بال بچے دار شریف کاروباری آدمی ہوں، کسی مصیبت میں ہی نہ پھنس جاؤں۔ کچھ آپ ہی مشورہ دیں، کیا کروں؟“

منیجر ڈرافٹس کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میاں جی! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ اصلی اور قاتل ادائیگی ڈرافٹ ہیں۔ آپ جب چاہیں، انہیں کیش کروا سکتے ہیں۔۔۔ ویسے اگر یہ وصول ہی نہ کریں تو یہ سلسلہ از خود بند ہو جائے گا۔“ دوسرے ڈرافٹ کے آنے پہ گھر کی فضا بڑی خراب ہو چکی تھی۔ بچے، بھانجیاں اپنے

کہ سگریٹ نوشی بری عادت ہے۔ اُنی نے اس کے ہاتھ میں ڈیبا دیکھ کر یہی سمجھ لیا کہ وہ خود سگریٹ پیتی ہے۔ باقی رقت اس وقت صبح بات بتا سکتی تھی مگر اس نے محض مجھے بچانے کی خاطر یہ الزام اپنے سر لے لیا۔ وہ بیچارہ تو مجھے منع کرتی ہے۔ میرا بستر درست کرتی ہے، کپڑے استری کرتی ہے مگر امی اسے غلط رنگ دیتی ہیں۔“

”کردیانا، جاؤ۔۔۔ یہ جاؤ گرنیاں ہیں، جاؤ گرنیاں۔ ماموں کو بھی تعویذ پلائے ہوئے ہیں اور اب مسعود کو بھی قابو کر لیا۔۔۔ ہائے، لوگو! میں برباد ہو گئی۔ کیرے پڑیں اس کی قبر میں، خود تو مر گئی اور اب مجھے مارنے کے لئے یہ جاؤ گرنیاں میرے تالو پہ بیٹھا گئی۔۔۔“ ممائی داویلا کرتے ہوئے سینہ کو پی کرنے لگی۔ اتنے میں میاں جی کا چھوٹا بھائی بھی آگیا، یہ تماشہ دیکھا تو آگے بڑھ کر بھائی کو دلاسا دینے لگا۔

”بھائی! خدا کے لئے، خاموش ہو جاؤ۔ کلی محلے والے تماشہ دیکھ رہے ہیں، یہ رونا پیٹنا ختم کرو۔۔۔“

”میرا رونا پیٹنا تو اس وقت ختم ہو گا جب یہ اس گھر سے دفع دفعان ہوں گی۔۔۔“ اس نے کس کر دوپٹہ سر پہ باندھ لیا۔

”آپ خاموش ہو جائیں، میں انہیں اپنے گھر لے جاتا ہوں۔۔۔“

بھائی کو تسلی دے کر وہ بڑے بھائی کو لئے دالان میں آگیا، کچھ دیر دونوں بھائی صلاح مشورہ کرتے رہے اور پھر اندر واپس آئے۔

”رفت، فرحت! تم دونوں تیار ہو جاؤ اور میرے گھر چلو، یہ کل کل اسی طرح ختم ہو گی۔۔۔“

فرحت ہاتھ جوڑتے ہوئے فریاد کرنے لگی۔ ”ماموں جی! ہمیں کسی کنویں میں دھکیلا ہوا تو ساتھ لے جائیں ورنہ ہم نہیں جائیں گی۔۔۔ باپ دیکھا، بھائی اور بہن دیکھے۔ ماں نے بھی ہم بد نصیبوں سے دامن پاک کر لیا۔ بڑے ماموں بھی مجبور۔۔۔ ہم کہاں ماریوں کو اپنے گھر لے جا کر کیوں ہم سے دوسرا ماموں بھی چھیننا چاہتے ہیں۔ رات کی رات ہم بے منزل مسافروں کو کسی کونے میں جگہ دے دیں، صبح ہم خود ہی کہیں چلی جائیں گی۔ خدا کی وسیع زمین پہ کہیں نہ کہیں تو ہم یتیموں یسروں کے لئے جگہ ہو گی۔۔۔“ اس کے آنسوؤں کی چھاگل اچھل پڑی تھی۔

ان یتیم بے نواؤں کی آہ و فریاد سے شاید آسمان کا کلیجہ بھی شق ہو گیا تھا۔ اس رات خوب آسمان رویا، بجلی کڑکی، گلیاں اور بازار جل تنہا ہو گئے تھے۔ بارش تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں

لینے تھی۔ ہر ظلم کی کوئی انتہا، ہر صبر کی کوئی حد اور ہر آزمائش اور امتحان کا کوئی نتیجہ ہوتا ہے۔ انسان اچھی، بُری اپنی تدبیریں کرتا ہے مگر تقدیر اپنے فیصلے صادر کرتی ہے۔ رات بھر کوئی بھی نہ سویا۔ بھاری بھاری سر، سوجے ہوئے سرخ پیوٹے، فیند کی ٹوٹ سے ٹوٹی ہوئی آنکھیں، آجڑے آجڑے اجنبی چہرے۔۔۔ شاید آنکھوں اور آسمان کا پانی ختم ہو چکا تھا۔ دن کو اُجلی اُجلی نہری دھوپ نکل آئی تھی۔ ابھی سب جاگ ہی رہے تھے کہ باہر ایک کار آکر رکی۔ سادہ سے کپڑوں میں ملبوس ایک اڈھیر عمر کی خاتون باہر نکلی، اطلاعی کھنٹی پہ مسعود نے دروازہ کھولا۔

”بیٹا! آپ کے والد اور والدہ گھر پہ موجود ہیں۔۔۔؟“ آنے والی نے پوچھا۔

”میاں صاحب بھی دروازے پہ آگئے۔“

”کہئے، بہن جی! کس سے ملنا ہے۔۔۔؟“

”میاں جی! مجھے آپ ہی سے ملنا ہے، اجازت دیں تو اندر آ جاؤں۔۔۔؟“

”آپ کہاں سے آئی ہیں۔۔۔؟“

وہ سائیز میں کھڑی کار اور اس کے اندر دو آدمیوں کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر قدرے پریشانی کے عالم میں پوچھنے لگے۔ وہ ان کی پریشانی اور تردد کو بھانپتے ہوئے بڑی نرمی سے کہنے لگی۔

”میں لاہور سے آئی ہوں اور آپ کی مرحومہ بہن کی جگہ پہ ہوں۔۔۔ گاڑی میں رقت، فرحت کے بھائی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر ایک بھائی کو اپنے بھائیوں اور بہن کا آنا ناگوار لگتا ہو تو میں بغیر کسی خشکی اور ملال کے انہی قدموں سے واپس چلی جاتی ہوں۔۔۔“

وہ انہیں پہچان چکا تھا۔ چند ٹائپے کھڑا سوچتا رہا۔

”آئیے۔۔۔؟“ وہ راستہ چھوڑتا ہوا بولا۔ ”اپنے بچوں کو بھی بلا لیجئے۔“

انہیں بینک میں بٹھا کر، اپنے بھائی کو لے کر وہ بیوی کے کمرے میں آیا۔ لال بھو کا چہرہ لئے وہ بخار میں تپ رہی تھی، پاس چارپائی پہ بیٹھے ہوئے بڑے محل اور آہستگی سے کہنے لگا۔

”ہم نے تیری بات مان لی ہے۔ پھر بھی ایک انسان اور تیرا عجازی خدا ہونے کے ناطے نور کہوں گا کہ تو بھی اولاد والی ہے، تیرے پاس بھی ممتا کا مان ہے۔ ان یتیم اور بے آسرا بچوں کے بارے میں اپنا دل صاف کر اور خدا سے معافی مانگ۔۔۔ تو اگر کسی بھی وجہ سے ان کو اپنے گھر نہ لے سکتی تو کم از کم نہی خوشی، بھلی دعاؤں کے ساتھ انہیں اپنے گھر سے نصرت تو کر۔۔۔ وہ لوگ انہیں لینے آئے ہیں۔ جو کچھ بھی ہوا، اسے بھول کر ہمیں ان بچوں کی بہتری کے لئے سوچنا چاہئے۔۔۔“

”کون آئے ہیں۔۔۔؟“ وہ آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”بچوں کی ماں اور بھائی۔“

وہ دوپٹے سے سر ڈھانپتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی، پوچھنے لگی۔ ”وہ لے جانے کے لئے تیار ہیں؟“

”اللہ کی ہمدی! اٹھ تو ہسی، انہیں چائے پانی پوچھ۔“ وہ اُسے اٹھاتے ہوئے بولا۔

”اپنی بھانجیوں سے کہو کہ انہیں چائے پانی پلائیں، میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”گھر کی مالک تم ہو، وہ نہیں۔ وہ تو کچھ دیر کی مہمان ہیں۔ اٹھو، گھر میں دشمن بھی آ جائے تو اس کی عزت کرنی چاہئے۔“

وہ اسے سمجھا کر بھانجیوں کے کمرے میں آیا۔ ان دونوں غریبوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ پریشانی، رونادھونا اور رات بھر کے جگراتے نے ان کے پھول سے چہرے کلا کر رکھ دیئے تھے۔ بڑی محبت سے رفعت کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

”میری بچیو! تم دونوں میری مرحومہ بہن کی نشانی ہو، مجھے اپنے بچوں سے بھی زیادہ عزیز ہو۔ میں نے تمہاری ماں اور تمہاری خاطر کیا کچھ نہیں کیا مگر کوئی کسی کے نصیب کے لکھے کو نہیں بدل سکتا۔ تم دونوں کو یہاں اس کے لئے لایا تھا کہ تمہیں ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہو، تمہیں اپنی بیٹیاں بنا کر اتنی خوشیاں دوں کہ تم اپنے سارے دکھ بھول جاؤ مگر یہاں بھی میں تمہارے مقدروں سے مار کھا گیا۔“

رفعت کی آنکھوں کے آبلے پھوٹ پڑے، بولی۔ ”ماموں! ہم جانتی ہیں کہ آپ ہم سے کتنا پیار کرتے ہیں اور یہ بھی سمجھتی ہیں کہ آپ کتنے مجبور ہیں۔ آپ ہماری خاطر اپنا گھر خراب نہ کریں، ہم اپنے نصیبوں پہ شاکر ہیں۔ آپ ہمیں کسی دارالامان میں چھوڑ آئیں۔ اگر اس میں بھی آپ کی عزت میں فرق آتا ہو تو پھر لاہور چھوڑ آئیں اسی پرانے مکان میں، حاجی صاحب ہمیں آسرا دے دیں گے۔“

”ہاں! اب تمہارے لئے لاہور ہی رہنا بہتر ہے رفعت بیٹی!۔ لاہور پہ یاد آیا۔ وہاں تمہارا بھائی ذوالفقار اور امی بھی تو رہتی ہیں، ان کے ہاں جانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”ماموں! سگے باپ نے ہمارا خیال نہ کیا تو سوتیلی ماں اور بھائی سے کیا امید ہو سکتی ہے؟۔۔۔ ان کے ٹکڑوں پہ پڑنے سے تو موت کہیں بہتر ہے۔“

”بیٹی! انسان خطا کا پتلا ہے، غلطیوں کرنا اس کی فطرت میں شامل ہے لیکن ایک خوبی بھی اس میں موجود ہے کہ جب اسے اپنی غلطی یا گناہ کا احساس ہو تا ہے تو اس پہ تادم ہو کر توبہ پکڑتا ہے۔ پھر یہی انسان معصوم فرشتے کی طرح پاک اور بے ضرر ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان

دلوں کا ضمیر بھی جاگ گیا ہو، وہ اپنی غلطیوں پہ شرمندہ ہوں اور اب اپنی کوتاہیوں کا تدارک کرنا چاہتے ہوں۔ بیٹی خون، اپنے خون سے زیادہ عرصہ دور نہیں رہ سکتا، آخر تم دونوں ہو ذوالفقار کے باپ کا خون اور تم نے خود کئی بار ذکر کیا ہے کہ ذوالفقار نے ہمیشہ تم سے اچھا ملوک کیا ہے۔ کئی بار وہ آپ لوگوں کے پاس آیا اور مدد کرنی چاہی۔ میرا اپنا خیال ہے کہ مل قصور وار تمہارا باپ تھا اور کسی حد تک تمہاری ماں بھی، خدا ان دونوں کو معاف کرے۔ دونوں اب موجود نہیں، اپنی اپنی اچھائیوں برائیوں کی ٹوکریاں اٹھائے اپنی اپنی منزل کی طرف چلے گئے مگر تم لوگ تو ابھی اپنی شروعات کر رہے ہو۔ آگے لمبی مسافت ہے۔ سمجھداری، نیت اور آبرو کا تقاضا یہی ہے تم ایک خون، اب ایک ہو جاؤ۔“

”ماموں آپ بڑے ہیں، اونچ نیچ سمجھتے ہیں۔ جو مناسب سمجھیں، کریں لیکن اپنے گھر لایا پیدا نہ ہونے دیں۔“

”شمالاش! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ جتنے دکھ دیکھے، اتنے سکھ دکھائے۔ اٹھو، دونوں نہ ہاتھ دھو کر بیٹھک میں آ جاؤ۔“

رفعت اور فرحت جب کمرے میں داخل ہوئیں تو ماموں، ممانی ممانوں سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ سلام کر کے سامنے صوفے پہ بیٹھ گئیں۔ زلفی کی امی نے دونوں کو بلا کر سر پہ تھ پھیرا، پاس بٹھالیا۔ پھر سلسلہ کلام دوبارہ شروع کرتے ہوئے بولیں۔

”بھائی جی! میں پہلے عرض کر چکی ہوں کہ مقدر میں جو مصیبتیں، پریشانیاں یا آزمائشیں صی ہوتی ہیں، انسان کو ان کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ لوگوں کا ہم سے ناراض ہونا بالکل بنتا ہے، وہی آپ والی بات کہ انسان جب جوانی، طاقت، دولت یا کامیابی کے سرےٹ گھوڑے پہ اتر ہوتا ہے تو اسے دائیں بائیں، آگے پیچھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اپنے آپ کو عقل کل کا ل اور وقت کا سکندر تصور کرتے ہوئے راستے کے پتھر، پھولوں کو ٹھوکروں پہ رکھتا ہوا آگے بھاڑتا جاتا ہے۔ اسے کیا خبر کہ بے خبری میں اس نے کیا کچھ کھودیا، کیا کچھ برباد کر دیا تا آنکہ نیت کی کوئی ٹھوکرا اسے زمین چاٹنے پہ مجبور نہ کر دے۔ اللہ ان کی خطائیں معاف کر دے، وہ لوں اب موجود نہیں۔“

”ہاں، بہن جی! آپ نے صحیح کہا ہے۔ انسان غلطیوں تو کر لیتا ہے، بعد میں پچھتا تا ہے اور ناتوبہ نصیبوں کو پچھتانے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔“

رفعت کے ماموں نے شاید یہ اشارہ ان کے مرنے والے شوہر کی طرف کیا تھا۔ زلفی کی رائے مکمل ضبط سے ان کا یہ طنز برداشت کر لیا، کہنے لگیں۔

در میں ایک شریف آدمی ہوں۔۔۔ وہ مسکرا رہا تھا۔۔۔ زلفی نے اپنا اور شایان کا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں اس لڑکی کا بھائی ہوں جس کے نام آپ نے یہ ڈرافٹ بھیجے ہیں۔۔۔“

بوکت نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ لچ میں شریک ہو جائیں، مجھے بے حد خوشی ہو لی اور جو کچھ آپ پوچھنا چاہیں، وہ بھی پوچھ لیں۔۔۔“

وہ تینوں نیچے ایک زیسٹوران میں کونے والی میز پر بیٹھ گئے۔ کھانے کے دوران ہی بات شروع ہوئی۔ زلفی اور شایان کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کا واسطہ ایک شریف اور معقول دی سے بڑا ہے اس لئے وہ بھی نہایت اطمینان سے اس کی دعوت پہ یہاں تک چلے آئے تھے۔۔۔ شوکت نے ہی بات شروع کی۔

”ذوالفقار صاحب! آپ غالباً“ نگہت بی بی کے سوتیلے بھائی ہیں اور شایان صاحب۔۔۔؟“

”جی“ آپ کا اندازہ درست ہے۔۔۔ اور شایان صاحب بھی مجھ سے بڑھ کر اس کے بھائی۔۔۔“

وہ خوبصورتی سے مسکرایا، بولا۔ ”بہت خوب!۔۔۔ اب آپ مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں۔ میں نگہت بی بی کو کیسے اور کب سے جانتا ہوں۔۔۔؟“

پھر اس نے ہسپتال میں نگہت سے پہلی ملاقات، دوسری، تیسری، ساری بات تفصیل سے دی۔ ریس کورس پارک میں ہونے والے واقعہ کو بھی من و عن بیان کر دیا۔۔۔ کہنے لگا۔

”اگر چاہتا تو ان باتوں کو حذف کر سکتا تھا جو ایک بھائی کے سامنے اخلاقاً“ نہیں کرنی چاہیں۔ میں نے ایسا نہیں کیا۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ جو مجھ تک پہنچے ہیں، یقیناً“ غیر معمولی بات کے تحت آئے ہیں اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں آپ کو معمولی معمولی بات سے بھی آگاہ کر دوں، کم از کم جو میں جانتا ہوں۔ پھر بھی آپ کو کچھ ناگوار گزرا ہو تو میں ذرت خواہ ہوں۔۔۔“

پھر اس نے کراچی والی ساری بات بتائی کہ کس طرح نگہت نے اسے ٹیلی فون کیا، کیا کیا بن گئیں۔ اپنا ایڈریس یا حالات بتائے بغیر ٹیلی فون بند کر دیا اور یہ بھی کہ نگہت نے اس کا در کاپتہ اور فون نمبر بھی لے لیا تھا مگر ابھی تک رابطہ نہیں کیا۔۔۔ دونوں اس شریف آدمی باتیں سن رہے تھے، خوش بھی تھے کہ نگہت کی سلامتی کی کوئی خبر ملی اور متردد بھی کہ وہ اپنی میں کہاں ہے، کیا کر رہی ہے، کس حال میں ہے اور جان کون ہے، اس کے پاس ان کے

”بھائی جی! آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ مرنے والے مر گئے۔ اچھے بھلے، جو بھی تھے، چلے گئے لیکن جو ہم زندہ ہیں انہیں تو وہ غلطیاں دہرانا نہیں چاہیں جو انہوں نے کیں۔۔۔ مختصر سی زندگی صرف نفرتیں اور ضدیں پالنے کے لئے نہیں ہوتی۔ محبت کرنے، خوش رہنے اور دوسروں کی خطائیں معاف کرنے کے لئے بھی کم ہوتی ہے۔ آج میں مل ہونے کے ناطے، اپنی بچیوں کو لینے آئی ہوں۔ شاید ان معصوموں کی خدمت سے ہماری غلطیوں کو تابیوں کی کچھ تلافی ہو سکے اور ان کے مرحوم باپ کی بے چین روح کو کچھ سکون مل سکے۔۔۔“

رفت کی ممانی بولی۔ ”بہن! کہنے کو تو بہت کچھ ہے مگر آپ کی ان باتوں نے ہمیں کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ آپ چل کر ہمارے گھر آئی ہیں، اب ہم آپ کو کیا کہیں۔۔۔ جب آپ انہیں ماں بن کر لینے آئی ہیں تو ہم انکار کیسے کر سکتے ہیں۔۔۔“

کافی دیر اسی موضوع پہ باتیں ہوتی رہیں۔ شام سے پہلے زلفی اپنی بہنوں کو لے کر اپنے گھر لاہور واپس آ گیا۔ رخصت کرنے سے پہلے ماموں نے زلفی کی والدہ کو دونوں ڈرافٹ دیتے ہوئے بتا دیا تھا کہ لاہور سے کسی گمنام شخص نے رفعت کے نام پہ پندرہ ہزار روپے بھیجے ہیں۔

☆☆☆

زلفی کو شک تھا کہ یہ پیسے شایان بھیج رہا ہے۔ اپنا شک رفع کرنے کی غرض سے اس نے اس سے بات کی تو شایان نے یقین دلایا کہ وہ اس کے علم میں لائے بغیر ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔۔۔ پھر یہ کون ہو سکتا ہے جو ان کے گھر کاپتہ اور نام تک جانتا ہے؟ ظاہر ہے، اتنی خطیر رقم بھیجنے والا کوئی معمولی انسان تو ہو نہیں سکتا۔ آخر ایک دن بینک منیجر نے اپنے ذرائع سے بھیجنے والے کا نام، اکاؤنٹ نمبر اور فرم کاپتہ معلوم کر کے میاں صاحب کو مطلع کر دیا، انہوں نے فوراً زلفی کو لاہور میں اطلاع کر دی۔ معمولی سی کوشش کے نتیجے میں وہ دونوں اس تک پہنچے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ شوکت تھا۔ جیل روڈ پر ایک شاندار پلازہ میں اس کے لاہوری باس کا دفتر تھا۔ زلفی نے ڈرافٹ اس کے سامنے دھر دیئے اور اس کے چہرے پہ نظریں گاڑے سامنے بیٹھ گیا۔ ہوا نظر میں وہ اسے بڑا اچھا انسان لگا۔ پڑھا لکھا، باوقار اور خوش اخلاق۔۔۔ اس نے ڈرافٹ ایک جانب سرکا دیئے، ان کے لئے پینے کے لئے منگوایا اور پھر بڑی خوش خلقی سے کہنے لگا۔

”مناسب سمجھیں تو اپنا تعارف کروادیں۔۔۔ اچھا، پہلے مجھ سے متعارف ہو لیں۔ یہ نام شوکت علی ہے، میں یہاں پر سٹل سیکرٹری ہوں۔ شادباغ کی میاں فیملی سے میرا تعلق۔

”نہیں“ ایسا ضروری نہیں۔۔۔ میں ایک کام سے ادھر پاس ہی آئی تھی، سوچا کہ بٹ صاحب سے ہی ہیلو ہیلو کرتے چلیں۔۔۔“

”میں ابھی لچ کر کے آ رہا ہوں۔۔۔ آپ چاہیں تو یہیں کچھ منگوا لیتے ہیں۔۔۔“

”نو“ میں لچ کر چکی ہوں۔۔۔ ہاں، اگر اچھی سی کافی مل جائے۔۔۔“

”میں خود بھی چائے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن اب آپ کے ساتھ کافی چلے گی۔۔۔“

”سگریٹ لیں گے آپ۔۔۔؟“ وہ اس کی جانب پیکٹ بڑھاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”تھینکس، میں اس نعمت سے محروم ہوں۔“

وہ سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے چھوڑتے ہوئے بولی۔ ”یاد آیا، کراچی سے ایک فریڈ کا آپ کے لئے ایک مسج ہے کہ روپے پہلی تاریخ تک وہاں پہنچ جانے چاہئیں۔۔۔“

شوکت چونکا، چند لمحے اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”میڈم! اجازت ہو تو کچھ پوچھوں۔۔۔؟“

”ہاں ہاں، ضرور پوچھو۔۔۔“ وہ کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔

”آپ یہ پیغام دینے والی کو جانتی ہیں۔۔۔؟“

”جواب دینے سے پہلے ایک بات میں آپ سے پوچھوں۔۔۔ آپ نے یہ کیسے جان لیا کہ یہ پیغام کسی لڑکی کا ہے؟“

”کیونکہ میں اس لڑکی کو جانتا ہوں۔۔۔“

وہ سنبھل کر بیٹھ گئی، بولی۔ ”کیسے جانتے ہیں۔۔۔؟“

”آپ جب یہاں تشریف لائی تھیں، میرے دفتری سیڑھیوں سے اترتے ہوئے دو نوجوان ضرور آپ نے دیکھے ہوں گے۔۔۔“

”ہاں، دیکھے تھے۔۔۔ بلکہ انہوں نے رکتے ہوئے مجھے اوپر جانے کا راستہ دیا تھا۔۔۔“

”ان میں ایک سفید لباس والا سانولا سانولا نوجوان اس کا سوتلا بھائی تھا اور دوسرا پینٹ شرٹ میں خوبصورت سا لڑکا اس کا منہ بولا بھائی۔۔۔“ وہ دونوں ڈرافٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے بتانے لگا۔ ”وہ یہ ڈرافٹ مجھے واپس کرنے آئے تھے۔ وہ آئے بڑے گرم موڈ میں تھے لیکن جب میں نے انہیں اپنی پوزیشن بتائی اور ساری بات سمجھائی تو تب جا کر وہ مطمئن ہوئے۔ اس نے مجھے خواہ مخواہ یہاں قربانی کا ٹکرا بنایا ہوا ہے جبکہ وہ یہ کام خود بھی کر سکتی ہے۔“

”یہ بتائیں، آپ اس کے متعلق اور کیا جانتے ہیں۔۔۔؟“

ماموں کا پتہ کہاں سے آیا؟۔۔۔ پھر یہ خیال آیا کہ شاید وہ نگہت کا شوہر ہو، اس نے اپنے خلود کو ماموں کا پتہ اور روپے بھیجنے کا کہا ہو جبکہ یہ کام وہ خود بھی کر سکتی تھی یا شاید وہ سامنے نہ آنا چاہتی ہو پولیس کی وجہ سے یا کسی اور خدشے یا مصلحت کے تحت۔۔۔ بہر حال، یہ بات صاف ہو گئی کہ یہ روپے نگہت نے کراچی سے بھیجے اور وہ کراچی میں ہے۔ کراچی! اتنا بڑا شہر۔ یہ تو ایسا بڑا تھا کہ کوئی اندھا بھٹس بھرے گودام میں سوئی تلاش کرتا پھرے۔ ایک اور صورت نظر آئی اخبار میں اشتہار دیا جائے لیکن یہ کوشش بھی بے کار تھی۔ اگر نگہت خود انہیں ملنا چاہتی تو رابطہ کر سکتی تھی، اسے کوئی مجبوری نہیں تھی مگر اندازہ ہوا کہ وہ خود ہی ایسا نہیں چاہتی، پردے کے پیچھے رہ کر اپنی بہنوں کی مدد کرنا چاہتی ہے اور بجائے اس کے کہ کراچی جا کر وقت اور پیسہ برباد کیا جائے، بہتر ہے کہ جب اس مرتبہ وہ پیسے بھیجے یا ٹیلی فون پہ رابطہ کرے تو کسی طرح اس سے اس کا ایڈریس معلوم کر لیا جائے۔ یہ تجویز شایان نے پیش کی، اس بات پہ صلا کرتے ہوئے شوکت نے وعدہ کیا کہ وہ اس کا ایڈریس حاصل کرتے ہی ان سے رابطہ کرے گا اور ویسے بھی وہ اگلے ہفتے کراچی جانے والا تھا۔۔۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو پھر دفتر آ بیٹھے۔ اس ملاقات اور بات چیت سے زلفی اور شایان بڑے پر امید اور خوش ہوئے، شوکت کے روپ میں انہیں ایک اچھے انسان سے ملنے کا موقع نصیب ہوا، وہ شوکت کے بارے میں بڑے اچھے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے واپس آئے۔

\*\*\*

گڈو لاہور آ کر اپنی پرانی سرگرمیوں میں مصروف ہو چکی تھی، شوکت کے لاہوری لباس سے بھی اس کا ملنا جلنا شروع ہو چکا تھا۔ ٹیلی فون پہ رابطے کے علاوہ وہ خود بھی جب جی چاہتا جب اسے طلب کیا جاتا، بے دھڑک چلی آتی۔ اتفاق ہی تھا کہ اس روز ادھر یہ لوگ دفتری سیڑھیاں اتر رہے تھے، وہ چڑھ رہی تھی۔ شوکت کے لباس کی دوست تھی، وہ دوستی کی نوعیت کو بھی اچھی طرح جانتا تھا لیکن پرسنل سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے ہر ملنے والے کو اس کی حیثیت کے مطابق پروٹوکول دینا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ اس نے حسب معمول بڑی گرم جوشی سے مسکراتے ہوئے اسے خوش آمدید کہا اور واپس آفس میں آ گیا۔

”بٹ صاحب تشریف رکھتے ہیں۔۔۔؟“ وہ بڑی دلربائی سے صوفے پہ ٹکتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”میڈم! وہ آج گوجرانوالہ میں ایک شادی انینڈ کر رہے ہیں۔۔۔ آپ کہیں تو فون پہ رابطہ کرادوں۔۔۔؟“ شوکت نے جواب دیا۔

شوکت کے چہرے کی مسکراہٹ ہلکی سی سنجیدگی میں بدل گئی پھر اس نے ساری بات ابتدا سے لے کر اب تک کی سنائی، کراچی والے ٹیلی فون کا ذکر بھی کیا۔ ایئر پورٹ روڈ کے ایک سیڈنٹ، ہسپتال اور جان کی انسانی دوستی کا تذکرہ بھی کیا اور بتایا کہ وہ بڑی بے چینی سے نگہبند کے ٹیلی فون کا انتظار کر رہا ہے۔

وہ کافی کی نازک سی پیالی سے آخری گھونٹ لیتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”شوکت صاحب! اب آخر میں یہ بتادیں کہ کہیں آپ کا آپس میں دل کا معاملہ تو

نہیں۔۔۔؟“

وہ کھل کر ہنسا، پھر بولا۔ ”مجھے پہلے ہی خدشہ تھا کہ آپ ایسا ضرور سوچیں گی۔۔۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ ماضی میں وہ جن حالات میں مجھے ملی، میں نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ مردم گزیدہ ہے۔ اسے ایسے سچے اور ہمدرد دوست کی ضرورت ہے جو حالات کی سنگینی میں اس کا ساتھ دے سکے، اسے مزید بکھرنے سے بچا سکے۔ اپنے تئیں میں نے محض انسانی ہمدردی کے تحت مقدور بھر کوشش کی مگر بد قسمتی کہ حالات نے اسے اور مجھے موقع نہ دیا۔ اب آپ اسے جو چاہیں، کہہ لیں لیکن اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اس کا ایڈریس یا فون نمبر دے دیں۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔۔۔“

”میری گڈ، مسٹر شوکت۔۔۔!“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”آپ کا جذبہ قابل تحسین ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اس کے متعلق آپ کو کچھ بھی نہیں بتا سکتی، اسے آپ میری مجبوری سمجھیں۔۔۔ آپ کے اطمینان کے لئے اتنا ضرور کہوں گی کہ وہ بالکل ٹھیک ہے، محفوظ ہے اور پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اگر اس نے آپ سے کہا تھا کہ وہ آپ سے رابطہ کرے گی تو آپ انتظار کریں اور ویسے بھی، انتظار کا ایک الگ ہی سوا ہوتا ہے۔۔۔“

اسی روز گڈو نے جان کو کراچی، اوہر کے تمام حالات سے باخبر کر دیا تھا۔ جان کو بے حد دکھ ہوا کہ اس کی بہنوں کو ماموں نے زلفی کے حوالے کر دیا، اگر یہی سب کچھ کرنا تھا تو اتنی مصیبتیں اور پریشانی اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ جن بہنوں کی خاطر اس نے اپنی زندگی برباد کر دی، وہی بہنیں اس کی تمام قربانیاں نظر انداز کر کے وہیں ازلی دشمنوں کے گھر پہنچ گئی تھیں۔ انتہائی غیض و غضب کے عالم میں وہ ٹیلی فون پہ ہی گڈو، بہنوں اور ماموں، زلفی سب کو گالیاں بکنے لگا۔ گڈو کے لئے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ حیران تھی کہ جان کو کیا ہو گیا ہے؟۔۔۔

انتہائی طیش کے عالم میں اس نے ٹیلی فون پک دیا۔

\*\*\*

جان میں واقعی بہت سی تبدیلیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ ریڈ روز کی محبت کا اثر، ماحول، آب و ہوا یا اس کے اندر کے ناسور تھے جو اب پک کر زہر پھیلانا اگل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ صرف لمحوں کی زندگی جیتا ہے۔ ایک جنگلی سانڈ کی مانند بدست، سینگوں والی کھلی سفاری جیپ میں کراچی کی سڑکوں پر دندناتا رہتا۔ ٹوٹا اور ریڈ روز نے اسے صرف لڑکیوں کے کاروبار میں ہی خود مختار کیا ہوا تھا، دوسرے کاروبار وہ خود سنبھالتے تھے کیونکہ جان عورت تھا، مردوں سے انتقام کا جذبہ رکھتا تھا۔ پھر اس فیلڈ میں اتنا زیادہ رسک بھی نہیں تھا، وہ اسے محدود اور محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ ریڈ روز بھی کبھی لڑکی تھا۔ دونوں ہی مردوں اور نام نہاد اخلاقی مذہبی تقاضوں سے نفرت کرتی تھیں، دونوں کو ہی اپنوں نے ڈسا تھا۔ دونوں ہی جسمانی موت کے علاوہ ہر قسم کی موت کا سوا دیکھ چکی تھیں، دونوں ہی جسمانی موت کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ وہ بونس کی سانس لے رہی تھیں۔

ریڈ روز اس پہ حد سے زیادہ اعتماد کرتا تھا، آہستہ آہستہ وہ اس کے کندھوں پر بوجھ بڑھا رہا تھا۔ جان نے بھی جان توڑ محنت سے اپنے آپ کو اس کے معیار پہ لانے کے لئے کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کیا تھا۔ خدا جانے، ریڈ روز اس کی کام لینا چاہتا تھا۔ وہ ہر روز اسے نئی سے نئی کڑی مشقت میں ڈالتا اور وہ بھی لوہے کے پنے چبا کر براہہ کر دیتا۔ گڈو نے جب سے اس کی بہنوں کے متعلق بتایا کہ زلفی انہیں اپنے ہاں لے گیا ہے، وہ سخت طیش میں تھا۔ اسی غیض کے عالم میں اس نے اپنے دو ساتھیوں کے تھوڑے نیلے کر دیئے، مکامار کر دیوار نمائشہ توڑ دیا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اڑ کر لاہور پہنچتا اور پھر کیا ہوتا، یہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔۔۔

اس نے لاہور شوکت کو فون کیا تو اس نے بھی من و عن و ہی باتیں بتائیں جو گڈو کی زبانی معلوم ہو چکی تھیں۔ شوکت نے مزید پوچھا کہ پندرہ ہزار کے ڈرافٹ وہ لوگ واپس کر گئے

ہیں، ان کے بارے میں کیا کیا جائے اور انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ تم صحیح سلامت کراچی میں موجود ہو۔ وہ جان صاحب جنہوں نے کراچی میں میری بڑی خدمت کی، جن کے ذریعے تم نے مجھے روپے بھجوائے۔ ان سے تمہارا کیا تعلق ہے، کہیں وہ تمہارے شوہر تو نہیں ہیں؟

”شوکت! ان فضول باتوں کو چھوڑو۔ مجھے اپنی بہنوں کی بہت فکر ہے، انہیں کسی حالت میں بھی زلفی کے گھر نہیں جانا چاہئے تھا۔ پلیز! تم میری مدد کرو، کسی طرح ان سے رابطہ قائم کر کے انہیں وہاں سے نکالو۔ میں ان کے اخراجات۔۔۔ علیحدہ مکان کے لئے جتنی چاہئے، رقم بھیج سکتی ہوں۔“

”سنو، نگہت! تم پہلے بھی مجھ غریب مسکین کو بڑی آزمائشوں میں ڈال چکی ہو۔ میں یہاں ملازمت کر کے اپنا گزارہ کر رہا ہوں، چار لوگ میری عزت بھی کرتے ہیں۔ خدا کے لئے، اپنے آپ کو سنبھالو اور حالات کو بھی۔۔۔ تمہاری والدہ فوت چکی ہیں۔ جوان بہنیں، ماموں کے گھر بوجھ تھیں اور ان کی وجہ سے وہاں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔۔۔ زلفی تمہارا بھائی ہے، تمہارا اپنا خون ہے۔ جتنا وہ اپنی بہنوں کے بارے میں مخلص ہو سکتا ہے اتنا کوئی اور نہیں ہو سکتا، چاہے وہ تمہارے ماموں ہی کیوں نہ ہوں۔ میں نے زلفی اور شایان سے بڑی تفصیل سے باتیں کی ہیں، ان دونوں کو بڑی اچھی طرح جانا اور سمجھا ہے۔ مجھے وہ بڑے مخلص، دردمند اور سمجھدار نظر آئے۔۔۔ مانا، ان کے والد سے غلطیاں سرزد ہوئیں لیکن جو ہوتا تھا، ہو چکا۔ اب وہ ان غلطیوں کو دھرانہ نہیں چاہتے بلکہ تدارک کرنا چاہتے ہیں، لہذا میری تم سے التجا ہے کہ اس معاملے پہ ٹھنڈے دماغ سے غور کرو اور طول مت دو۔ تمہاری بہنیں وہاں محفوظ ہیں۔۔۔ اور تم نے مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا، میں دن رات تم سے ملنے کے لئے بے چین ہوں۔ کم از کم مجھ پہ اعتبار تو کرو، اپنا پتہ اور فون نمبر دو۔“

”اچھا اچھا، زیادہ باتیں مت بناؤ۔ میں تم سے بہت جلد ملوں گی، تم سے ایک پرانا حساب بھی چکانا ہے۔“

”کون سا۔۔۔ وہ پانچ سو روپے کی ریزگاری والا۔۔۔؟“ شوکت نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ تھپڑ کا۔“

ٹیلی فون کھٹ سے بند ہو گیا۔

☆☆☆

سچ تو یہ ہے کہ جان اب صرف بہنوں کے لئے زندہ تھا۔ اپنی زندگی، اچھائی برائی، نفع نقصان، ایسی خرافات پہ سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہر قیمت پہ بہنوں کے مستقبل کو بہتر بنانا چاہتا

تھا لیکن پس پردہ رہ کر۔۔۔ زندگی کا جو انداز وہ اپنا چکا تھا، اس سے باہر نکلنے کا اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ چاہتا بھی تو نکل نہیں سکتا تھا۔ جرائم کی دنیا میں یہی ایک بڑی خامی ہے کہ داخل ہونے والا کشتیاں جلا کر داخل ہوتا ہے۔ پھر وہ مرکز تو فارغ ہو سکتا ہے، جیتے جی نکل نہیں سکتا۔۔۔ پولیس، مقامی غنڈے بد معاش، سمسٹر، منشیات فروش، برہہ فروش، وہ ہر اک کی نظر میں تھا۔ شوکت بیچارہ نگہت سے ملنا چاہتا تھا، زلفی اور شایان اپنی بہن نگہت کی تلاش میں سرگرداں تھے، رفعت اور فرحت اپنی باجی کی راہ دیکھ رہی تھیں لیکن اب جان، اس نگہت کو کہاں سے لائے۔ جان نے تو نگہت کا ناس مار دیا تھا، شاید ہی اس میں کوئی نسوانی بانفت و ریخت کہیں پھنسی رہ گئی ہو۔ اس نے تو جن جن چن کر اپنی ساری نسوانیت نکال پھینکی تھی۔ اب جان بن کر وہ بہنوں کے پاس نہیں جاسکتی تھی، ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی، ان سے کوئی تعلق یا رشتہ نہیں جتا سکتی تھی۔ نگہت بن کے پس پردہ رہ سکتی تھی مگر اب شاید یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ گڈو، شوکت سے کئی بار مل چکی تھی۔ شوکت سے زلفی، شایان مل چکے تھے اور اب کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی حقیقت سامنے نگی ہو جائے گی۔ پھر جو کچھ ہو گا، لوگ پہلے والی داستان کو بھول جائیں گے۔۔۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ الٹ گیا تھا۔ پھر بیس اسے ریڈ روز کی نصیحت یاد آئی کہ جب محسوس کرو کہ مقابل تم پہ حملہ کر دے گا تو پھر تمہارے لئے صرف ایک راستہ ہے جہاں تم اپنی عزت، وقار اور جان تک بچا سکتے ہو۔ تم فوراً سے پہلے اس پر حملہ آور ہو جاؤ، اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دو اور اگر ایسا نہ کیا تو ذلیل ہو گے اور کتے کی موت مارے جاؤ گے۔ دوسری نصیحت یہ تھی کہ جب تم محسوس کرو، تمہارے اندر فوری فیصلہ کرنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی ہے تو فوراً اپنے کفن دفن کا انتظام اپنے ہاتھوں کر لو، کپٹی پہ موزر رکھ ٹریگر دبا دو تاکہ تمہارا ناکارہ میجر دوسرے راستے سے باہر نکل کر بکھر جائے۔ جرائم اور گرفت میں فوری فیصلہ ہی اہمیت رکھتا ہے، تذبذب دو دھاری تلوار کی دھار ہوتا ہے اور دوسرے کو نقصان پہنچے یا نہ پہنچے، خود کو نقصان ضرور پہنچ جاتا ہے۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر کاٹ پہ لاہور ضرور جائے گا۔ کچھ بھی ہو، نتیجہ کچھ بھی نکلے لیکن اپنی بہنوں کے مستقبل کے لئے ضرور کچھ کرے گا۔۔۔ دن گزرتے گئے، اس کے جنون اور اندر کی توڑ پھوڑ میں اضافہ ہو گیا اور پھر قدرت نے اس کے لئے خود سلمان پیدا کر دیا۔

☆☆☆

کراچی لسانی فسادات کی زد میں آچکا تھا، قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ سیاسی جوڑ توڑ شروع ہو گئے۔ آتشزدگی، توڑ پھوڑ روزمرہ کا معمول بن گئی۔ بہتی لنگا میں سب ہی ہاتھ دھو

رہے تھے۔ بھائی، بھائی کا دشمن۔ ہر روز کئی کئی لاشیں قبروں میں اترنے لگیں تو جزوی طور پر کراچی کو فوج اور ریجنرز کے حوالے کر دیا گیا۔ حساس اداروں اور قانون نافذ کرنے والے محکموں میں تبدیلیاں آئیں۔ مقامی غنڈوں، سمگلروں اور مشکوک افراد پر گرفت پڑنے لگی۔ سیاسی لوگ جیلوں میں بند کر دیئے گئے۔ چوک چوراہوں، شاہراؤں پر فوج مورچہ زن ہو گئی۔ مشین گنیں، بکتر بند گاڑیاں باہر نکل آئیں۔ عوام خواص، خاص طور پر کاروباری طبقہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے پنجاب کی جانب رخ کرنے لگے۔ ہوٹل، تفریح گاہیں، کاروباری مراکز سنسان پڑ گئے۔ ان کا ہیلتھ سنسور دیگر غیر قانونی کام بھی اسی افراطی فوری کی زد میں آ گئے۔ پرانے تعلقات والے افسران بھی تبدیل ہو چکے تھے۔ نئے لوگوں نے بلارعیات و تمیزان کی گردنیں ناپنا شروع کر دیں، یہ اپنی شکلیں چھپاتے پھر رہے تھے۔ اسی عالم افراطی فوری دے اطمینانی میں ریڈ روز نے جان کو مشورہ دیا کہ تم فوراً ”یہاں سے نکل جاؤ۔ گڈو اور پیٹر کو میں نے ساری بات سمجھا دی ہے۔ انہیں جاکر ملو، باقی سب کچھ وہ تمہیں سمجھا دیں گے۔ میں فی الحال کراچی سے نکل نہیں سکتا، میں ان کی نظریں میں ہوں۔۔۔ وہ اسے گلے سے لگاتے ہوئے بولے۔

”گڈلک، میری بہن!۔۔۔ محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔۔۔ اپنا خیال رکھنا۔ اپنی بہنوں کا مستقبل سنوارنا، انہیں اچھے گھرانوں میں بیانا اور کبھی مرد ذات پر بھروسہ نہ کرنا۔۔۔“ پھر وہ اسکا ہاتھ چومتے ہوئے بولا۔ ”زندہ رہا تو لاہور میں ملاقات ہو گی۔۔۔“

لاہور ایئر پورٹ پر گڈو اور پیٹر موجود تھے۔۔۔ پیٹر پال یہاں ایک فائبرسٹار ہوٹل میں ہیڈ بار مین تھا۔ راک ہڈن کی سی شبابت، وہی اسٹائل، وہی قدو کاٹھ۔ خوش پوش، شیریں گفتار، انگلش میں بات چیت امریکن لہجے میں کرتا تھا۔ غیر مسلموں اور شراب کے پرست ہوٹلوں کے لئے قانونی اور غیر قانونی، دسی ولایتی شراب کا پرائیویٹ کاروبار بھی تھا۔ وہ ریڈ روز کو اپنا پیر استاد مانتا تھا۔ ظاہر ہے، کل گر لڑ بھی سلائی کرتا تھا۔ گڈو کی امانت بھی اسے حاصل تھی، گلبرگ کی ایک شاندار کوٹھی اس کی آماجگاہ تھی۔۔۔ جان کے بارے میں اسے ہدایات مل چکی تھیں۔ دراصل ریڈ روز نے اپنا سارا کاروبار لاہور منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، سرمایہ بھی یہاں منتقل کیا جا چکا تھا۔۔۔ دو چار روز تو جان نے خوب ڈٹ کر آرام کیا۔ اس دوران نہ تو اس نے شوکت سے کوئی رابطہ قائم کیا اور نہ کسی اور کو کوئی اطلاع دی۔ وہ دراصل ریڈ روز کی ہدایات یا احکامات کا منتظر تھا، کراچی سے آنے کے بعد اس سے براہ راست

رابطہ نہ ہو سکا تھا۔ گڈو اور پیٹر بھی پریشان تھے لیکن جان پریشان ہی نہیں، بلکہ ہلکان ہو رہا تھا۔ وہ رہ کر اسے ریڈ روز کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ بے شمار خدشے اسے سپاہوں کی طرح ڈس رہے تھے، وہ دل ہی دل میں اس کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگ رہا تھا۔۔۔

\*\*\*

بہتے کی رات تھی۔ پیٹر پال بوئے کرشل باؤل میں پارٹی کا ک ٹیل تیار کر رہا تھا جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کراچی سے ٹینا ٹوٹو لائن پر تھی۔ ریڈ روز اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مارا گیا تھا، لیکن دین کے کسی معاملے میں اسمگلروں نے اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے اور کٹی ہوئی گردن بطور رسید اس کے دفتر پہنچا دی گئی تھی، وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ ٹوٹو کی ہدایت تھی کہ نہایت خاموشی، صبر اور رازداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس صدمے کو برداشت کیا جائے۔ حالات بوئے خراب ہیں، وقتی طور پر فوراً اپنی ہر طرح کی سرگرمیاں ترک کر دی جائیں اور بعد کی ہدایات کا انتظار کیا جائے۔۔۔ یہاں تو جیسے سب کی کمر ٹوٹ گئی۔ گڈو اور جان نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ وہ جیسا بھی تھا، ان کا محسن اور ہمدرد تھا۔ دن اجاز اور راتیں ویران ہو کر رہ گئیں۔ سارا سارا دن میوزک، تاش اور شراب۔۔۔ ایکسر سائز اور ٹریننگ رکی ہوئی تھی۔ جسمانی ورزش کرنے والا بھوکا تو رہ سکتا ہے، روٹین کی ایکسر سائز کے بغیر وہ مرل ٹوکی مانند ڈھسے سا جاتا ہے۔ کابلی، سستی نے رنگ دکھانا شروع کیا تو پیٹر پال نے اصرار کر کے گلبرگ کا ایک ہاڈی ہیلتھ کلب جوائن کروا دیا۔ یہ ایک انتہائی ماڈرن، منگنا کلب تھا۔ یہاں کا مالک اور ہیڈ کوچ دلاور منغل تھا۔ داخلے کے وقت وہ فرسٹ انڈیو میں قطعی محسوس نہ کر سکا کہ اس کے سامنے بیٹھا ہر لحاظ سے فٹ نوجوان لڑکا نہیں، لڑکی ہے۔ یہاں وہ دن رات اپنی اداسیوں کو جان توڑ ورزش کے پسینے میں خارج کرنے لگا، گڈو بھی اکثر اس کے ساتھ آتی جسے یہاں کے لوگ اس کی گرل فرینڈ سمجھتے تھے۔۔۔ شوکت اسی دوران کراچی کا چکر لگا آیا تھا۔ وہاں بھی وہ انتظار میں رہا کہ نگہت اس سے رابطہ کرے گی، اسے کیا علم کہ وہ لاہور بیٹھی اپنا غم غلط کر رہی ہے جبکہ وہ لاہور بھی پیغام چھوڑ آیا تھا کہ اگر اس کا کوئی ٹیلی فون آئے تو کراچی گلف ہوٹل کو ریفر کر دیا جائے۔ انتظار کرتے کرتے وہ واپس لاہور بھی آ گیا مگر نگہت کا ٹیلی فون نہ آتا تھا، نہ آیا۔ ایک دن گڈو نے ہی جان سے کہا کہ چلو، آج تمہیں ایک دوست سے ملاتے

وہ حسب عادت کھل کھلا کر ہنسا بولا۔ ”بات بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔۔۔ میں نے اس دن بھی عرض کی تھی کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ پھر بھی آپ مصر ہیں تو چلیے، یونہی سہی۔۔۔ فی الحال میں ان کے بارے میں کچھ جاننے کے لئے بیٹاب ہوں۔“ وہ جان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”بھئی“ یہ ملنگ قسم کے انسان ہیں۔ بڑے مخلص اور شریف۔۔۔ آپ ان کے چلے پہ نہ جائیے گا، اندر سے یہ بالکل اپنے باہر سے برعکس ہیں۔۔۔“

اچانک باہر سے شوکت کے لاہوری پاس تشریف لے آئے۔ رسمی تعارف کے بعد وہ اپنے دفتر میں چلے گئے، ساتھ ہی گڈو بھی چلی گئی۔ شوکت بھی جان سے معذرت چاہتے ہوئے چند منٹ کی اجازت لے کر پاس کے کمرے میں چلا گیا۔ اب جان ٹھنڈے سپرائٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ کس چکر میں پھنس گیا ہے۔ گڈو اس کا گڈا باندھنے پہ تلی ہوئی تھی۔ وہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔ اس شوکت سے کس طرح بچے؟ یقیناً اس کے دل میں کہیں اس کے بارے میں نرم گوشہ موجود تھا۔ اچانک اس کے اندر کہیں دلی مری عورت جاگی۔۔۔ کاش! وہ اس مخلص اور انتہائی شریف نوجوان کی شرافت اور اخلاص کا کسی طرح کوئی جواب دے سکتی لیکن شاید وہ ایسا چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں کر سکتی تھی۔۔۔ شوکت پاس کی من کرواپس آگیا اور بولا۔

”میں ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں، پاس سے کچھ نوٹس لینے ضروری تھے۔۔۔ آپ ایک اور ڈرنک لیں گے؟“ وہ اس کی خالی بوتل دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”نہیں، شکریہ۔۔۔!“

”ہاں، تو آپ کس بزنس میں ہیں۔ وہ جان کو گہری نظروں سے تولتے ہوئے پوچھنے لگا۔ جان سٹپٹا کر رہ گیا کہ کیا بتائے؟ جھٹ بولا۔ ”لیدر جیکٹس کا چھوٹا سا بزنس ہے۔۔۔“

”ویری گڈ۔۔۔ میرے بھی کئی دوست لیدر جیکٹس ایکسپورٹ کرتے ہیں۔ آپ ضرورت محسوس کریں تو میں بڑی خوشی سے آپ کو ان سے بلواسکتا ہوں۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کراچی سے نئے نئے آئے ہیں، یہاں آپ کی جان پہچان بھی کم ہوگی۔ سیالکوٹ اور لاہور میں پیرے کئی واقف ہیں، آپ کی کچھ خدمت کر کے مجھے بڑی خوشی ہوگی۔“

”جیکٹس، شوکت صاحب! مس گڈو آپ کی بہت تعریف کر رہی تھیں۔ مجھے یقیناً آپ کی ویلپ کی ضرورت پڑے گی، شاید اسی لئے آج مس گڈو آپ کے پاس لائی ہیں۔ کراچی بزنس وائز بوائز ہو گیا ہے، اب تو لاہور ہی کچھ کرنا پڑے گا۔۔۔ ویسے کراچی میں آپ

ہیں۔ جان تو جیسے بے جان سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ریڈ روز کی موت نے اسے اپنے بیگانے، یہاں تک کہ خود سے بیگانہ کر دیا ہوا تھا۔ لاہور آکر اسے ایک بار بھی بہنوں، شایان یا زلفی کی یاد نہ آئی۔ ریڈ روز کے علاوہ اسے کچھ یاد ہی نہ تھا۔ کسی رڈیوٹ کی طرح وہ گڈو کے ساتھ چل دیا۔ دفتر میں داخل ہوئے تو شوکت اس کے سامنے تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، لکھت جیسے جان کی جان سے گہمت باہر اچھل پڑی ہو۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ شوکت نے بڑی دلاویز مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے جان سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

”آپ کو لاہور میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، شکریہ! آپ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ لاہور تشریف لا کر ملاقات کا شرف بخشا۔“

وہ مس گڈو کو کراچی والے ایکسٹینڈنٹ اور مسٹر جان کی ہمدردی اور مدد کرنے کی تفصیلات بتانے لگا۔ گڈو مسکرا کر دونوں کا تماشا دیکھ رہی تھی، پھر کہنے لگی۔

”دیکھ لیجئے، ہم نے کیسی شخصیت سے آپ کی ملاقات کروائی ہے۔۔۔“ پھر گڈو نے خود ہی بات چھیڑی۔ ”سنائیے، وہ زلفی اور شایان صاحب پھر آئے یا نہیں۔۔۔؟“

”جی نہیں، وہ خود تو نہیں آئے البتہ دو تین بار ٹیلی فون آئے ہیں۔“ شوکت نے بتایا۔

”کوئی کراچی سے ٹیلی فون یا اطلاع۔۔۔؟“ دراصل گڈو مطمئن ہونا چاہتی تھی کہ وہ جان کی اصلیت پہچان پایا ہے یا نہیں؟

”میڈم! وہاں بھی خاموشی ہے جبکہ میں کراچی کا چکر بھی لگا آیا ہوں، وہاں بھی اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔۔۔“

جان خاموشی سے گفتگو سنتے ہوئے۔۔۔۔۔ شوکت کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ اللہ کا بندہ ذرا بھی تو نہیں بدلا۔ کس مٹی کا بنا ہوا ہے، مجھ سے کیا چاہتا ہے، ملنے کے لئے کیوں بے چین ہے۔ جو ان ہے، اسماٹ اور پڑھا لکھا ہے۔ ایک سے ایک اچھی لڑکی اسے مل سکتی ہے، مجھ سے کیوں دلچسپی رکھتا ہے؟

”میڈم! آپ خود ہی باتیں کئے جا رہی ہیں۔ مسٹر جان کا تفصیلی تعارف کروائیں، مجھے کچھ ان کی خدمت کا موقع دیں۔ میں تو بڑی بے چینی سے ان کی لاہور آمد کا منتظر تھا۔“ شوکت بولا۔

”یہ تو آپ نہ کہنے کہ آپ ان کے منتظر تھے۔۔۔ البتہ بے چینی سے آپ کسی اور کے منتظر ضرور ہیں۔“ گڈو نے جواب دیا۔

کے کوئی رشتہ دار وغیرہ بھی ہوں گے، وہاں کے حالات بڑے خراب ہیں۔“  
”رشتہ دار تو کوئی نہیں البتہ ایک دکھ دینے والا ضرور موجود ہے جس کی فکر لگی ہوئی ہے۔“ وہ اک دم سنجیدہ سا ہو گیا۔

جان جیسے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”دکھ دینے والا۔۔۔ میں کچھ سمجھا نہیں؟“  
”میں بھی اسے ابھی تک نہیں سمجھا، بس یونہی منہ سے نکل گیا ہے۔“ وہ پھیکا سا مسکرانے لگا۔ ”چھوڑیے اس بات کو۔۔۔“ موضوع بدلنے کی کوشش میں کہنے لگا۔ ”جان صاحب! بیچ پوچھیں تو آپ سے مل کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم بہت پرانے ملنے والے ہیں۔ آپ کی آواز باتوں اور شخصیت سے پرانی شناسائی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے جبکہ ہماری یہ دوسری تیسری ملاقات ہے۔“

جان گہرا سا گیا، سنہلے ہوئے جواب دیا۔ ”۔۔۔ دراصل جب دو مخلص انسان آپس میں ملتے ہیں تو دونوں کو اپنی اپنی جگہ یہی محسوس ہوتا ہے۔۔۔ مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوا ہے۔“

☆☆☆

کانٹے کی نوک ٹوٹ کر اندر رہ جائے تو عجیب میٹھی سی کک محسوس ہوتی ہے، تکلیف تو زیادہ نہیں دیتی مگر اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جان کی ملاقات بھی کچھ ایسی ہی کیفیت لئے ہوئے تھی۔ لاکھ جھٹکنے کے باوجود شوکت اسے اپنے ذہن سے نہ نکل سکا۔ ساری رات لا شعوری طور پہ اندھیروں میں بھٹکتا رہا۔ بجلی کے لپکتے کوندے کی مانند شناسائی کا کوئی چھپا کا لرزنا لیکن منظر صاف ہونے سے پیشتر پھر وہی اندھیرا مسلط ہو جاتا۔ اسی کشمکش میں کہیں صبح صادق سے پہلے نیند کی دیوی نے اسے ہلکی ہلکی تھکیاں دینا شروع کیں، آسودگی کی ہلکی ہلکی خنکی نے اس کے ذہنی خلفشار کی پولی پولی جھاگ صاف کر دی اور جو غبی ذہن کی سطح صاف ہوئی تو قطرہ قطرہ موتی نکلتی دراز بھیگی زلفوں والی اک جل پری نمودار ہوئی۔ ہائیں! یہ تو نگہت تھی۔۔۔ کچی نیند میں ”نگہت“ نگہت“ پکارا تو وہ اٹھ بیٹھا۔ پیشانی پسینے سے بھیگی ہوئی۔ ٹھنڈے پانی کے چند گھونٹ پیئے، غور کرنے لگا۔ نہیں! یہ نگہت نہیں ہو سکتی۔ تو مند جوان، فراخ سینہ، بھرے بھرے بازو۔ وہ تو ایک نوجوان مرد۔۔۔ لیکن اس کا اندر بول رہا تھا کہ نہیں! وہ نگہت ہے۔ انسان لاکھ بھیس بدلے مگر اپنی آنکھیں نہیں چھپا سکتا، وہ انہیں بدل نہیں سکتا اور اگر بدل بھی لے تو ان کے اندر کی خوشبو اور خاص کر اس مخصوص چمک کو تو چھپا سکتا نہیں جاسکتا جو صرف عورت کی آنکھ میں ہوتی ہے اور پھر وہ آنکھ جس میں چاہت اور چاہنے جانے کے دیکھ روشن ہوں۔ وہ ان آنکھوں اور اس چمک کو کیسے بھول سکتا تھا جن کا مطالعہ

س نے کبھی پہرہوں سامنے بیٹھ کر کیا تھا۔ وہ اسے اس کی خوشبو اور آنکھوں سے پہچان چکا تھا۔  
برہہ سو نہ سکا۔

☆☆☆

رفت اور فرحت اپنے گھرا ہور کیا آئیں گویا جنت میں اتر آئی ہوں۔ سوتیلی ماں اور بن بھائیوں کے بارے میں جو بھی بٹنے سنائے، اچھے بڑے خدشات تھے وہ سب حرف غلط اہت ہوئے۔ سوتیلی ماں نے انہیں کھلے دل سے کلیجے لگا لیا تھا۔ چند دنوں میں ہی اجنبیت اور دہری جھجک دور ہو گئی۔ نین تارا تو اس کی کچی سیلی بن گئی تھی۔ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سینا پونا، مدم ساتھ رہتیں۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے دکھوں، پریشانیوں اور آزمائشوں کے بادل کھل کر برسنے کے بعد چھٹ چکے ہوں اور اب خوشیوں، شادانیوں کی نرم نرم، اُجلی اُجلی سنہری صوب انہیں آسودگی اور طمانیت بخشنے پہ آمادہ ہے۔ ماں، بھائی کے ساتھ دو چار بار باپ کی قبر پہ آئی تھیں۔ ماں بھی شاید اپنے مرحوم شوہر کی بے اتفاقی اور بے انصافی کا اس طرح ازالہ کر کے اس کی بے چین اور مضطرب روح کی تشفی اور آخرت کا سامان مہیا کرنا چاہتی تھی۔ ان بچوں کے لئے اپنی ممتا کے سارے خزانے نچھاور کر دیئے اور وہ بھول ہی گئیں کہ کبھی انہوں نے دکھ اور عسرت کے دن دیکھے تھے۔ ایک آدھ بار ٹو بے اپنے ماموں ممانی سے بھی مل آئیں، یہ لوگ بھی لاہور آتے تو انہیں ملے بغیر نہ جاتے۔ ممانی جو انہیں منوس، مصیبت اور محکوک کردار کی سمجھتی تھی اور انہیں ایک پل بھی اپنے گھر میں رکھنے کی روادار نہ تھی، وہی اب ان کے آگے پیچھے نبھتی جا رہی تھی۔ ان کی تعریفیں کرتی نہ تھکتی بلکہ ان کی قسمت، خوشحالی، آسودگی کو رشک بھری نظروں سے دیکھتی۔ باتوں ہی باتوں میں زلفی کی امی نے یہ ذکر بھی کیا کہ میں انشاء اللہ اپنی بیٹیوں کو بڑی شان سے بیاہوں گی، باپ کی بے انصافیوں کی ساری کسر پوری کر دوں گی۔ باپ کی جائیداد کا پورا پورا حصہ اور لاکھوں کا جیز دے کر رخصت کر دوں گی، بس کسی اچھے لڑکے کی تلاش ہے۔ جو نبی مل گیا، فوراً رخصت کے ہاتھ پہلے کر دوں گی۔ رخصت کی ممانی کو اب اپنی کی ہوئی باتیں اور سلوک یاد آ رہا تھا جو اس نے ان بچوں سے زور کھا تھا، اب یہ بیوقوف پچھتا رہی تھی۔ یہی لڑکیاں اب اسے سکھڑ زمانے بھر میں یکتا اور خوش بخت دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے دل میں کہیں خواہش ابھری کہ رخصت اگر میری بہو بن جائے تو خاوند کی بات بھی رہ جائے گی، اپنی کروتوتوں کا بھی ازالہ ہو جائے اور لاکھوں کا جیز۔۔۔ انسان بڑا تھوڑا ہوتا ہے۔ اس کی نفرتوں، محبتوں اور خواہشوں کا کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں ہوتا۔ یہ تھوڑا دلی اور مطلب کی بندی، اب ان سے میل ملاپ رکھنے لگی تھی۔

زلفی اپنی چھڑی ہوئی ستم زدہ بہنوں کو پا کر بہت خوش تھا مگر اس کی خوشی کی تکمیل تو تب ہوتی جب نگہت کو بھی تلاش کر کے اپنے گھر لے آتا۔ اس کے باوجود ماں کی معاملہ فہمی اور دانشمندی نے اس ٹوٹے ہوئے عتاب زدہ گھر کو نئے سرے سے خوشیوں اور گہما گہما کیوں کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ زلفی کے بس میں ہوتا تو وہ دنیا بھر کی خوشیاں اپنی ماں، بہنوں اور شایان کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا۔ اس کا کاروبار بھی پھر سے جم گیا تھا۔ رشتے دار، جان پہچان والے، محلے وار بھی آہستہ آہستہ قریب آ رہے تھے بلکہ بہنوں کو گھرانے پہ خوشی اور پسندیدگی کا اظہار کر رہے تھے۔ نگہت کے بارے میں تشویش ضرور تھی کہ خدا جانے وہ کراچی، کس حال میں ہو۔ اسے شک تھا کہ اس نے وہیں کہیں شادی کر لی ہے اور اس کا شوہر کوئی آسودہ حال شخص ہے، اسی لئے تو وہ اپنی بہنوں کو بڑی بڑی رقیں بھیج رہی تھی۔۔۔

شایان، اپنے گھر میں اللہ کی رحمت بنا ہوا تھا۔ بوڑھے ماں باپ تو جیسے پھر سے جوان ہو گئے تھے۔ لاہور میں زلفی، قاسم اور نین تارا اسے اکثر ٹیلی فون پہ رابطہ رہتا اور جب جی چاہتا، ملنے کے لئے خود بھی آنکلتا۔ والدہ اور کبھی کبھی شگفتہ بھی ساتھ ہوتی۔ دونوں گھروں میں خوب دھماچو کڑی مچتی، شرارتی لڑکیوں کا مینا بازار سالگ جاتا۔ زلفی، قاسم اور شایان کے لئے بڑی پریشانیاں پیدا ہو جاتیں۔ گاڑیوں میں لاوا لاد کر گھمانے لے جانا پڑتا۔ لارنس گارڈن، گول گے، ڈرائے، بوائے لینڈ، اسٹیلیم، برگرز، چائیز۔ پیسے خرچتے خرچتے، ان کی اوٹ پانگ فرمائشیں اور خرچے برداشت کرتے کرتے ناک میں دم آ جاتا۔ گویا ان سب لڑکیوں کے اکٹھے ہونے پہ دن تیلیوں کے تماشے، شایں، جگنوؤں کی باراتیں اور راتیں رنگوں کی رتیں لے کر آتی تھیں۔

شگفتہ کا اس گھر کو سنبھالنے میں نمایاں حصہ تھا۔ کچھ چہرے، کچھ ادائیں عادتیں، سبھاؤ اور طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں جو دلوں میں گھر کر لیتی ہیں۔ زلفی کی ماں، شگفتہ کو اپنی بہو سمجھ کر ہی اس کے ساتھ برتاؤ کرتی تھی۔ گو ابھی تک اس نے باقاعدہ سے اس کا ہاتھ نہیں مانگا تھا، ابھی اشاروں کنایوں میں ہی کچھڑی پک رہی تھی اور وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھیں۔ پھر ایک دن موقع پا کر انہوں نے شایان اور شگفتہ کی ممانی سے بات چھیڑی۔

”ہن! ہماری غلطی اور پوچھتی کہ ہم نین بیٹی کا رشتہ مانگ بیٹھے تھے۔ اللہ سلامت رکھے شایان بیٹے کو، یہ اسی کا حق ہے۔ شگفتہ نے ہماری بڑی خدمت کی ہے، ماشاء اللہ بڑی سگھڑ اور دھیمی طبیعت والی لڑکی ہے اور سچ پوچھو تو میں اس کے بغیر اب ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔ ہم پہ مہربانی کر کے ہمارے ساتھ چلو۔ میں شگفتہ کو اپنی بیٹی بنانا چاہتی ہوں۔ ذوالفقار میرا ہی

نہیں، تمہارا بھی بیٹا ہے۔“

نین تارا کی امی خوش ہو کر بولی۔ ”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، ماشاء اللہ دونوں کی جوڑی خوب رہے گی۔ شایان اور زلفی ویسے بھی ایک جان دو قالب ہیں، اس طرح ان کی دوستی اور بھی مضبوط ہو جائے گی۔ جب کہو، میں ملنے کے لئے تیار ہوں اور زلفی پتر کے لئے مجھے ان کے پاؤں بھی پڑنا پڑا تو دریغ نہیں کروں گی لیکن ایک بات واضح ہے۔ وہ بیٹی والے ہیں۔ کیا جواب دیں، یہ ان پہ منحصر ہے البتہ مجھے خدا کے گھر سے امید ہے کہ وہ ہمیں مایوس نہیں دلائیں گے۔“

پھر ماں نے بیٹے کے دل کی جاننے کے لئے اس کو ٹٹولا، وہ تو غصے سے لال پیلا ہو گیا۔

”امی! وہ میرے عزیز از جان دوست شایان کی بہن ہے۔ ایک بہن کے ناطے اگر اس نے ہمارے کڑے وقتوں میں ہماری خدمت کی یا ساتھ دیا ہے تو اس کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ ہم اسے بہو بنا کر گھر لے آئیں۔ وہ لوگ کیا کہیں گے، شایان کیا سوچے گا۔ یہ تو بڑی خود غرضی اور پھوٹی حرکت ہے۔ میں وہاں شادی نہیں کروں گا اور پھر ابھی میں شادی کا سوچ بھی کیسے سکتا ہوں؟۔۔۔ گھر میں جوان بہنیں ہیں، نگہت، بہن کا کچھ پتہ نہیں۔ جب تک یہ سارے مسئلے حل نہیں ہو جاتے، اس بابت مجھ سے کوئی بات نہ کیجئے گا۔“

ماں قدرے خفگی سے بولی۔ ”زلفی میرے سامنے بڑا بننے اور اپنا حکم چلانے کی کوشش مت کرو۔ باپ اگر موجود نہیں تو اس مطلب یہ نہیں کہ تم گھریلو معاملات میں فیصلے بھی خود اپنی عقل کے مطابق کرو۔۔۔ تمہاری بہنوں کو گھرانے کا فیصلہ میرا تھا جو تمہاری عین خواہش کے مطابق تھا۔ اب بھی تم ماں کے فیصلے کے پابند رہو گے اور میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ میری بہو بنے گی تو صرف شگفتہ، اور مجھے پورا پورا یقین ہے کہ وہ میری خواہش اور درخواست کا احترام کریں گے۔۔۔ یہ وقف لڑکے!۔۔۔ عورت ہونے کے ناطے میں شگفتہ کے احساسات کو بھی سمجھتی ہوں، میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ بھی اس فیصلے سے بہت خوش ہوگی۔۔۔ اور ہاں، میں اس معاملے میں قاسم کی امی سے رسمی طور پہ بات کر چکی ہوں۔ انہوں نے بھی ہندیدگی کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ آپ کو شگفتہ جیسی بیٹی ہی چاہئے اور انہیں بھی زلفی جیسا بخودار۔۔۔ پتر! جوڑیاں آسمانوں پہ جوڑی جاتی ہیں، خود نہیں جوڑی جاتیں۔ بس خاموشی سے رکھتے جاؤ۔“

ماں کے سامنے مزید زبان کھولنے کی جرات نہ پا کر وہ خاموشی سے وہاں سے کھسک لیا۔ لہر ماں آنے والے جمعہ، شایان کے گھر جانے کی تیاریوں میں لگ گئی۔ اتفاق سے

دوسرے روز شایان، انکم ٹیکس کے سلسلے میں لاہور آیا تو زلفی سوچ میں پڑ گیا کہ اس سلسلے میں اس سے بات کرے یا نہ کرے؟ شایان بھی محسوس کر رہا تھا کہ وہ کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔  
”کیا بات ہے، منہ لٹکائے بیٹھے ہو۔“ کچھ کہنا چاہئے ہو یا کوئی اور پریشانی ہے؟“ شایان نے اسے کچھ کہنے پر اکسایا۔

”یار! آج تک تم سے کچھ بھی نہیں چھپایا لیکن آج ایک بات ایسی آپڑی ہے کہ چھپائے بھی نہ بنے اور کہے بغیر رہا بھی نہ جائے۔“  
”میرے بھائی! وہ کون سی بات ہے۔ جسے کہنے کے لئے تمہیں ایسی تمہید باندھنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے؟“

زلفی نے دل پٹکا کرتے ہوئے ساری بات اول کا آخر تک بیان کر دی اور آخر میں کہنے لگا۔  
”شایان بھائی! خدا جانتا ہے، یہ سب کچھ اس لئے کہنے پہ مجبور ہوں کہ میں تم سے کچھ چھپانا بھی چاہوں تو کچھ چھپا نہیں سکتا۔ میں اسے انتہا درجے کی بددیانتی سمجھتا ہوں کہ دوست سے کچھ چھپایا جائے۔“

شایان مسکرانے لگا بولا۔ ”زلفی! تم میں ایک بُری عادت یہ ہے کہ تم ہمیشہ کلن کو ہاتھ گھم کر پکڑتے ہو۔ تم یہ بات دو چار سادہ سے لفظوں میں بھی بیان کر سکتے تھے اور پھر اس میں کوار سی ایسی قباحت اور پیچیدگی ہے جس کا اظہار کرتے ہوئے تم شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ بھائی! جس گھر میں لڑکیاں ہوں گی، وہاں تو یہ معاملے ہوں گے قطع نظر اس بات کے کہ تم میرے دوست ہو، یہ تو نہ بھولو کہ تم ایک بے حد شفیق ماں کے اکلوتے بیٹے ہو۔ ایک جوان بیٹے کی ماں نے اگر ایک بیٹی والے گھر کو اس قابل سمجھا ہے تو انہیں اپنا فرض ادا کر۔ وہ جانیں اور ان کا کام، ہمیں کیا؟ ہم تو دوست ہیں اور انشاء اللہ ہمیشہ دوست ہی رہیں گے۔ پھر اگر اللہ کو یہی منظور ہے تو اسی سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔“

زلفی نے فرط جذبے سے شایان کو گلے سے لگالیا، ”آہستہ سے انک انک کر کہنے لگا۔  
”شایان! شکفتہ کیا سوچے گی اور پھر لوگ کیا کہیں گے کہ ایک دوست نے دوستی کی آ میں دوست کے گھر۔“

شایان نے اسے فوراً ”علیحدہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”لغت بھیجو لوگوں پہ، لوگ پہلے کچھ نہیں کہتے۔ لوگوں کی پرواہ کرو گے تو ایک قدم چل نہیں سکو گے۔ نیت درست، ضمیر مطمئن ہے تو میری جان! سب درست ہے۔“  
”مگر یار! ذرا سہجہ، تمہت کا اتنا پتہ نہیں۔ فرحت، رفعت کے فرائض ادا کرنے ابھی با

ب۔ باپ موجود نہیں۔ میری تمہاری کیا، جب چاہیں گے سر پہ ہرے باندھ لیں گے۔  
”لے بہنوں کے بارے میں سوچنا چاہئے۔“

”بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ مگر اس کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ اپنی امی کا حکم ماننا مارے لئے اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ وہ ماں ہیں۔ جو کچھ تم سوچتے ہو، وہ اس سے ہیں زیادہ آگے سوچتی اور جانتی ہیں۔ تم سب کچھ ان کی صوابدید پہ چھوڑ دو۔“  
”چلو، ٹھیک ہے مگر ایک شرط بلکہ میرا پہلا اور آخری فیصلہ ہے کہ تمہاری اور میری ادنیٰ ایک ساتھ ہوگی۔“

شایان نے قہقہہ لگایا، ”اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ”پیارے! تم صرف اپنی ت کرو، مجھے اپنے ساتھ مت گھیسو۔ میں تو تمہارا شہرہ بالا بنوں گا۔“  
”شہزادے! ہو گا تو ایسے ہی ہو گا ورنہ میرا فیصلہ تو تم نے سن ہی لیا ہے۔“  
شایان سنجیدہ ہو کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم میرے بارے میں سب کچھ نئے ہوئے بھی ایسی بات پہ بھند ہو جو میرے لئے ممکن نہیں، بڑے افسوس کی بات ہے۔۔۔“

”تم بھی تو ضد کر رہے ہو۔ میرے لئے تو یہ حکم کہ میں سب کچھ امی کی صوابدید پہ موڑ دوں۔ ٹھیک، میں چھوڑ دیتا ہوں اور تمہارے لئے میرا یہ حکم ہے کہ تم اپنی شادی کا نالہ میری صوابدید پہ چھوڑ دو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔“  
شایان سر پکڑ کر بیٹھ گیا، کافی دیر کچھ سوچتا رہا۔ پھر پوچھنے لگا۔  
”یہ تمہارا حکم ہے یا۔۔۔“

”میری خوشی، خواہش در خواست یا حکم۔ کچھ بھی سمجھ لو۔“ زلفی نے جواب دیا۔



جمعہ کے روز زلفی کی والدہ، دونوں بہنیں، نین تارا، قاسم اور ان کی امی شیخوپورہ پہنچ چکے تھے۔ ان کی آمد اور مقصد کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔ شایان نے پہلے ہی گھر آکر لد والدہ اور بڑی بہنوں کو ان کی خواہش سے آگاہ کرتے ہوئے اپنی رضامندی کا اظہار بھی کر ا تھا۔ زلفی ساتھ نہیں آیا تھا، ”اصولاً“ اسے اس موقع پہ آنا بھی نہیں چاہئے تھا۔ شایان اس کی لی بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ٹیلی فون کیا اور پوچھا کہ کیا بات ہے، تم نہیں آئے؟ زلفی نے ٹالتے ہوئے جواب دیا کہ میں ذرا یہاں مصروف تھا اور پھر مجھے کسی نے ساتھ چلنے کے

لئے کہا ہی نہیں۔

”اچھا، بہانے چھوڑو اور فوراً یہاں پہنچو۔ میں کھانے پہ تمہارا انتظار کروں گا۔“ شایان نے کہا۔

”سنو! تجھے بچے بنو اور ہر وقت ضد مت کیا کرو۔ اس موقع پہ میرا نامناسب نہیں۔“  
”کیوں؟ تم کیوں نہیں آ سکتے؟۔۔۔ گھر والوں اور ان کا معاملہ ان تک چھوڑو، تم میرے پاس آؤ۔ کان کھول کر سن لو کہ جب تک تم یہاں نہیں آؤ گے، نہ کوئی بات ہوگی اور نہ ہی کوئی فیصلہ ہوگا۔“

ٹیلی فون کھٹ سے بند ہو گیا۔

زلفی پہنچا تو سب حیران ہی نہیں بلکہ بہت خوش بھی ہوئے البتہ اس کی ماں نے ناک منہ چڑھایا تو شایان نے وضاحت کر دی کہ خالہ جی، زلفی میرا دوست اور بھائی ہے۔ میں نے اسے یہاں اسی حیثیت سے اصرار کر کے بلوایا ہے۔ قطع نظر کسی نئے سلسلے کے، میرا اس سے پرانا ہی تعلق ہے۔۔۔ کھانے پینے سے فراغت کے بعد زلفی کی امی نے شگفتہ کو اپنی بیٹی بنانے کے سلسلے رسمی طور پہ بات چیت چھیڑی، نین کی والدہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ کچھ دیر اسی موضوع پہ ہلکی پھلکی بات چیت ہوتی رہی۔ زلفی کی امی نے شایان کی والدہ کا ہاتھ پکڑ لیا، بولیں۔

”ہمن جی! بچ پوچھیں تو شگفتہ بیٹی نے اپنے حسن سلوک اور محبت سے ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا ہوا ہے۔ اللہ اس کے نصیب ایتھے کرے، اسے دنیا جہاں کی خوشیاں دے۔ جب سے یہ کہاں والی لاہور سے آئی ہے، ہم اپنے آپ کو اُدھورا اُدھورا سا محسوس کرتے ہیں۔ گھر سونا سونا لگتا ہے، درود یار بھی جیسے اس کی کمی محسوس کر رہے ہوں۔“

شایان کی والدہ نے سب کچھ سننے کے بعد کچھ سوچنے اور مشورے کی مہلت چاہی۔ پھر شام سے پہلے پہلے تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔ انگوٹھیوں کے تبادلے اور مبارک سلامت ہوئی۔ زلفی کی والدہ نے نہایت نرمی سے واضح کیا۔

”۔۔۔ چاہئے تو یہی تھا کہ پہلے بیٹوں کے فرائض سے فارغ ہوا جاتا لیکن اس کے والد کی وفات کے بعد میری ہمت جواب دے گئی ہے، میں اپنے آپ کو بڑا کمزور سا محسوس کرنے لگی ہوں۔ شگفتہ آجائے تو خود ہی گھر بار سنبھال لے گی، اپنی بہنوں کو بھی بیابے گی اس لئے ایک ڈیڑھ ماہ تک پھول جھولی میں ڈال دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔۔۔“ پھر پاس بیٹھے ہوئے شایان کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔ ”یہ دونوں آپس میں دوست بھی ہیں اور بھائی بھی، ان دونوں کا

آپس میں وعدہ ہے کہ شادیاں اکٹھی ہی کریں گے۔۔۔“ پھر نین کی والدہ سے مخاطب ہوئیں۔  
”ہمن! ہم آنے والے جمعہ کو آپ کے گھر بھی آرہے ہیں، گھر پہنچ کر آپ تیار کر لیں۔“

نین کی امی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں اس موضوع پہ بھی بات ہوگی۔ حیران سی مسکرا کر، کوئی جواب دیئے بغیر خاموش ہو گئی۔ پھر گھر پہنچی تو خاوند سے بات کی۔ وہ بے چارہ بھی حیرانگی سے بیوی کا منہ نکلنے لگا۔ قاسم اور نین تارا کو بلایا، اس موضوع پہ مشورہ کرنا چاہا تو قاسم نے کہا کہ زلفی اور اس کی امی کو بلایا جائے تو مناسب ہوگا۔ وہ دونوں بھی آگئے۔۔۔ نین کے والد بولے۔

”ہمن! آپ تو سب اچھی طرح جانتی ہیں۔۔۔ بات تو آپ نے منہ سے نکل دی، یقیناً“  
کچھ سوچ سمجھ کر ہی نکالی ہوگی مگر ہم تو بڑے ٹھمکے میں پڑ گئے ہیں۔۔۔“  
نین تارا نے وہاں سے بہانے بہانے کھسکنا چاہا مگر قاسم نے اسے بازو سے پکڑ کر بٹھا لیا۔۔۔ زلفی کی امی نین تارا سے مخاطب ہوئیں۔

”بیٹی! تم بڑھی لکھی، سمجھدار اور بالغ ہو۔ یہ آپس میں مل بیٹھنے کے موقع بار بار ہاتھ نہیں آتے اور پھر اولاد کی شادیوں کے مسئلے میں کبھی نہ کبھی بات تو کھولنا ہی پڑتی ہے۔ تم بھی اپنی رائے کا کھل کر اظہار کرو تاکہ تمہاری منشا اور رضامندی سے ہم کسی نتیجے پہ پہنچ سکیں۔۔۔“

نین کی امی نے بھی لقمہ دیا۔ ”پڑ، ٹھیک ہے کہ تم بچپن سے شایان سے منسوب ہو، تم اس کی خوبیوں اور خامیوں سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو، ہر چیز شیشے کی طرح صاف اور واضح ہے اور یہ کہ وہ خود ہی کئی بار اپنی مجبوریوں کی وجہ سے منگنی سے دستبرداری اور شادی سے انکار کر چکا ہے لیکن یہ تمہاری زندگی کا مسئلہ ہے، تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا پورا پورا اختیار ہے۔ بلا جھجک و خوف اپنے دل کی بات بتادو۔۔۔“

والد صاحب کہنے لگے۔ ”بیٹی! تمہاری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے۔۔۔ پوری ذمہ داری سے اپنے متعلق فیصلہ کرو، چاہو تو سوچنے اور مزید غور کرنے کے لئے تمہیں موقع دیا جاسکتا ہے۔“  
”ابو! اس معاملے میں مجھے بولنا تو نہیں چاہئے۔ آپ بزرگوں کی اگر مرضی ہے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ فیصلہ تو ہو چکا ہوا ہے۔ یہی فیصلہ میرا مقدر ہے اور میں اپنے مقدر پہ شاکر اور راضی ہوں۔ قرآن شریف میں کئی جگہوں پہ شاکرین اور صابرین کے لئے بڑے اجر کی نوید سنائی گئی ہے۔“

چند لمحوں کے لئے جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔

آنے والا جمعہ ان دونوں گھروں میں بے شمار خوشیاں لے کر آیا۔ اگلے مہینے کی پچیس تاریخ کو دونوں کی شادیاں اکٹھی طے پائیں۔ شگفتہ اور نمین کی ڈولیاں، مییں لاہور قاسم کے گھر سے روانہ کرنے کے پروگرام پہ بھی سبھی متفق اور خوش ہو گئے۔ تیاریاں شروع ہو گئیں۔

\*\*\*

شوکت اب پھر کراچی بہت دن لگا آیا تھا۔ گودی میں برتھ خالی نہ ہونے کی وجہ سے جہاز سکرپٹ لئے کھلے سمندر میں کھڑا تھا۔ ادھر سالان اتارنے والے مزدوروں نے بھی ہڑتال کر رکھی تھی۔ فارغ ہوتے ہی وہ تھکا ماندہ لاہور پہنچا۔ ایک پورا دن آرام کرنے کے بعد وہ دفتر آیا تھا تو کئی ٹیلی فونک پیغام اس کی توجہ کے طالب تھے، کئی ایک جان کی جانب سے تھے۔ وہ پیغامات پڑھ ہی رہا تھا کہ میڈم گڈو کے ساتھ جان کے آنے کی اطلاع ملی۔ وہ زرب لب مسکرا دیا۔ کراچی میں وہ اتنے دن یہی ایک کام کرتا رہا تھا۔ جان کے روپ میں کھرچ کھرچ کر، کرید کرید کر وہ نگہت کو نکال رہا تھا جیسے برسوں زمین میں گڑے کسی نادر مجستے کو رگڑ رگڑ کر اس کے اصل خدو خال اجاگر کئے جاتے ہیں۔ وہ کھرچتا رہا، مزے لیتے رہا۔ بڑی کڑی محنت اور رگڑائی کے بعد اس نے جان کے سخت جان مجستے سے دل کے جانی نگہت کو نہاں ہی لیا تھا۔

”سر! انہیں بٹھاؤں یا اندر لے آؤں۔۔۔؟“ چڑاسی پوچھ رہا تھا۔

”انہیں اندر لے آؤ اور چائے اور گرم ماگرم سمو سے بھی۔۔۔“

ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے وہ نگہت کا استقبال کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔

”گڈ مارنگ! شوکت صاحب!“

گڈو نے ہمارے تازہ جھونکے کی مانند اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ جان پیچھے تھا آگے بڑھ کر اس نے بھی گڈ مارنگ کہتے ہوئے ہاتھ ملایا۔

”تشریف رکھیں۔۔۔“

وہ دونوں پاس پاس کوچ پہ بیٹھ گئے۔

”کراچی بہت دن لگا دیئے آپ نے۔۔۔ بٹ صاحب بھی آئے ہیں یا وہیں کراچی میں ہیں؟“ گڈو نے ایک ساتھ دو سوال داغ دیئے تھے۔

شوکت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”سکرپٹ ابھی تک اتر نہیں سکا اس لئے میں بھی وہیں رک رہا ہوں اور بٹ صاحب انتظامات میں لگے ہوئے ہیں، کچھ ضروری کام نبھانے تھے اس لئے مجھے یہاں آنا پڑا۔۔۔“ سنائیے، جان صاحب! لاہور میں دل لگا؟“ وہ جان سے مخاطب

تھا۔

”او! یس۔ لاہور، لاہور ہے۔ زندہ دلوں کا شہر! بس آپ کی کمی تھی۔۔۔ میں نے کئی بار ٹیلی فون پہ پیغام لکھوائے، آپ کو مل گئے ہوں گے۔“

”جی ہاں، آپ کے آنے سے پہلے میں انہیں دیکھ رہا تھا۔۔۔“

چڑاسی چائے وغیرہ لے کر آگیا۔۔۔ جان پہلے کی طرح آج بھی بڑا سارٹ اور فریش دکھائی دے رہا تھا، چہرے پہ کچھ کیل مہاسے نکل آئے تھے۔ شوکت دانستہ چشم پوشی کر رہا تھا لیکن آنکھ بچا کر اسے دیکھ بھی لیتا۔ اپنی بات چیت، برتاؤ سے وہ یہی تاثر دے رہا تھا کہ وہ اسے بالکل پہچان نہیں پایا۔۔۔ شوکت نے نظر بچا کر اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ بالکل وہی آنکھیں! عورت اپنی آنکھوں کو کیسے بدلے، آنکھوں کے اندر فطری نسوانی چمک اور پھر اگر کسی کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتی ہو تو اس چاہت بھری نظارگی کو کیسے روکے جو محبوب کو سامنے پا کر آنکھوں میں در آتی ہے۔۔۔ وہ دل ہی دل میں بتا شے گھول رہا تھا اور گڈو چائے سرکتے ہوئے اخبار کی سرخیاں دیکھ رہی تھی کہ چڑاسی اندر داخل ہوا اور ایک وزینگ کارڈ میز پہ رکھ کر مودب کھڑا ہو گیا۔ کارڈ پہ نظر پڑتے ہی شوکت کو جھرجھری سی آگئی، اچشتی سی نظر جان پہ ڈالتے ہوئے چڑاسی سے پوچھنے لگا۔

”کتنے لوگ ہیں۔۔۔؟“

”تین، سر۔۔۔“

”انہیں اندر لے آؤ اور تھوڑی دیر بعد چائے بھی بھجوا دیتا۔۔۔“

من ہی من وہ قہقہے لگا رہا تھا کہ دیکھئے آج کیا ہوتا ہے، دودھ ٹھہرتا ہے یا پانی بچتا ہے۔ ان کے آنے سے پہلے پہلے وہ بہن بھائیوں کا ایک لمبی مدت بعد ڈرامائی ملاقات کا منظر دیکھنے کے لئے خود کو تیار کر چکا تھا۔ زلفی، شایان اور قاسم جو نبی اندر داخل ہوئے تو جان اس طرح اچھلا جیسے اسے کسی نے بجلی کے شنگے تار چھوا دیئے ہوں مگر اس کیفیت کو سوائے شوکت کے اور کوئی بھی نہ دیکھ سکا۔۔۔ شوکت نے بڑے تپاک سے انہیں خوش آمدید کہا، صوفے پہ بٹھا کر خیر و عافیت پوچھنے لگا۔ چند رسمی باتوں کے بعد شوکت نے ان سے میڈم گڈو اور جان کا تعارف کرایا، ہاتھ ملاتے وقت جان کی جان پہ بنی ہوئی تھی لیکن بہت جلد اس نے خود کو سنبھال لیا۔ شایان کو تو وہ پہلے بالکل نہیں پہچان پایا۔ چال ڈھال، لباس، طور طریقے، سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ قریب قریب ہر لحاظ سے ایک خوبصورت نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔ اسے یہ سب کچھ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔

”آپ غالباً“ کراچی گئے ہوئے تھے۔“؟“ زلفی نے شوکت کو مخاطب کیا۔

”جی ہاں، رات ہی لوٹا ہوں۔“ وہ تینوں کو گہری نظروں سے تولتے ہوئے کہنے لگا۔

”بمشاء اللہ“ آج آپ تینوں بھائی بڑے خوش اور فریش دکھائی دے رہے ہیں۔۔۔ اچھا ہوا، آپ خود ہی آگئے۔ میں آج آپ کو فون کرنے والا تھا، بہت جی چاہ رہا تھا ملنے کو۔۔۔ ہاں، یاد آیا۔“ وہ میز کی دراز سے سوہن حلوے کے تین ڈبے نکالتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے لئے کراچی کی سوغات۔۔۔“

زلفی حلوے کے ڈبے لیتے ہوئے کہنے لگا۔ ”شکریہ! لیکن ہمارے لئے اصل سوغات تو کچھ اور تھی، وہ بھی لائے ہیں یا نہیں؟“

شوکت، زلفی کے اشارے کا مطلب سمجھتے ہوئے مسکرائے لگا اور جان بوجھ کر انجان بننے ہوئے کہنے لگا۔ ”سوغات تو آپ کے سامنے موجود ہے۔۔۔“

ذو معنی بات تھی۔۔۔ جان کے چہرے پہ کئی رنگ آئے، گئے۔ میڈم گڈو نے بھی شاید اس کی بے چینی محسوس کر لی تھی۔ وہ بڑی شائستگی سے اٹھتے ہوئے اجازت چاہنے لگی۔

”اچھا، شوکت صاحب! اجازت دیں، بہت دیر ہو گئی۔۔۔ بٹ صاحب آجائیں تو پھر ملاقات ہو گی۔“

”میڈم! بیٹھے، اتنی جلدی بھی کیا۔۔۔ ابھی تو آپ کو حلو پیش کرنا ہے۔“

قاسم اٹھ کر دعوت کے کارڈ پیش کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”بھائی زلفی اور شلیان کی شادیوں کی دعوت کے کارڈ دینے آئے تھے، آپ ضرور تشریف لائیے گا۔۔۔“

زلفی بولا۔ ”شوکت بھائی! کچھ اور باتیں بھی کرنی تھیں۔۔۔ خیر، پھر سہی، آپ سے کل ملاقات ہو گئی۔“

شوکت، زلفی کی بات کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے شادی کارڈ بلند آواز میں پڑھنے لگا۔

”عزیزی ذوالفقار علی ہمراہ عزیزی دختر نیک اختر شگفتہ جیسے — عزیزی شلیان احمد ہمراہ نین تارا —“ کارڈ سرسری طور پر پڑھنے کے بعد مسکراتے ہوئے مخاطب ہوا۔ ”زلفی صاحب، شلیان صاحب! آپ دونوں کو بہت بہت مبارک ہو، مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو بلا تکلف فرمائیے گا۔ میں انشاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا مگر اکیلے نہیں، یہ میرے دوست مسٹر جان اور میڈم بھی میرے ساتھ ہوں گی۔“ اس نے جان اور گڈو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ضرور‘ ہمیں بے حد خوشی ہوگی۔“ زلفی مزید دو کارڈ دیتے ہوئے جان سے مخاطب ہوا۔ ”اس سے پیشتر آپ سے تعارف نہیں تھا اور نہ ہی آپ اور شوکت صاحب کے دوستانہ مراسم کا علم تھا۔ یہ آپ کے دعوت نامے ہیں، ہمیں آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے ہمیں بے پناہ مسرت ہوگی۔“

جان نے کانپتے ہاتھوں سے تھینکس کہتے ہوئے کارڈز لے لیے۔

”اچھا بھئی، اب اجازت۔۔۔؟“ میڈم گڈو، پرس سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میڈم، کچھ دیر رکیں، پلیز۔۔۔ بٹ صاحب کا ایک پیغام اور حلوے کے ڈبے۔۔۔“

گدڑو جھجھلاتے ہوئے پھر بیٹھ گئی۔ زہنی، شایان اور قاسم اللہ حافظ تھے ہوئے رخصت ہوئے۔ ان کے رخصت ہوتے ہی شوکت نے رومال نکال کر ماتھے کا پسینہ پونچھا اور لمبی سی ٹھنڈی سانس کھینچ کر، ریلیکس ہو کر بیٹھ گیا۔

”بھلے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔۔۔ آپ کے دوست ہیں یا رشتہ دار؟“ گڈو نے سگریٹ سلگاتے ہوئے دریافت کیا۔

”دوست ہیں، اچھے مخلص لوگ ہیں۔۔۔“ اس نے کن اکھیوں سے جان کو دیکھتے ہوئے مزید کہا۔ ”میں کراچی کال ملائے دیتا ہوں، آپ اندر جا کر مٹ صاحب سے بات کر لیں۔۔۔“

میڈم کے اندر جاتے ہی جان نے کہا۔  
 ”شوکت صاحب! آج تو آپ نے مان نہ مان، میں تیرا مہمان والی بات دہرا دی۔۔۔ وہ

لوگ آپ کو دعوت دینے آئے تھے، آپ نے زبردستی ہمیں بھی ساتھ گھسیٹ لیا۔ وہ کیا سوچیں گے؟“

شوکت نے بڑے غور سے جان کو دیکھا، دل ہی دل میں داد دینے لگا کہ کیا زبردست اکنٹنگ ہو رہی ہے۔ وہ اس کی اکنٹنگ کا مزید مزہ لینے کی خاطر یکا سامنہ بنا کر کہنے لگا۔ ”جان

صاحب! آپ کراچی سے نئے نئے آئے ہیں، یہاں لاہوریوں کے مہمان ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ لاہور کے زندہ دل اور زبردست مہمان نواز ہوتے ہیں۔ میں نے دانستہ آپ کو

شامل کروایا ہے تاکہ آپ لاہوریوں کا بھی انداز دیکھیں جو آپ کو کم از کم کراچی میں نہیں ملے گا۔۔۔ لے کر آکر اب کہی بھی وجہ سے نہ جانا چاہیں تو مجبور بھی نہیں کروں گا لیکن مجھے یقین

”ہے، آپ ضرور جانا چاہیں گے۔“

”نہ اب کسے کہہ سکتے ہیں۔؟“ مان نے اسے خشمیں نظروں سے دیکھتے ہوئے

پڑھا۔

”میرادل کہہ رہا ہے کہ آپ ان لوگوں کے خلوص کو نظر انداز نہیں کریں گے۔“ شوکت نے بھی خوب بات بنائی تھی۔

”کیا کاروبار کرتے ہیں یہ لوگ۔۔۔؟“

”زلفی صاحب تو تیری پرانی گاڑیوں کا کاروبار کرتے ہیں، اپنا شوروم اور ورکشاپ بھی ہے۔ قاسم صاحب شاید بلڈنگ میٹریل ڈیل کرتے ہیں اور شایان شاید ابھی پڑھ رہے ہیں۔“ شوکت اس کے چہرے پہ نظرس کاڑے، مزے لے لے کرتا رہا تھا۔ پھر اس نے ایک سیدھا تیر چھوڑا، ”کمال ایکٹنگ کرتے ہوئے ایک ٹھنڈی سی سانس بھری۔“ ”زلفی بے چارے کے ساتھ ایک ٹریجڈی ہو گئی ہے، بے چارہ بے حد پریشان رہتا ہے۔۔۔“

”اوہو۔۔۔ کیسی ٹریجڈی۔۔۔؟“ جان کے منہ سے بیسانہ نکلا۔

”اس کی ایک جوان، پڑھی لکھی، بہت ہی اچھی بہن کافی عرصہ سے لاپتہ ہے۔ اسے تلاش کرنے کی اس نے بڑی کوششیں کیں مگر کہیں بھی اس کا سراغ نہیں ملا۔۔۔ کسی نے بتایا ہے کہ وہ کہیں کراچی میں ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ کراچی بہت بڑا شہر ہے، کسی لڑکی کو وہاں ڈھونڈنا بڑا مشکل کام ہے تاہم کوشش جاری ہے۔ دیکھیں، کیا ہوتا ہے۔۔۔ اسی وجہ سے وہ شادی بھی نہیں کر رہے تھے کہ پہلے بہن کو تلاش کر کے اس کے ہاتھ پیلے کریں گے پھر اپنے بارے میں سوچیں گے۔۔۔ کچھ عرصہ پہلے ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ شاید غم زدہ ماں نے مجبور کر کے انہیں شادی کے لئے رضامند کیا ہے مگر اندر سے وہ ابھی بھی شادی کے حق میں نہیں۔“

مری ہوئی آواز میں جان نے کہا۔ ”دیری سیڈ، یہ تو واقعی بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔۔۔ ان کی اور بھی تو بہن ہوگی؟“

”ہاں، دو جوان بہنیں اور بھی ہیں مگر انہیں سب سے زیادہ پیار اسی گمشدہ بہن سے ہے۔۔۔ چھوڑیے، ہم بھی کیا پرایا قصہ لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ ان کے مسئلے، وہی جانیں۔۔۔ آپ سنائیں، کاروبار کا کیا سوچا۔ میرے لائق کوئی خدمت۔۔۔؟“

اس سے پہلے کہ بوکھلایا ہوا جان کوئی جواب سوچتا، گلدو باہر آگئی اور گھڑی دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”بھئی، بہت دیر ہو گئی۔۔۔ اٹھو۔“

جان شاید ابھی جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ گلدو کی بات سنی، ”ان سنی کرتا ہوا کہیں اور ہی غم تھا۔ چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ میڈم نے تشویش بھری نظروں سے دونوں کو باری باری دیکھا۔

”اٹھو، جان! کہاں گم ہو۔۔۔؟“

وہ جانے لگے تو شوکت نے ایک بار پھر تاکید کی کہ شادی کے فنکشن میں اکٹھے چلیں گے، ایک روز پہلے میں پھر یاد دہانی کرا دوں گا۔

☆☆☆

انسان جیسا بھی ہو، حالات اسے کیسا ہی بُرا بنادیں اور وہ اپنے چہرے، جسم، دل و دماغ اور خیالات پہ پر آگندگی کے کتنے ہی پردے کیوں نہ ڈال دے لیکن اپنی فطرتِ سلیم کی ’خوشبو‘ کو ہمیشہ اپنے اندر کہیں محسوس کرتا رہتا ہے جیسے نافہ کستوری لاکھ گند و غنوت کے ڈھیر تلے دبلی پڑی رہے مگر اپنی خوشبو، افادیت اور حیثیت ضائع نہیں کرتی۔ بگڑے ہوئے انسان کا رخ سلامتی کی جانب موڑنے کے لئے نصیحت، تشدد اور نفرت سے کہیں زیادہ محبت، حکمت، صبر اور صحیح موقع موڑ پہ جذباتِ سلیم کو ابھارنا کارآمد ہوتا ہے۔ آج یہ کڑیل وحشی اور ہتھے سے اکھڑا ہوا سائنڈ، جان یہ بھول گیا کہ وہ کیا ہے۔ کن راستوں کا راہی اور کس قماش کا بندہ ہے۔ اس کا روپ، بہروپ، معاش، قماش، طرز زندگی، محرومیاں، دوستیاں، سب کچھ کسی نامعلوم سی بھیننی بھینی خوشبو میں کہیں دب گئی تھیں۔ خون کی کشش نے اسے اک عجیب سی کشش میں جتلا کر دیا تھا۔ اس کے اندر کہیں چھپی سوئی ہوئی بہن، اپنے بھائی کی شادی کی خوشخبری سن کر جھم جھم کرتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ گھوڑی کی باگ پکڑنے، چہرے پہ سجاہرا دیکھنے، اس کی مسہری سجانے اور بھائی کا چاند سا مکھڑا دیکھنے کا ارمان، پورن ماشی کی رات سمندر میں جوار بھانے کی مانند اٹھ آیا تھا۔۔۔ کارڈ رانیو کرتی ہوئی گلدو اس کی خلاف معمول خاموشی کی وجہ سے بے خبر نہیں تھی، وہ خوب سمجھتی تھی کہ اس پر اس وقت کیا گزر رہی ہے لیکن وہ دانستہ خاموش تھی۔ ایک سپیڈ بریکر پر سے اسی رفتار سے وہ شوں کرتی ہوئی گزر گئی، جھٹکے سے شاید جان کی محبت بھی ٹوٹی۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“ وہ ہڑبڑا کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

”۔۔۔ سپیڈ بریکر تھا۔“ گلدو نے اسی بے نیازی سے بتایا۔

”سنہل کر، دیکھ کر چلو۔ براز بردست جھٹکا لگا ہے۔“

”سپیڈ بریکر ہوتا ہی جھٹکے کے لئے ہے خواہ وہ گاڑی کی راہ میں ہو یا زندگی کے راستے

اس کا کام ہی رفتار و روش اور انداز و اعمال پہ نظر ثانی کا موقع فراہم کرنا ہوتا ہے۔۔۔“

گلدو ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”یہ نہ ہوں تو انسان اپنی ترنگ و تساہل میں کسی بڑے حادثے سے دو چار ہو سکتا ہے۔“

”کیا ہوا“ رویوں رہے ہو۔۔۔؟“

”مجھے خود بھی معلوم نہیں۔۔۔ بس، کھل کر رونے کو جی چاہتا ہے۔“

”ضرور رولو، رونے کو جی چاہے تو خوب رونا چاہئے۔ بہنوں اور خوشیوں کے آگے سپیڈ بریکر۔۔۔“

ساون کی جھڑی ذرا تھمی تو جان بولا۔

”یا رابہ شوکت بڑا اچھا اور مخلص آدمی ہے۔۔۔“

”شریف، سمجھدار اور معاملہ فہم بھی۔۔۔“ گڈو نے یہ کہہ کر شوکت کے متعلق،

یہ تعریفی جملہ مکمل کر دیا۔ ”مگر اس برسات کے موسم میں اس زاہد خشک کاکیاؤں کے۔۔۔؟“

جان کے رونے کے حوالے سے برسات کے موسم کی اس نے بڑی خوبصورت بات کی تھی۔ جان مسکرائے بنانہ رہ سکا۔

”گڈو! کبھی کبھی تمہارے اس منہ سے ایسے ایسے پھول جھڑتے ہیں کہ جی چاہتا ہے تم سے۔۔۔“

”۔۔۔ شادی کر لوں۔۔۔ بولو، یہ کہنا چاہتے ہو۔۔۔ چلیں چرچ؟“ گڈو نے اس کے منہ سے بات چھین کر اسے چھیڑا، پھر بولی۔ ”ہاں، تم کچھ شوکت کے بارے میں بات کر رہے تھے۔۔۔؟“

”۔۔۔ میں کہہ رہا تھا، وہ بڑا شریف لڑکا ہے۔“

”میں بھی جانتی ہوں۔۔۔ آگے بڑھو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔۔۔ سرومز کے سامنے سے گزرے تو وہ یاد آگیا۔ وہ پہلا شخص تھا جس کے لئے کبھی میرے دل میں نرم گوشہ پیدا ہوا تھا۔۔۔“

گڈو اسے دزدیدہ نگاہوں سے تولتی ہوئی، شرارت بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔ ”اب اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”میں اپنے بارے میں نہیں، کسی اور کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔۔۔“

”ہائیں، یہ تمہارے منہ سے کیا نکلا۔ تم نے یہ کیا کہا، سوچ رہی ہوں یا سوچ رہے ہو؟“

گڈو نے حیرانی سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

جان چونکتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اپنے آپ ہی منہ سے نکل گیا ہے، شاید صبح ہی نکلا ہو گا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بھائی کی شادی کا سن کر جان کہیں روپوش ہو گیا ہو اور سوئی ہوئی نگہت اچانک جاگ پڑی ہو۔“

جان اپنے آگے ایک بہت بڑے ٹیبلر کو جس پہ کوئی غیر ملکی بھاری آہنی کنٹینر لوڈ تھا، دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس کو اور ٹیک کرو، یا رابہ! کیا مصیبت ہے، آگے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔“

”ہاں۔۔۔ آنکھوں کے سامنے اگر پردہ، دیوار، پہاڑ یا کوئی بڑی سی چیز آجائے تو آگے اس کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا حالانکہ آگے سب کچھ موجود ہوتا ہے۔۔۔“ گڈو نے اسے جواب دیا۔

جان اسے گھورتے ہوئے کہنے لگا۔ ”آج بڑے فلسفیانہ موڈ میں ہو۔۔۔“ کچھ ساعتیں خاموش رہنے کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”۔۔۔ ویسے بات تم نے بڑے پتے کی کہی ہے۔ سفر گاڑی کا ہو یا زندگی کا، آگے سپیڈ بریکر کا ہونا بڑا ضروری ہے۔“

”بھائی کی شادی پہ پیشگی مبارک ہو۔۔۔“ گڈو نے یہ کہہ کر اس کی من کمانڈوں کو مہکا دیا تھا۔

”تھینکس!۔۔۔ کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔ دل، دماغ کی عجیب سی کیفیت ہے۔ دماغ کچھ کہتا ہے اور دل کچھ۔۔۔“

”دو سگریٹ سلگاتے ہوئے گڈو نے لمبی سی ”ہوں“ کی اور بولی۔ ”لو، سگریٹ پیو۔“

☆☆☆

گاڑی سرومز ہسپتال کے آگے سے گزر رہی تھی۔ جان کو شوکت سے پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ دوسری، تیسری اور چوتھی بھی۔ اس کی باتیں، برتاؤ۔ اس کا رکشے والے کو پیسے دینا اور پھر واپس نہ لینا۔ اس کے ذہن کی سکریں پہ فلم سی چلنے لگی۔ مال روڈ، لارنس گارڈن، شاہ بلوط کا بڑا سادرخت۔ بچے، فٹ بال، غبارے، ریس کورس پارک، جھیل نیلا۔۔۔ اس کا شوکت کو رجھانا اور اس کا انکار، تھپڑ۔

کھٹ سے تصور میں چلتی ہوئی فلم ٹوٹ گئی۔ دماغ کے ہال میں اندھیرا چھٹ گیا اور روشنی ہو گئی۔ اعصاب نے جیسے شور مچانا شروع کر دیا۔۔۔ ”لوئے اوئے، تیری ماں۔۔۔“

تیری بہن۔۔۔ ”اوئے ماں!“

یہیں اسے اپنی مرنے والی ماں یاد آ گئی اور وہ کنپٹیوں پہ ہتھیلیاں جما کر پھوٹ پڑا۔ گڈو نے سائیڈ پہ گاڑی روک دی، وہ اسے بچوں کی مانند سسکیاں بھرتے دیکھ رہی تھی۔ پھر ٹشو کا ڈبا اس کی گود میں رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”ہاں“ تو میں کہہ رہا تھا کہ میں اپنے بارے میں نہیں بلکہ اپنی بہن فرحت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔۔۔“ وہ گڈو کی جانب رخ پھیر کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بڑے لجاجت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ ”اچھی گڈو! یہ لڑکا فرحت کے لئے کیا رہے گا؟“

”۔۔۔ بہت اچھا خیال ہے مگر اصل چیز تو یہ ہے کہ آیا وہ اس معاملے میں دلچسپی بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے اس کی منگنی یا۔۔۔“

”مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ہرگز مجھ میں دلچسپی نہ لیتا، میرا اتنا انتظار نہ کرتا۔۔۔“

”یہ تو کوئی جواز نہ ہوا۔۔۔ اور پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دلچسپی تم میں لے اور شادی

تمہاری بہن سے رچ جائے۔۔۔؟“

”تمہاری بات درست ہے لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اگر اسے میرے حالات، میری مجبوریوں اور میری اس خواہش کے متعلق سب کچھ معلوم ہو جائے تو وہ یقیناً ایسا ہی کرے گا۔“

گڈو کچھ دیر غور کرنے کے بعد پوچھنے لگی۔ ”تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہیں پہچان نہیں سکا۔۔۔؟“

”یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں۔۔۔ اگر وہ مجھے پہچان لیتا یا اسے شک بھی ہوتا تو یقیناً کسی نہ کسی طرح اس کا اظہار بھی کرتا۔۔۔ وہ تو وہ مجھے میرا بھائی اور شلیان بھی پہچان نہیں سکے جن سے میرا خون اور خلوص کا رشتہ ہے۔۔۔“

”بہر حال دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ میں کسی مناسب موقع پہ شوکت کو ٹٹولنے کی کوشش کر دوں گی۔۔۔ اور ہاں، بھائی کی شادی میں شرکت کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟“

”تمہاری کیا رائے ہے، جانا چاہئے یا نہیں۔۔۔؟“

”بھائی کی شادی ہے، ضرور شریک ہونا چاہئے۔۔۔“ وہ ڈیش بورڈ پر کارڈ دیکھتے ہوئے بولی۔ ”باقاعدہ دعوت بھی دی ہے، زبانی تاکید بھی کی ہے۔ شوکت اور ہم آکھٹے چلیں گے، اچھے سے گفت دیں گے، خوب ہلاک کریں گے۔۔۔“

☆☆☆

شادی سے دو روز قبل گڈو بڑے خوشگوار موڈ میں دفتر آئی۔ بٹ صاحب بھی کراچی واپس آ چکے تھے، بظاہر وہ ان سے ہی ملنے آئی تھی۔ وہ اندر اپنے راینیوٹ کمرے میں اپنے منیجر اور مشیر انکم ٹیکس سے جمع تفریق کے کسی بکھیرے میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ شوکت سے

ہاں ہی بیٹھ گئی۔

”بڑی لمبی عمر ہے میڈم! آپ کی“ میں ابھی ابھی آپ کو ہی یاد کر رہا تھا۔۔۔ ویسے آج آپ بڑی فریش لگ رہی ہیں؟“

وہ مسکرا بھری تیکھی تیکھی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”خیریت۔۔۔ آپ مجھے یاد فرما رہے تھے؟“

”پہلے یہ فرمائیں کہ آپ آج اکیلی تشریف لائی ہیں، جن صاحب کہاں ہیں۔۔۔؟“

”وہ آج ذرا موڈ میں نہیں تھے اس لئے میرے ساتھ نہیں آ سکے۔۔۔ مجھے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہو رہی ہے کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔۔۔“

وہ شرارت بھرے انداز میں اپنے بال سنوارتی ہوئی بولی۔ شوکت اس نٹ کھٹ طبیعت سے واقف تھا، اسکی خوش طبعی سے محظوظ ہوتے ہوئے بتائے لگا۔

”میڈم! آپ کو یاد ہو گا کہ پرسوں زلفی صاحب اور شلیان بھائی کی شادیاں ہیں۔ میں نے آپ سے یاد دہانی کے لئے بھی کہا تھا اور یہ بھی کہ ہم سب اکٹھے چلیں گے۔۔۔ آپ فرمائیں، آپ مجھے پک کریں گی یا میں آپ کو پک کروں۔ آئیں تو بند ہو گا۔“

”شوکت صاحب! جب آپ نے ہمیں زبردستی کا مہمان بناوا ہی دیا ہے تو پھر چلیں گے بھی آپ کے ساتھ۔۔۔ آپ مجھے وقت اور جگہ بتادیں، میں آپ کو پک کر لوں گی۔۔۔ بڑے ٹلص اور بھلے لوگ ہیں، ان کا ذرا تفصیل سے تعارف تو کروائیں؟“

وہ کمال معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ شوکت بھی دل ہی دل میں اس کی ایکٹنگ کی داد دیتے بغیر نہ رہ سکا، گویا دونوں اک دو بے کو الو سمجھ رہے تھے۔۔۔ وہ بچوں کی طرح آنکھیں ہٹاتے ہوئے بتائے لگا۔

”میڈم! اس روز تو مناسب نہ تھا کہ میں کچھ تفصیل سے بتاتا۔۔۔ دراصل یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر میں نے آپ سے ایک گمشدہ لڑکی کے حوالے سے کیا تھا جس کے بارے میں فی ٹال اتنا ہی سراغ ملا ہے کہ وہ کہیں کراچی میں ہے۔ آپ کو یاد ہو گا۔۔۔ وعدہ بھی کیا تھا کہ آپ اس سلسلے میں کچھ ان کی مدد کریں گی۔ زلفی صاحب، جن کی پرسوں شادی ہے وہ اسی لڑکی ثبوت کے سوتیلے چھوٹے بھائی ہیں مگر وہ اسے سگے بھائیوں سے کہیں بڑھ کر چاہتے ہیں۔ اسے شلیان صاحب ہیں، شیخوپورہ کے علاوہ یہاں بھی جائیداد ہے۔ اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور شاید پڑھ بھی رہے ہیں۔۔۔“

”بڑا ممشوق سالنوا کا ہے۔۔۔ لگتا ہے، ایک آدھ آج کی کسر رہ گئی ہے۔“ وہ شوخ سے

لہجے میں بولی۔

”کیا مطلب۔۔۔ میں سمجھا نہیں؟“ وہ جان بوجھ کر انجان بنے ہوئے پوچھنے لگا۔

”مطلب یہ ہے کہ بے حد خوبصورت ہے، قدرت کی صنائی کا ایک دلاویز نمونہ۔۔۔!“

شوکت بند ہونٹوں سے مسکراتے ہوئے داد دینے لگا، بولا۔ ”میڈم! آپ کی حس جمل کا بھی جواب نہیں اور قدرت بھی عجیب عجیب نمونے تخلیق کرتی ہے۔ جہاں سختی، کرخنگی اور مردانہ وجاہت و جلال چاہئے وہاں نرمی، نزاکت اور جلازیت و جمل کی جلوہ آرائیاں پیدا کر دیتی ہے اور کہیں نسائیت نصیب کر کے مردانہ ”فسطائیت“ فروغ دے دیتی ہے اور کچھ لوگ یہ غیر فطرتی رد و بدل خود اپنی مرضی، مزاج اور مجبوری سے بھی کر لیتے ہیں۔۔۔“

میڈم نے تو یہ بات، محض بات برائے بات ہی کہی تھی مگر شوکت نے تو بات کی گھات میں اسے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ وہ دیدے پھاڑے اسے یوں تک رہی تھی جیسے اپنے دل میں چھپائی ہوئی ہر بات کا انیسرے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی ہو یا جیسے وہ شوکت کے سامنے نہیں بلکہ جذبات سے عاری سپاٹ چہرے والے کسی بڑے ڈاکٹر، عامل یا کسی ماہر تنویم کے سامنے بیٹھی ہو۔۔۔ کافی دیر وہ اس کے ذومعنی جواب پہ غور کرتی رہی۔ اس کے اس جواب میں بہت سے اشارے پنہاں تھے، عجیب تذبذب کے عالم میں پھنسی ہوئی تھی۔ اچانک بولی۔

”کیا تم اپنی بات کی کھل کر وضاحت کر سکتے ہو مسٹر شوکت۔۔۔؟“

شوکت کے چہرے پہ پُر اسرار سی مسکراہٹ ابھری، انگلیاں چمچاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میڈم! یہ تو ایسے ہی ہے جیسے میں کہوں کہ آپ اپنے سوال کی وضاحت کریں۔۔۔ بات صرف اتنی ہے کہ کارخانہ قدرت اور انسانی کار اختیار سے ایسے عجوبے اکثر معرض وجود میں آتے دکھائی دیتے ہیں۔“

وہ بے بس سی پھر کہنے لگی۔ ”ایک بات پوچھوں، اس یقین کے ساتھ کہ تم اس کا جواب صاف صاف اور صحیح دو گے۔۔۔؟“

”ضرور پوچھیں۔۔۔ سچ اگر چھپانا چاہوں بھی تو آپ سے چھپا نہیں سکتا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

گڈو کی کانٹوں بھری زبان سے بمشکل نکلا۔ ”جان کے متعلق تم کیا جانتے ہو۔۔۔؟“

”جان تو جان ہے، ہر کوئی جاندار جانتا ہے کہ جان کیا ہے۔۔۔ عجیب سا سوال ہے آپ کا۔۔۔؟“

اس کے لاجواب، جواب سے زچ ہو کر اس نے پانی طلب کیا۔ پانی کے چند گھونٹ پینے

کے بعد وہ محسوس کرنے لگی جیسے وہ بھیگی مٹی میں تبدیل ہو چکی ہو لیکن اسے یقین ہو گیا تھا کہ نوکت، جان کی حقیقت سے واقف ہے۔ اب وہ اس کرید میں تھی کہ اگر وہ واقف ہے تو اسے اس حقیقت کو چھپانے میں کون سی مصلحت درپیش ہے۔۔۔ اس نے قدرے سنبھالا لیتے دئے کہا۔

”تم نے ابھی ابھی کہا تھا کہ تم سچ کو چھپانا بھی چاہو تو چھپا نہیں سکتے۔ پھر تم یہ۔۔۔“

شوکت نے ہلکا سا ہنستا ہوا تہقہہ اچھالا، بولا۔ ”تو گویا آپ سچ سننے پہ مصر ہیں۔۔۔“ وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

”میڈم! آپ اپنی ذات میں کیا ہیں، یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے لیکن آپ میرے لئے بڑی ترم ہیں۔ آپ بڑی مخلص، ہمدرد اور زندگی کی توانائیوں سے بھرپور خاتون ہیں اور سب سے اہم بات کہ مجھے آپ سے مل کر ہمیشہ بڑی خوشی ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے علم ہے، جان کے پردے میں نگہت لپٹی ہوئی ہے۔ میں بھی پہلے دھوکا کھا گیا تھا مگر انسان چاہے کتنے ہی روپ بدلے، اپنی آنکھیں اور بات چیت کا قدرتی لہجہ بدلنے پہ شاید ابھی قادر نہیں لیکن بری سمجھ میں یہ آج تک نہیں آیا کہ نگہت کو مجھ سے چھپنے کی کیا ضرورت ہے؟۔۔۔ میں ان کا دوست ہوں، خیر خواہ ہوں۔ ماضی میں بھی میری یہ حتی الامکان کوشش رہی کہ اس کے سی کام آسکوں، اب بھی میں اس کی بہتری اور خوشی کے لئے اپنی حقیر سی جان قربان کر سکتا ہوں۔ آپ شاید نہیں جانتیں کہ میں نے اسے کتنا تلاش کیا۔ پولیس کیس، اخباروں میں اس کا تصویریں، خبریں دیکھ کر میں کتنا پریشان ہوا۔ رویا، بیمار رہا۔ وہ شاید انہی وجوہ کی بنا پر میرے سامنے نہیں آنا چاہتی۔ میڈم! مزے کی بات یہ ہے کہ وہ میرے سامنے آنا بھی چاہتی ہے۔ اگر مانہ چاہتی تو وہ کراچی مجھے ہسپتال نہ لے جاتی، ہوٹل میں ٹیلی فون پہ مجھ سے رابطہ نہ رکھتی، مل نہ آتی۔ یہ سب کیا ہے؟۔۔۔ اگر وہ زلفی صاحب، شایان بھائی یا دیگر رشتہ داروں سے باکرے تو چلو، کسی نہ کسی طرح اس کا ایسے کرنا بنتا ہے لیکن میں تو اس کا دوست تھا جیسے آپ۔ بتائیے، آپ سے اس کا کیا پردہ ہے؟۔۔۔ میں بھی اس کو ایک حد تک جانتا ہوں۔ آپ ابھی اس نے بتایا ہو گا کہ میرا اس سے کیسے ملنا جلتا رہا۔۔۔“

وہ کرشل پیپر ویٹ کو گھماتے ہوئے کہنے لگا۔

”اس بات کا مجھے افسوس ہے کہ وہ میرے سامنے کھل کر کیوں نہیں آنا چاہتی۔ اس کی سچ غلط ہے، اس نے مجھے انڈر اسٹیٹ کیا ہے۔۔۔ میڈم! وہ بڑی نہیں، وہ ایک اچھے مردان کی اچھی لڑکی ہے۔ حالات، اپنوں کی کوتاہیوں، محرومیوں اور فکرِ معاش نے اسے غلط

راستوں پہ ڈال دیا۔ اب جبکہ بہت کچھ ہو چکا، حالات اور وقت کروٹ بدل چکے۔ باپ مر گیا، بہنیں گھر واپس آ گئیں۔ بھائی کی پرسوں شادی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اب اسے بھی اپنے اصل پہ لوٹ آنا چاہئے۔۔۔ معاف کیجئے گا، جو راہ وہ اختیار کئے ہوئے ہے اس کے آگے مزید بربادی اور گمراہی تو ہو سکتی ہے مگر منزل مراد نہیں مل سکتی۔۔۔ "شوکت رو تو نہیں رہا تھا، آنکھوں کے کونے ضرور بھیگے ہوئے تھے۔ لجاجت بھرے لہجے میں اس کی جانب دیکھ کر کہنے لگا۔ "میڈم! آپ کو یسوع مسیح کا واسطہ، نگہت کو بچالیں۔۔۔"

بے اختیار آنکھیں چٹکنے ہی وہ معذرت کر کے ہاتھ روم میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو گندو موجود نہیں تھی۔ ٹیلی فون کے پاس، پیپر پیٹ کے نیچے کانڈ کا ٹکڑا باپڑا تھا جس پر لکھا تھا کل ملاقات ہوگی۔

☆☆☆

شایان اور اس کے گھر والے تو پچھلے ہفتے ہی سے یہاں آ گئے ہوئے تھے۔ دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں اپنے عروج پہ تھیں۔ ٹوبے سے نگہت کے ماموں، دونوں ماموں زاد اور چیدہ چیدہ قریبی رشتہ دار بھی آ چکے تھے۔ دونوں لڑکیاں نین تارا اور شگفتہ مایوں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اگلے روز دونوں کی تیل مندی تھی۔ عزیز رشتہ دار، منشی کرم الہی اور دیگر ملازمین انتظامات میں جتے ہوئے تھے۔ دونوں گھر ساتھ ساتھ تھے۔ ادھر سے نکلے، ادھر جا پہنچے۔ سبھی انتظامات ایک ہی جگہ تھے۔ عورتیں اندر دن خانہ اور مرد بیرون خانہ خوشی خوشی بڑی مستعدی سے اپنی اپنی ذمہ داریوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ ان سب میں صرف دو فرد ہی ایسے تھے جنہیں اس خوشی کے موقع پہ بھی کسی کمی اور غمی کا احساس ہو رہا تھا اور لاکھ خود کو بہلانے اور مصروف رکھنے کے باوجود وہ اپنی اندرونی خلش اور ذہنی خلفشار کو دور نہیں کر سکے تھے، دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن گھریلو ہنگاموں اور ادھر ادھر کے کاموں سے ہی فرصت نصیب نہیں ہوتی تھی۔

اس روز وہ دونوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مغرب کی نماز کے لئے مسجد چلے گئے۔ وضو سے فارغ ہوتے ہوئے جماعت کھڑی ہو چکی تھی، شام ختم ہونے سے پہلے پہلے وہ دوسری قطار میں منجائش دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ آج نماز میں کچھ مزہ ہی عجیب تھا۔ ہر نمازی کو نماز میں حضوری نصیب نہیں ہوتی، اگر کسی خوش نصیب یہ حضوری کی ساعت نصیب ہو جائے تو نمازی کی کیفیت ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اب عجیب سی خوشبو محسوس ہونے لگتی ہے اور شایان کے ساتھ بھی شاید کچھ ایسی ہی واردات ہو گئی تھی۔ ایسا خشوع اسے کبھی پہلے نصیب نہیں ہوا تھا۔

شبہم کے ٹوٹیوں سے تر آنکھیں، سر جھکا ہوا، لرزتا ہوا سرایا، قیام و رکوع و سجود میں، کسی چیز کا ہوش نہیں۔ آخری سجدے میں اس کا سر آگے والے نمازی کے پاؤں سے الجھا تو اس کی ٹوپی وہیں نمازی کے پاؤں میں پڑی رہ گئی۔ سلام کے بعد آگے والے نمازی نے بیٹھے بیٹھے پلٹ کر ٹوپی اٹھائی، چومی اور اس کے سر پہ رکھ دی۔ نظر پڑتے ہی شایان غش کھا کر پھر سجدے والی جگہ پہ جھک گیا۔ امام دُعا پڑھ چکے تھے، نمازی سنتوں کے لئے کھڑے ہو رہے تھے۔ زلفی نے اسے اٹھا کر باہر صحن میں لائے۔ قاسم، اس کے والد اور شایان کے ابو کرم الہی، سب ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ چہرے پہ پانی کے چھینٹے مارے، تلوے اور سر پہ لایا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور ارد گرد ایک ایک چہرے کو دیکھنے لگا۔ آنکھوں میں وحشت کی پرچھائیاں تھیں، یوں لگتا تھا جیسے اس کا دماغ الٹ گیا ہے۔

"باباجی کہاں ہیں؟" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ زلفی نے حیران ہو کر کہا۔ "باباجی یہاں کہاں۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو؟" وہ نے انہیں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کے قدموں میں میرا سر تھا، انہوں نے ٹوپی چوم کر میرے سر پہ رکھی۔۔۔"

وہ لوگوں کو پرے ہٹاتے ہوئے باباجی کو ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ زلفی بھی اٹھا اور اندر باہر ہر جگہ دیکھ آیا مگر باباجی یہاں ہوتے تو نظر آتے۔

"بھائی، تمہیں مغالطہ ہوا ہے۔۔۔ باباجی یہاں نہیں ہیں۔" وہ نے ان کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی اس کے بے ہوش ہونے کی خبر وہاں پہنچ چکی تھی۔ گھر پہنچے زعورتیں، مرد سب ہی پریشان تھے۔ چارپائی پہ لٹایا، ہاتھ پاؤں پہلے۔ ہر بندہ اندر آ کر اپنی اپنی رائے دے رہا تھا۔ بڑی مشکل سے سب کو باہر کیا، اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ زلفی کے لئے نہ ماننے کی کوئی وجہ نہ تھی، اسے یقین تھا کہ اس نے باباجی کو ضرور دیکھا ہے۔ نماز میں وہ اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ نماز کے دوران اس نے شایان کی عجیب و غریب سی کیفیت کو محسوس ہی کیا تھا، اس کے سوا باقی سب نے اس کی بات کو واہمہ قرار دیا۔۔۔ قدرے سکون لینے کے

ندوہ نارمل ہو چکا تھا، گھر والے بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ زلفی نے کہا۔ "تمہیں میری اس بات پہ یقین نہیں ہے۔۔۔؟"

"سو فیصد یقین ہے، نہ یقین کرنے والی کون سی بات ہے۔۔۔؟"

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے باباجی کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھا ہے۔ ان کا ٹوپی کو چومنا، پھر برے سر پہ رکھنا، یہ سب کچھ میری کھلی آنکھوں کے سامنے میرے پورے ہوش و حواس میں۔"

ہوا ہے وہ بتا رہا تھا۔

نماز میں کھڑے ہوتے ہی میری حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے تاجہ نظر کھلا میدان ہے۔ میرے آگے ایک شخص کھڑا ہے، میں اس کی اقتداء میں نماز ادا کر رہا ہوں۔ نماز کے بعد وہ بزرگ شخص میری جانب پلٹا، مسکراتے ہوئے ٹوپی چوم کر میرے سر پہ رکھ دی۔ وہ باباجی تھے۔۔۔ سو نکھو، میرے سر اور چہرے کو اچھی طرح سو نکھو۔ کیسی سوندھی سوندھی خوشبو آرہی ہے۔ اس خوشبو کو میں پہچانتا ہوں، یہ باباجی کی مخصوص خوشبو ہے۔۔۔ وہ زلفی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ”پلیز، اٹھو۔ باباجی کو تلاش کرتے ہیں۔۔۔ پرسوں ہماری شادیاں ہیں۔ ان سے ملیں، شادی پہ آنے اور آئندہ بہتری کے لئے دعا کی درخواست کریں۔“

پان والی دکان پہ آئے تو معلوم ہوا کہ باباجی کا کچھ معلوم نہیں، کب آئیں۔ پچھلی جمعرات آئے تھے، شاید آج بھی آئیں۔ پھر پان والا وہ ذرا دور ایک گاڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتانے لگا کہ وہ گاڑی والے بھی ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ گاڑی کی جانب دیکھا، پارکنگ لائیٹ آن تھی۔ دو ڈبے جوس لے کر وہ ٹیلٹ ٹیلٹے گاڑی کی جانب آگئے۔ ہنڈا سپورٹس، میرون میک کھر گاڑی کھڑی تھی۔

”یار! یوں لگتا ہے، اس گاڑی کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔۔۔“ زلفی ذہن پہ زور ڈالتے ہوئے سوچنے لگا، پھر جیسے ایک جھماکا سا ہوا۔ ”یہ تو میڈم گڈو کی گاڑی ہے۔۔۔“

دراصل یہ گاڑی فائو شار ہوٹل والے ہیڈ بار میڈ پیٹریال کی تھی، اسے گڈو بھی کبھی کبھی استعمال کر لیا کرتی تھی اکثر اسی گاڑی میں شوکت کے آفس بھی آتی جاتی رہتی تھی۔۔۔ ذرا اور قریب پہنچے تو اوپن ونڈو سے میڈم گڈو اور جان، سیٹ بیک سے سر نکالے دھیمی آواز میں میوزک سے لطف اندوز ہوتے نظر آئے۔ اس سے پیشتر کہ یہ انہیں اپنی جانب متوجہ کراتے، میڈم گڈو انہیں دیکھ چکی تھی۔ وہ دونوں باہر نکلے، بڑی گرم جوشی سے ملے۔ بات کرنے میں میڈم گڈو نے پہل کی۔

”آپ پان کھانے ادھر آئے ہیں یا جان بتانے۔۔۔؟“

وہ اس کی رمز کو سمجھ نہ پائے لیکن جان نے گڈو کی جانب گھور کر ضرور دیکھا۔ زلفی نے یونہی جواب لڑھکا دیا۔

”میڈم! جان صاحب تو ماشاء اللہ آپ کے ساتھ ہیں، ہم لوگ کیا جان بنائیں گے۔۔۔؟“

جان کے سوا کبھی کھلمکھلا کر ہنس دیئے۔

”بھئی، میرا مطلب جان بنانے سے کچھ کھانا پینا تھا۔۔۔“

جان کی تو واقعی جان پہ بنی ہوئی تھی۔ یہ لوگ ہنسی ٹھٹھول میں مشغول تھے۔

”آپ ادھر کدھر۔۔۔؟“ میڈم گڈو نے پوچھا۔

”۔۔۔ دراصل، اس پان والی شاپ پہ ایک بزرگ کبھی کبھی بیٹھتے ہیں، ان کی زیارت کے لئے آئے تھے۔“ زلفی نے جواب دیا۔

”عجیب اتفاق ہے، ہم بھی ان ہی کے انتظار میں یہاں کھڑے ہیں۔“

”آپ انہیں جانتی ہیں۔۔۔؟“ زلفی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ ان کے بارے میں سنا ہے کہ بڑے اچھے بزرگ ہیں لیکن ان سے میرا کبھی ملنا

نہیں ہوا۔ آج بھی یوں لگتا ہے کہ ملاقات نہیں ہوگی، ہم کافی دیر سے کھڑے ہیں۔“

”ہوں۔۔۔ ہے تو ذاتی سا سوال، اگر مناسب سمجھیں تو بتا دیں کہ آپ ان سے کس

سلسلے میں ملنا چاہتی تھیں؟“

”بھئی، جان صاحب کے لئے دعا کرنا چاہتی تھی۔۔۔ کسی نے بتایا ہے کہ ان کی دعائیں

قبول ہو جاتی ہیں۔“ گڈو اور جان گاڑی سے اتر کر ان کے پاس آگئے۔

زلفی نے جان کی طرف دیکھا جو پان والی دکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”دعا ان کے کاروبار کے لئے کرنا چاہتی ہیں یا شادی۔۔۔“ زلفی چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں

تھا۔

وہ جان کی جانب دیکھ کر مسکرانے لگی، بولی۔ ”پہلے آپ بتائیں، آپ دونوں کس سلسلے

میں ان سے دعا کرنا چاہتے ہیں؟۔۔۔ شادیاں تو آپ کی قریب قریب ہو چکیں، صرف ڈیڑھ

دن کی آج کی کسر ہے۔ کاروبار بھی ماشاء اللہ آپ کے سیٹ ہیں۔۔۔ رہی بچوں کے لئے دعا کی

بات، تو دوستو! پہلے دلہنیں تو آئیں دو، بچے بھی چھم چھم برسنے لگیں گے۔“

زلفی نے قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے وضاحت کی۔ ”میڈم! اک عرصہ سے ہماری بہن

گم ہے۔۔۔ شادیاں تو ہو رہی ہیں لیکن ہمیں ذرہ بھری خوشی نہیں، صرف والدین کی خواہش

کے آگے سر جھکا دیا ہے۔ یقین کریں ہمارا دل اندر سے رو رہا ہے۔ مزہ تو تب تھا کہ ہماری بڑی

بہن خود اپنے ہاتھوں سے ہمارے سروں پہ سہرے سجاتی، ہمیں دوہا بہاتی۔۔۔“

شایان سے بھی رہا نہ گیا وہ روہا نسو سا ہو کر بتانے لگا۔ ”وہ بہن مجھے کہا کرتی تھی کہ تم

میرے گڈے ہو، میں اپنی گڑیا کی تم سے شادی کروں گی۔۔۔ کیا خبر اسے اپنی یہ بات یاد بھی

ہے یا نہیں۔؟“

اسی لمحے جان بچھارتے ہوئے اس سے لپٹ گیا، بولا۔ ”یاد ہے، میرے گڈے! یاد ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“

جان کی یہ حرکت، کم از کم ان دونوں کی سمجھ میں نہ آئی۔ شایان کو اس نے اپنے کرتی بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا۔ زلفی حیرانی اور میڈم گڈو، آنسو بہاتے ہوئے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔۔۔ ہچکیاں تھمیں، ذرا دل کا غبار نکلا تو جان، زلفی سے لپٹ گیا۔ منہ ماتھا چومنا شروع کر دیا۔

”میرے بھائی! مجھے معاف کر دو، میری خطائیں بخش دو۔ میں نے آپ کو بڑے دکھ دیئے ہیں۔۔۔“

کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور ڈرامائی انداز میں ہوا کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ گڈو نے گاڑی سے نشو کا ڈبا نکالا، جان کا آنسوؤں سے تر چہرہ صاف کرتے ہوئے اپنے ساتھ لپٹا لیا، بولی۔

”باباجی کسی مخصوص چہرے، جسم یا شخصیت کا نام نہیں۔۔۔ اور نہ ہی مسجد، گرجا، اینٹوں، دیواروں، محرابوں، گنبدوں یا مینار و کلس کا نام ہے اور نہ یہ شیطان، کسی نوکیلے سینگوں، انگار آنکھوں اور تیر کی آبی والی لمبی سی دم کا نام ہے۔

یہ سب کچھ یقین، اعتقاد، نیت اور سوچ و خیال کے نام ہیں۔۔۔ آپ لوگ اور ہم باباجی کی تلاش میں نکلے۔ ہمیں یقین تھا کہ اللہ ان کے وسیلے سے ہماری پریشانیاں دور کر دے گا۔ ہم اپنی اپنی مرادیں لے کر آئے اور باباجی نے بن طے ہی ہمیں وہ کچھ دے دیا جس کے لئے ہم دعا کرانے نکلے تھے۔۔۔ میرے سویٹ بھائیو! یہ تم دونوں کی بہن نگہت ہے۔“

سڑک کنارے، رات بارہ بجے عجیب ڈرامہ ہو رہا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ مارکیٹ کی دکانیں بند تھیں، ٹریفک جاری تھی۔۔۔ راہ گیر نہیں تھے ورنہ ایسا تماشا دیکھنے کو ملتا کہ صبح اخباروں میں شائع ہو جاتا۔ آپیں، سسکیاں، رونا، برا حال۔۔۔ شایان اور زلفی بار بار جان کی طرف دیکھتے تھے۔ کچھ دیر بعد طوفان تھما تو نگہت لجائی شربانی، خجل سی ایک طرف مجرموں کی طرح کھڑی تھی۔ ناگہاں شایان کی نظر بڑی، باباجی اسی طرف آ رہے تھے۔ ہاتھ میں جوس کے ڈبے اور ایک بڑا سا پیکٹ تھا۔ ان سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ قریب آ کر انہوں نے سلام کیا۔ سب کی خیریت پوچھی، سرود پہ دست شفقت پھیرا۔

”بھو! او! یہ ٹھنڈا مشروب پیو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔۔۔ ابھی ابھی جعرات شروع ہوئی۔

رات کا رنگ کالا کھل والا، دو جوڑے کالے کپڑے۔ جنہوں نے روپ بدلے، ہم نے ان کے چولے بدلے۔ پہلی زندگی، پہلے سارے کپڑے، لپٹ کر فجر کی نماز سے پہلے ماہو لعل حسین کے قدموں میں پہنچ جائیں۔۔۔“

یہ کہہ کر باباجی نے وہ پیکٹ انہیں تھمایا اور دکان پہ چلے گئے۔ گم صم کھڑے وہ سب انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ان کی گھجک باتیں کیا پلے پڑتیں، دیر تک ہکا بکا کھڑے اپنی اپنی عقل سے مطلب اخذ کرتے رہے۔ بعد از کوشش بسیار یہ بات سمجھ میں آئی کہ باباجی نے شایان اور نگہت کو پہلی طرز زندگی بدل کرنی زندگی شروع کرنے کا اشارہ دیا ہے۔ پہلی گزری زندگی کے سارے دکھ اور پہلے سارے کپڑے باندھ کر لانے کا حکم دیا ہے اور پیکٹ میں موجود کالے کپڑے پہن کر آنے کو کہا ہے۔۔۔

شادی والے گھروں میں کون سوتا ہے پھر جبکہ شادی میں صرف ایک دن باقی ہو۔ گھر پہنچے تو گھر، گلی، روشنیوں سے جگمگ کر رہے تھے۔ ڈھولک پہ تھاپ پڑ رہی تھی۔ عزیز رشتہ دار تنہوں قاتیں، کرسیاں میز اور ادھر ادھر کے انتظامات میں مگن تھے۔ زلفی اور شایان کو گھر تک پہنچا کر گڈو اور نگہت، صبح تین بجے پہنچنے کا کہہ کر چلی گئیں۔ زلفی اور شایان کی زندگی میں تو جیسے اک دم بہار آگئی تھی، خوشی کے مارے زمین پہ پاؤں نہیں پڑتے تھے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ جب تک باباجی حکم نہ دیں، گھر والوں کو ابھی کچھ نہ بتایا جائے۔ شایان نے اپنے تمام زنانہ مردانہ کپڑے ایک چادر میں جمع کر کے باندھ لئے۔

تین بجنے میں باجج منٹ باقی تھے۔ جب شایان غسل سے فارغ ہو کر باباجی کا دیا ہوا کالا جوڑا پہنے تیار تھا۔ ٹھیک سوا تین بجے میڈم گڈو بھی آگئی۔ نگہت نے کالا کھٹا سا جھولا، سر پہ کالی چادر اور گٹلے میں عقیق بینی کی مالا پہنی ہوئی تھی۔ عورت لگے نہ مرد، بس اک ملنگنی سی تھی جو سر جھکائے نیٹھی شاید رو بھی رہی تھی۔ مدھم سی روشنی میں اسے دیکھ کر دونوں ششدر رہ گئے۔ زلفی اور شایان نے سر پہ ہاتھ رکھ کر ریا کیا۔

”تمہیں اپنے گھر اور نئی زندگی میں آنا مبارک ہو۔۔۔“ زلفی پھر میڈم گڈو سے مخاطب ہوا۔ ”میڈم! آپ نے ہماری بہن ملا کر جو ہم پہ احساس عظیم کیا ہے اس کا اجر آپ کو اللہ تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں، ہم تو اپنے اس منہ سے آپ کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتے۔۔۔“

وہ گھڑی دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”فضول باتوں میں وقت ضائع مت کریں۔ گاڑی میں بیٹھیں، مجھے ٹھیک چار بجے وہاں پہنچنا ہے۔۔۔“

وہاں پہنچتے پہنچتے صبح صادق کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ طائران صبح گاہی اپنے اپنے رتب کی

ختم ہوئی تو ان دونوں کی آلمان شروع ہو گئی۔ صاف چادر بچھا کر اس ستار، غفار، کریم اور ریحیم کے سامنے کھڑی ہو گئیں جو صدق دل سے توبہ کرنے والوں کو نہ صرف معاف کرتا ہے بلکہ بہت ہی خوش ہو کر وہ کچھ نواز دیتا ہے جو انسان کے گمان میں نہیں ہوتا۔ کیا پڑھا، کیا نہ پڑھا۔ بس دونوں رو رو کر گڑا کر اپنے گناہوں پہ تادم ہو رہی تھیں۔ کیچہ پھٹنے والے ہو گئے۔ ایک دوسرے سے بے خبر اپنی اپنی پٹیاں پڑی ہوئی وہیں بے سُدھ سی ڈھے گئیں۔ رات اپنی فلمنتوں کے ساتھ ان کے اندر کی تاریکیاں بھی لے کر کہیں غائب ہو چکی تھیں۔ صبح کے اُجالے نے ان کے چروں پہ نور بکھیر دیا تھا۔ جسم و جان کی ساری کٹافیں دھل چکی تھیں جیسے نیا جنم مل گیا ہو۔ جلدی سے تیار ہو کر سیدھی شوکت کے دفتر پہنچیں۔ شوکت ابھی دفتر نہیں پہنچا تھا بیٹھتے ہی چڑاسی کو بھرپور ناشتے کا آرڈر دیا۔ نگہت نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”مناسب سمجھو تو مجھے اپنا پروگرام بتا دو۔“

گڈو نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”پروگرام سارے باباجی نے سیٹ کر دیے ہیں، ہم سب نے اب صرف عمل کرنا ہے۔“

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔ ذرا۔۔۔“ نگہت کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ شوکت اندر داخل ہوا، عجیب بات کہ وہ بھی سیاہ رنگ کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔ ”السلام علیکم“ بھی اس کے منہ سے آدمی ہی نکلی، وہ تینوں ہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ چند لمحوں بعد سکوت ٹوٹا۔

”آپ اس وقت۔۔۔ اور یہ کالا لباس۔۔۔؟“ وہ خود اپنے لباس کو بھی دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”آفس ٹائم شروع ہو چکا ہے۔ آپ دفتر آ گئے ہیں، کوئی اور بھی آ سکتا ہے۔۔۔ باقی رہا کالا لباس، تو آپ کا اپنے لباس کے بارے میں کیا خیال ہے۔۔۔؟“

وہ لا جواب سا ہو کر اپنی سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے پینے پوچھنے لگا۔ نگہت ڈھیلا ڈھیلا لباس، سر پہ اجرک اور گلے میں کالا پنچے، سر جھکائے ہوئے اپنی موٹی موٹی انگلیوں کو دیکھ رہی تھی اور وہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”نگہت! نئی صبح کے اُجالے، نئی سوچ، نیا انداز اور نئے پرانے رشتے مبارک ہوں۔۔۔“ پھر وہ میڈم سے مخاطب ہوا۔ ”میڈم! آپ کو بھی نیا دن، نئی زندگی اور دائرہ اسلام میں داخل ہونا مبارک ہو۔۔۔“

چڑاسی ناشتہ لے کر اندر داخل ہوا۔

حمود ثناء میں مصروف تھے اور اشرف الخلوقات، مزار شریف کے ارد گرد قبروں کے درمیان سوئے ہوئے تھے، کچھ مرد وزن پڑھنے پڑھانے میں مصروف تھے۔ گاڑی پارک کر کے چاروں سرکار شاہ حسین کے روضہ مبارک کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ باباجی اندر سے باہر آئے، تبسم فرماتے ہوئے سلام میں پہل کی۔ ”صدقے کے دونوں کالوں“ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ الاؤ کی چار دیواری کے پاس آکر انہوں نے دونوں کو کہا۔

”اپنی اپنی پہلی کرنیاں اور کُرتے، کُرتوت اس میں پھینک دو۔۔۔ سُرخاب، سُرخ لائٹ، سُرخ شعلے۔۔۔“ شایان نے سُرخ لائٹ سے آگ دکھادی۔ ”سُرخاب ختم، کالا تیز حق ہو۔ حق۔۔۔ کالا پن، سُرخ شعلہ اوپر نہیں جاتا۔ جل کر کالا دھواں بن، اوپر جا۔ تم دونوں کے تن کی میل جل گئی۔ سیاہ سرمہ بن کر نین میں بس جاؤ۔ اپنی خواہشوں کے چہرے پہ سیاہی پوت لو۔ تن کالا، من اُجلا، بول کاگا، موہن کب گھر آوے۔ قبر کا اندھیرا۔۔۔“ وہ نگہت سے مخاطب ہوئے۔ ”بچی! تو بچ گئی۔ گڈی، گڈا اور گڈو۔۔۔ انت خیر۔ اب جاؤ گڈی گڈے کے ساتھ کالے کالے گڈو گاڑیوں والے کے ساتھ۔۔۔ بہن، بھائی، تم سب بہن بھائی ہو۔“

شایان نے بڑی جرات سے کل شادی میں شرکت کی التجا کی۔

”اللہ خیر۔۔۔“ جواب دیا۔

دونوں مزاروں پہ فاتحہ پڑھی، اندر ہی گڈو نے عرض کی۔

”باباجی! میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔۔۔“

باباجی نے فرمایا۔ ”من اجلا، تن میلا۔ بن جا اس سوہنے کی لیلیٰ۔۔۔ بازار مت گھوم۔

مست بن، مستی میں جھوم۔۔۔“

باباجی مستی میں جھومتے ہوئے مسجد کی جانب بڑھ گئے۔ رات نہ گڈو سوئی، نہ نگہت۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہ لیتے تھے جیسے دونوں کے اندر صاف کر کے ہی دم لیں گے۔ صبح دم جب دونوں کو ہلکا سا قرار آیا تو غسل سے فارغ ہو کر دونوں نے کالے کپڑے زیب تن کئے، ایسے میں سردی آہنگ میں اذان بلند ہوئی۔

اللہ اکبر اللہ اکبر کے الفاظ۔

گڈو جیسے خود بخود سجدے میں جھک گئی۔

اشھد الا للہ الا للہ۔۔۔

وہ سر اور شہادت کی انگلی اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھنے لگی جب۔

”محمد رسول اللہ“۔۔۔ یہ بات آئی تو دونوں نے انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے مس کئے۔ اذان

”آپ— آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں، آپ کو یہ سب—؟“ گڈو کی زبان ہکلا رہی تھی۔

وہی ازلی مسکراہٹ لئے وہ بولا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں، میں سب بتاتا ہوں۔ پلیز، نگہت! تم چائے بناؤ۔“ شاید ہی آپ کو میری بات پہ یقین آئے جیسے کہ مجھے بھی آپ دونوں کو اس جیلے میں دیکھ کر یقین نہیں آ رہا لیکن یقین کے بنا چارہ بھی نہیں۔ میڈم! میں گزری رات شاید ہی کسی لمحے سویا ہوں گا۔ کل آپ نے مجھے تو کھول کر رکھ دیا مگر خود میری میز پہ ایک بند چٹ رکھ کر چلی گئیں۔ میں سوچتا رہا کہ آپ میرے بارے میں جانے کیا کیا سوچتی رہی ہوں گی۔ مجھے وہ سب کچھ کہنا بھی چاہئے تھا یا۔۔۔ بہر حال، جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔“ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بتاتے لگا۔ ”آذان سے کچھ دیر پہلے سویا تھا یا جاگ رہا تھا جب میں نے دیکھا کہ آپ سب کو آگ لگ گئی ہے، جل رہے ہیں لیکن مسکرا بھی رہے ہیں۔ آگ کے شعلوں نے آپ کے لباس کو تو جلا دیا ہے لیکن جسموں کو چھوا تک نہیں بلکہ تپ کر اور نکھر گئے ہیں۔ پھر میں نے ایک بزرگ کو دیکھا۔ انہوں نے آپ کو سیاہ لباس پہنایا۔۔۔ عجیب سا خواب تھا، ایک ایک بات واضح دیکھی۔ پھر اٹھا، غسل کیا، نماز پڑھی اور آپ سب کے لئے دعا مانگی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آج ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ ہمارے گھر میں کالے رنگ کے کپڑے کوئی نہیں پہنتا، بڑوں نے کسی وجہ سے منع کیا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں جب میں کراچی گیا تو وہاں ہمارے ایک جاننے والے بزرگ ہیں جو حضرت بابا زہین شاہ تاجی کے مرید ہیں۔ ملاقات کی غرض سے ان کے دولت کدے پہ حاضر ہوا تو بڑی شفقت فرمائی۔ پھر اصرار کر کے یہ کپڑے جو میں نے پہنے ہوئے ہیں، مرحمت فرمائے۔ میں نے بھد ادب عرض کیا کہ ہمیں سیاہ لباس پہننے کی اجازت نہیں، تو فرمایا کہ ہم نے اجازت دے دی ہے، رکھ لو۔ اس وقت زیب تن کرنا جب تم خود پہننا چاہو۔۔۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ سیاہ رنگ ماتمی رنگ ہے، غم اور ہجرو فراق کی کیفیت کا مظہر ہے جبکہ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے اپنے مخصوص اثرات اور اسرار ہیں۔۔۔ خیر، یہ سوٹ کراچی سے لاہور آ گیا اور بند کا بند پیک پڑا رہا۔۔۔ آج جو دفتر کے لئے تیار ہونے لگا تو سب سے پہلے یہی خواہش پیدا ہوئی کہ آج یہ کلاسٹ پہننا چاہئے۔ میں گھر میں شلوار قمیض ہی پہنتا ہوں لیکن دفتر کبھی اس لباس میں نہیں آیا، سو بڑے چاؤ سے پہنا اور اب آپ کے سامنے ہوں۔ آپ کو اگر اچھا نہیں لگا تو۔۔۔“

”نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ ہماری طرح تمہیں بھی یہ لباس پہنایا گیا ہے اور اس لباس میں تم بڑے خوبصورت لگ رہے ہو۔“ پھر گڈو اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے

پوچھنے لگی۔ ”جانتے ہو، ہم اس وقت کیوں آئے ہیں؟“

”میڈم، غیب کا علم تو میں نہیں جانتا۔“ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ”قیاس کیا جاسکتا ہے کہ آپ مجھے سربراہ زیدنے آئی ہیں۔ مجھے میری خوشیاں دینے آئی ہیں، مجھے زندہ رہنے کی نوید دینے آئی ہیں اور۔۔۔“ وہ نگہت کی جانب دیکھنے لگا۔

”۔۔۔ اور میں تم سے کچھ بھیک میں مانگنے بھی آئی ہوں۔“ گڈو نے بات پکڑی۔

وہ جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ ”میڈم! آپ مجھے میری اپنی نظروں سے نہ گرائیں۔ میں بڑا عاجز اور غریب انسان ہوں۔ میرے دائرہ اختیار میں جو کچھ ہے، میں آپ کی خوشی کے لئے کر گزرنے کو تیار ہوں۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“

نگہت نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ ”شوکت صاحب! میں بھی آج آپ سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں۔ کیا میں مانگنے سے پہلے یہ یقین کر لوں کہ جو مانگوں گی، مجھے آپ کے در سے مل جائے گا؟“

شوکت نے بغیر سوچے سمجھے دراز کھولی۔ لوڈ کیا ہوا آٹومیک بٹل، جب سے چیک بک اور پاکٹ سائز کا قرآن پاک نگہت کے سامنے میز پہ رکھ دیا۔ پھر آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔

”ہاں حاضر، جان حاضر۔ اللہ کی کتب سامنے ہے۔“

گڈو، شوکت کا یہ دیوانہ پن دیکھ کر دہل سی گئی، بولی۔ ”شوکت صاحب! یہ چیزیں واپس دراز میں رکھیں اور یہ بتائیں کہ آپ کے حلقہ احباب میں کوئی ایسے مولوی صاحب ہیں جو کسی غیر مسلم کو مسلمان کر سکیں اور نکاح پڑھا سکیں۔ دو چار گواہوں کا بندوبست بھی ہونا چاہئے۔“

وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے دریافت کرنے لگا۔ ”یہ آپ کیا۔۔۔“

”پلیز۔۔۔ وقت بہت کم ہے، کوئی سوال وجواب نہ کرو بلکہ فوراً عمل کریں۔“

وہ عجیب سے تذبذب کے عالم میں باری باری دونوں کے چہروں کو دیکھتے ہوئے گڈو کے حکم پہ غور کر رہا تھا۔ پھر چند لمحوں بعد جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔

”اجازت ہو تو میں اندر ٹیلی فون کر لوں۔“

اجازت پا کر وہ اپنے باس کے آفس میں چلا گیا۔ باہر دونوں سر جھکائے گم صم سوچوں کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

”نگہت! میں نے اپنی لائف میں شوکت جیسا گریٹ انسان نہیں دیکھا۔ تم بڑی خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایسا چاہنے والا ملا، تمہاری جگہ اگر میں ہوں تو ساری زندگی اس کے پاؤں

پروگرام کیا ہے؟“

”آپ اتنے بھی بدھو نہیں ہیں کہ مولوی صاحب اور گواہوں کی آمد کا مطلب نہ سمجھتے ہوں۔۔۔ چلیں، سن لیں۔ آپ کا نگہت بی بی سے نکاح ہو گا اور میں مسلمان ہوں گی۔۔۔ ہاں، یاد آیا۔۔۔ ابھی بھی وقت ہے، خوب سوچ سمجھ لو۔ یہ سامنے بیٹھی ہے، اس جیلے میں بھی اسے کوئی عورت ماننے کو تیار نہیں۔ پہاڑ کا پہاڑ۔۔۔ ساری عمر اس پتھر سے سر پھوڑتے رہو گے۔ تمہارے گھر والے، عزیز رشتہ دار اسے دیکھیں گے تو تمہاری عقل اور پسند پہ ماتم کریں گے، نہ یہ اولاد پیدا کر سکے گی اور نہ یہ۔۔۔“

”بس، میڈم! پلیز، آگے کچھ مت کیئے گا۔ آپ نے میری توہین ہی نہیں کی بلکہ میری آرزوؤں اور میری چاہت کو دو کوڑی کا کر دیا ہے۔۔۔ نگہت کسی عورت، کسی بیوی کا نام نہیں۔ یہ میری محبت کا نام ہے، مجھے اس کے سوا کچھ اور نہیں چاہئے۔“

چڑاسی مٹھائی اور پھول لے کر داخل ہی ہوا تھا کہ پیچھے پیچھے زلفی، شایان، قاسم اور مولوی صاحب بھی آگئے۔ گڈو اور نگہت حیران پریشان کبھی ان کو اور کبھی شوکت کو دیکھنے لگیں۔ اندر داخل ہوتے ہی زلفی اور شایان نے نگہت کے سر پہ ہاتھ رکھا، دعائیں دیں۔۔۔ شوکت معذرت چاہ کر انہیں اندر دفتر میں لے گیا، مولوی صاحب بھی ان سیاہ پوشوں کو گھورتے ہوئے اندر تشریف لے گئے۔۔۔ ادھر باہر ان دونوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے اور چڑاسی مسکراتے ہوئے ٹیبل پہ مٹھائی پھول وغیرہ سجا رہا تھا۔۔۔ کچھ دیر بعد وہ سب باہر آگئے۔ مولوی صاحب نے گڈو سے چند رسمی سے سوالات پوچھے، اس کی رضا و رغبت دریافت کی۔ دین اسلام کے بارے میں موٹی موٹی باتیں بتائیں۔ چند آیات تلاوت فرمائیں اور پھر کلمے پڑھا کر داخل اسلام کر دیا۔ سب کی متفقہ رائے اور اس کی خواہش کے تحت صوفیہ نام تجویز کیا۔ مبارک سلامت کے بعد مٹھائی کھلائی گئی۔ زلفی اور شایان نے اسے اپنی منہ بولی بہن بنا لیا۔ اس کے بعد مولوی صاحب نکاح کے فارم پر کرنے بیٹھ گئے۔ گڈو اور نگہت کو شوکت نے اندر آفس میں لے جا کر بٹھادیا، باہر نکلنے لگا تو نگہت نے اسے روک لیا۔

”شوکت! تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے۔۔۔؟“

”ہاں، بولو۔۔۔؟“

”شوکت! میں تم سے التجا کرتی ہوں۔ تم میری بجائے، میری بہن سے شادی کر لو۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے چاہتے ہو، تم نے بڑا لمبا عرصہ میرا انتظار کیا ہے، میرے لئے بڑی جان ری۔ میری وجہ سے تم نے ابھی تک شادی بھی نہیں کی مگر شوکت! میں تمہارے قابل

دھو دھو کر بیڑوں۔۔۔“

”گڈو! تم نے اچھا کیا جو مولوی صاحب کو بلانے کے لئے کہہ دیا، تم نہ کہتیں تو میں کہہ دیتی۔۔۔ آج جمعرات ہے، بابا جی نے تو سب کچھ طے کر ہی دیا ہوا ہے۔ اب بضابطہ بھی ہو جائے تو جھنجھٹ ہی ختم ہو۔۔۔“

”یار! ایک بات ہے۔۔۔ اس موقع پہ تمہارے دونوں بھائی بھی موجود ہونے چاہئیں، تمہارے نکاح نامے پہ ان کے دستخط بھی ضروری ہیں۔۔۔“

نگہت سوچتے ہوئے بولی۔ ”کل ان کے نکاح ہیں اور آج ادھر نکاح، جس کی ابھی تک انہیں خبر نہیں۔ ان حالات اور اس موقع پہ ان کا رد عمل کچھ خوشگوار نہیں ہو گا۔۔۔“

”یہ تو ہے، لیکن یار! اپنے سارے کام دھندے ایسے ہی ہوئے اور ہوتے ہیں۔ سہویشن کے مطابق ہی انہیں بھی چلنا پڑے گا، مجبوری ہے۔۔۔ ذرا سوچو، غور کرو کہ کل تک کیا تھا، اور آج کیا ہو گیا ہے اور کچھ دیر بعد کیا ہونے والا ہے۔ تمہیں اپنی منزل مل جائے گی اور مجھے وہ سب کچھ مل گیا ہے جس کے بارے میں کبھی میں نے سوچا تک نہ تھا۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے شکر گزار ہونے لگی۔ ”نگہت! یہ سب کچھ تم نے مجھے دیا ہے، میں تمہاری مشکور ہوں۔۔۔“

نگہت مسکرائی، اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ ”گڈو! میں نے ابھی کچھ نہیں دیا، جب دوں گی تو تم بے ہوش ہو جاؤ گی۔ ایسا سر ائیز جو تمہیں ہمیشہ یاد رہے گا۔۔۔ ہاں، شوکت سے کہہ کر شایان اور زلفی کو بلالو۔ جو بھی ہو، کم از کم انہیں گلے تو نہیں رہے گا کہ بہن کا نکاح ہوا اور بھائیوں کو خبر تک نہ ہوئی۔“

شوکت ماتھے کا پسینہ پونچھتا ہوا باہر نکلا۔ چڑاسی کو بلایا، مٹھائی اور کچھ پھول لانے کے لئے بازار بھیج دیا۔

”۔۔۔ اور کوئی حکم؟۔۔۔ میں نے اپنے بھائیوں کو ساری بات سمجھادی ہے، بس آدھے گھنٹے میں وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”شوکت! میرا مشورہ ہے کہ زلفی اور شایان صاحب کو بلالو۔ جو بھی ہو، ان کی موجودگی ضروری ہے۔۔۔“

شوکت مسکرایا، بولا۔ ”میڈم! وہ بیچارے اپنے مسئلوں میں پھنسے ہوں گے۔ کل ان کی شادی ہے اور یہ نیا جھنجھٹ۔۔۔“ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو کھول کر آپس میں پوریں ملاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”اگر چاہیں تو بتا دیں کہ مولوی صاحب اور گواہوں کے آنے پہ آپ کا

نہیں۔ میں نہ عورت ہوں۔ نہ لڑکی۔ تم ایک باعزت شریف خاندان کے چشم و چراغ ہو۔ تمہارے سامنے تمہارا مستقبل ہے، یہی زندگی ہے اور میں۔۔۔ میں تو ایک بانجھ بنجر زمین کی طرح ہوں جو اپنے مالک کو پھل پھول تو کیا، گھاس کا ایک سوکھا سا تکا بھی نہیں دے سکتی۔ میری بہن تمہیں سب کچھ دے سکتی ہے۔ خوشی، خدمت، اولاد۔۔۔“

وہ پاپلوں کی طرح منہ کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ گڈو بولی۔

”ہاں، شوکت! محبت صرف وصال ہی کا نام نہیں اور پھر تم نے تو خود ہی کہا تھا کہ نگہت کسی عورت کا نام نہیں، یہ میری محبت اور چاہت کا نام ہے۔۔۔ محبت کرنے والے اپنے آپ کو قربان کر دیتے ہیں۔ محبت تو کسی کے دیران چہرے کو شاداب کرنے کا نام ہے، محبوب کی خوشی پہ قربان ہو جانے کا نام ہے اور جو محبوب کی خواہش و خوشی پہ خود کو نچلور نہیں کر دیتا وہ محبت کے معنوں سے نا آشنا ہے۔“

”بس کریں، آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟۔۔۔ نگہت کی خواہش کی تکمیل کی خاطر میں نے حای ضرور بھری تھی۔ اب یہ اپنی کسی مجبوری سے انکار بھی کر سکتی ہیں مجھے تو صرف ان کی بھلائی مقصود ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ مجھے شادی کی کوئی خواہش اور شوق نہیں۔“

وہ باہر جانے لگا مگر نگہت نے اٹھ کر روک لیا۔

”تم ایک دفعہ پہلے بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے، میں اس وقت ہوش میں نہیں تھی اور اس وقت میں ہوش میں ہوں مگر تم ہوش میں نہیں۔۔۔ میری طرف دیکھو۔“ جونہی وہ پلٹا ایک بھرپور تھپڑ اس کے دائیں گل پہ زن سے پڑا اور وہ منہ پھیر کر سسکتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں تم سے کہیں زیادہ تمہیں چاہتی ہوں، میں تمہیں کسی لمحے نہیں بھولی۔ تمہارے اسی تھپڑ کی وجہ سے میں آج اس حال کو پہنچی ہوں۔۔۔ تم کیسے مرد تھے جو ایک بے سارا لڑکی کو درندوں کے حوالے کر کے چل دیئے، تم نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ اس دیرانے اور تومانی میں میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تم نے اس وقت بھی میرے سامنے اپنا پرس پھینکا تھا اور آج بھی تم نے یہی کیا، پستول میرے سامنے رکھا۔ یہ کھلونے میں نے مٹھی میں دبا کر توڑے ہیں۔ تمہیں تھپڑ سے میرے ہاتھ کی طاقت کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔۔۔ پھر تم نے قرآن سامنے رکھا، سر جھکا یا، وعدہ کیا۔ تم۔۔۔ تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو۔ اتار دو یہ کالی کفنی، یہ رنگ تمہیں سوٹ نہیں کرتا۔ یہ من ماروں کا رنگ ہے۔۔۔ محبت کا دعویٰ کرنے والے بہت ہوتے ہیں، محبت پہ قربان ہونے والا کوئی کوئی ہوتا ہے۔ میں صرف محبت کی خاطر تمہاری پھولوں بھری زندگی میں کانٹے بکھیر دوں؟ نہیں، یہ محبت نہیں بلکہ خود

عرضی ہے۔ تم جا سکتے ہو اور اب ہم بھی چلے جائیں گے۔ گڈو مسلمان ہوئی، وجہ؟۔۔۔ بابائی، جنہوں نے قربانی، محبت اور انسانیت کی خدمت کا ایک اچھوتا نمونہ پیش کیا۔ جاؤ۔ ان سے ملو، تمہیں معلوم ہو کہ محبت اور قربانی کسے کہتے ہیں۔۔۔ اور ہاں، جانے سے پہلے یہ سنتے جاؤ کہ آئندہ کبھی قرآن کو درمیان میں مت لانا۔“

شوکت سسکیوں سے رونے لگا، بولا۔ ”نگہت! مجھے معاف کر دو۔۔۔ اگر تم اسی میں خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں۔ خدا کے لئے، بس تم خوش رہو۔ میری جانب سے دل صاف کر دو، مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی۔“

گڈو، شوکت سے لگ کر اسے تسلی دینے لگی۔ آنسو پونچھے اور بولی۔ ”شوکت! رفعت مت اچھی لڑکی ہے، نگہت کی چھوٹی بہن ہے۔“

”نہیں۔۔۔“ نگہت چیختی۔ ”میں جس کی بات کر رہی ہوں وہ میری چھوٹی بہن نہیں، بی بی بہن ہے جس پہ میں لاکھ رفعتیں قربان کر سکتی ہوں اور میری اس بہن کا نام رفعت نہیں لڈو تھا اور اب صوفیہ ہے۔۔۔“

گڈی۔ گڈا۔ گڈو!